ادب و تحقیق مسائل

مصنفہ

مولینا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر مدظلہ

فہرست مضامین شرر

جلد چہارم

ادب و تحقیق مسائل

مضمون	صفحہ
فلسفہ تصوف اور اسلام	۱
سکہ اسلام میں	۸
عربی سے فارسی و اردو کے تعلقات	۱۶
جناب شہربانو	۲۱
اسلام اور کفیئیٹر نمبر۱	۲۳
اسلام اور کفیئیٹر نمبر۲	۳۳
عنقاء	۴۰
گریک فائر یا نفط	۴۶
ریش مقدس	۵۶
ختنہ	۶۶
مسلمانوں اور عیسائیوں میں امتیاز لباس	۷۰
تہامہ بجر	۷۳
کہانت	۷۸
معراج	۸۶
توحید	۹۲
موسیقی	۹۹
ہندوؤں کے علوم	۱۱۳
چیچک کا ٹیکہ اور لیڈی مانٹیگو	۱۱۹
عربی رسم خط	۱۲۴
رقص	۱۳۲
رحم اللہ من ہدانی الی عیوبی	۱۳۶
سچا عاشق کون ہے؟ مرد یا عورت؟	۱۳۷
زبان اردو کی شامت	۱۴۲
کیا واقعی انسان سب سے افضل ہے؟	۱۴۷
چلتے پھرتے باغ و مکان	۱۵۳
حمام کی تاریخ	۱۵۵
رقص موریق	۱۶۱
دنیا میں ناول نویسی کی ابتداء	۱۶۳
دہلی اور لکھنو کی اردو	۱۶۴
رقص	۱۷۲
گلستان	۱۷۵
العادۃ کالطبیعۃ الثانیہ	۱۷۸
خط پیکانی	۱۸۴
تاج	۱۹۰
دنیا و آخرت	۱۹۶
علامات اوقاف	۲۰۰
ریختی گوئی	۲۰۳
بدقسمت زبان اردو	۲۰۷
اردو لٹریچر	۲۱۳
اردو لٹریچر	۲۲۱
عذر گناہ بدتر از گناہ	۲۲۵
ناول	۲۲۸
عربی زبان اور اس کی نحو و صرف	۲۳۳
اہل زبان و زباندان کا فرق اور زبان	
اردو کا معیار	۲۳۸
اردو اور ہندی	۲۴۰
مصحف عثمانی	۲۴۵
اردو لٹریچر اور محکمہ قوانین	۲۵۱
ہمارا جدید ناول	۲۵۵
ہمارا لٹریچر	۲۵۹

تمت بالخیر

مضامینِ شررؔ۔ جلد چہارم

ادب و تحقیقِ مسائل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فلسفہ تصوف اور اسلام

اگرچہ دُنیا اپنی رفتارِ ترقی میں سابق کے بہ نسبت بہت آگے نکل آئی مگر اس وقت تک اس امر کا پتہ نہ لگا کہ انسان کی کمالی حالت کا منتہا کس مقام پر ہے مختلف فلسفیوں کے قائم کیے ہوئے اصول پر ایک سرسری نگاہ ڈالئے یا مختلف مذاہب کے اصول کا انداز دیکھیے تو طبیعت ایک مخمصہ میں پڑ جاتی ہے شاید اسی لیے انسان مذہب کی طرف سے جھکا دیا گیا ہوگا کہ اُن عقلی نازک مباحث سے کم تعلق رکھنا چاہیے جو انسان کے خیالات پر کوئی نہ کوئی جدید اثر ڈال دیا کرتے ہیں۔ اگرچہ ایک تقلیدی طرز پر اس عہد سے پیشتر کے علما بھی فلسفیانہ مباحث پر نظر ڈالا کرتے تھے مگر تعلیم کے لیے جو طریقہ مغربی یورپ میں سررشتۂ تعلیم نے ایجاد کیا ہے اُس کا یہ لازمی اور علمی اثر ہے کہ انسان اپنے عالمِ خیال میں بالکل آزاد ہو کے مذہب اور فلسفے پر غائر نظر ڈالتا ہے اور دونوں کے درمیان میں ایک عمدہ فیصلہ کرنے والا بن جاتا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ بہ نسبت عربی تعلیم کے انگریزی تعلیم نے

زیادہ دہریے پیدا کیے۔ عربی کورس میں فلسفہ و منطق کی کتابیں انگریزی سے زیادہ
ہیں مگر پھر بھی اُس سے طبیعت پر اتنا اثر نہیں پڑتا۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ عربی تعلیم
سے کوئی دہریہ نہیں ہوا۔ نہیں ضرور ہوئے۔ مگر یہ اندھیر نہیں ہو گیا کہ ایک سرے
سے گویا دُنیا میں مذہب کی واجبی اور ضروری حکومت اُٹھتی جاتی ہے۔

اگرچہ ہم مذہب کے احکام کو اعتقاداً ضرور مانتے ہیں مگر ہم نے فلسفے کی
طرف سے آنکھیں بند بھی نہیں کر لی ہیں۔ ہم خود بھی پسند کرتے ہیں کہ فلسفیانہ
اصول کا مذہب سے مقابلہ کیا جائے۔ لیکن مذہب کی طرف توجہ کرنے سے پہلے
ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود فلسفہ کے دو مختلف اور متضاد فریقوں کا جھگڑا چکا
دیا جائے۔ اس لیے کہ جب تک اُن دونوں کے مباحث طے نہ کر دیے جائیں فلسفہ
میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ مذہب کے مقابل میں لا کے قائم کیا جائے۔
متقدمین سے متاخرین تک اہل فلسفہ کے دو گروہ رہے۔ ایک وہ لوگ جو نظام
عالم کو معقولی استدلالات کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو نتائج عقلی کو
چھوڑ کے صرف روحانیات کی طرف جھکتے ہیں۔ پہلوں کو عربی فلسفے کی اصطلاح
میں مشائین کا خطاب دیا گیا ہے اور پچھلے اشراقیین کہلاتے ہیں۔ یا یوں کہا
جائے کہ فلسفۂ مادی اور تصوف۔ اور اس نے اسلام میں آ کے وہ اصول دینی
پیدا کر دیے یا شریعت اور طریقت۔

بے شک اس امر کا تصفیہ ہو جانا ضروری ہے کہ آیا مشائین کی پیروی کی جائے
یا اشراقیین کی؟ پہلے فرقے والے تو خیر اسکے قائل ہیں کہ اُنکے اصول سے کچھ
کی جائے۔ اس لیے کہ وہ استدلال کے عمدہ طریقوں سے کام لے کے کسی ایسے
شخص کو سمجھا دینے کی کوشش کرتے ہیں جو سمجھنا چاہتا ہو۔ مگر اشراقیین یا صوفیہ نے
ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب تک سالہا سال کوشش کر کے اُن کے اشراق نوری
اور مکاشفات سے اطلاع نہ حاصل کیجیے اُسوقت تک ممکن نہیں کہ آپ سمجھ سکیے یا
وہ سمجھا سکیں۔ جن لوگوں نے اتنی ہی بات پر صوفیہ کے دعووں کو باطل قرار دیدیا
اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے غلطی کی۔ اس لیے کہ مادیین اور صوفیہ کے
دعوے ہی بتا رہے ہیں کہ پہلوں کا اصول قال ہے اور پچھلوں کا مدار صرف حال پر ہے

تصوف کیا چیز ہے؟ جن لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہو کہ صوفیہ کی بڑی بڑی
تابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہی تصوف ہے تو اصل یہ ہے کہ وہ ایک عظیم الشان
لطی میں مبتلا ہیں - تصوف صرف ان اثروں کا نام ہے جو واقعت کار صوفیہ کی
انی ہوئی ریاضتوں سے دل پر پڑ جاتے ہیں - جنھیں وجدانیات کہنا چاہیے انسان
ن سے لطف یا بدمزگی حاصل کر لیتا ہے مگر زبان سے نہیں ادا کر سکتا کہ اصل
ین کیا چیز ہیں - جیسے فرو سرور کہ ان کی کیفیت کسی سے پوچھیے تو بیان نہیں
ر سکتا مگر ہاں دل ہی دل میں لطف اٹھاتا ہے - لہذا جب تک کوئی اُن
کیفیتوں سے نہ واقف ہوا ہو جو تصوف کی عملی ریاضتوں سے دل میں پیدا ہوتی
ین ہرگز اس قابل نہیں ہو سکتا کہ اہل مادہ کے ظاہری استدلالات کو اُن کے
کھین یکطرفہ ڈگری دیدے - ہم زمانے میں اکثر لوگوں کو اس غلطی میں مبتلا
ہتے ہیں -

آج کل ایک ہمارا سا شخص اگر اوپر کی سطح سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ
تصوف کا مدار مجرد خیالات پر ہے اور اُس کے مقابل میں دوسرا فلسفہ خیالات
ی کا پابند نہیں ہے - لیکن یہ بحث بھی چل سکتی ہے تو ایک اور امر کا فیصلہ کر لینے کے
بعد - اس لیے کہ وہ فلسفہ جو تصوف کے مقابل میں ہے اُس میں بھی بہت بڑے
ڑے تغیرات ہو گئے - ایک قدیم اور اگلے زمانے کا فلسفہ تھا جس کی ترتیب و
ظام میں زیادہ دخل ارسطو کو تھا - اور دوسرا جدید مغربی فلسفہ ہے جسکے اصول کو
رڈ بیکن وغیرہ متاخرین حکمائے یورپ نے قائم کیا ہے - پہلا یونانی فلسفہ جس کا
یادہ نہیں کل حصہ عربی میں موجود ہے بلکہ اسلامی حکما نے جس کو اُسکی یونانی حالت
ے مقابلے میں بہت کچھ ترقی دلا دی اُس کا مبنی بھی صرف خیالات ہی پر تھا -
صوف سے اگر فرق تھا تو اس قدر کہ مقلدین ارسطو عقل کے عام محاکمات پر مسائل
ی بنا قائم کرتے تھے - اور ہر طالب علم کو اُس کی عقل کے مطابق تمام اصول حکمت
ر اطمینان دلا دیا کرتے تھے - بخلاف اس کے اہل تصوف ریاضات کے ذریعوں
سے اپنے خیالات پر خلوت میں بیٹھے بیٹھے کے غور کرتے تھے اور اُن سے جو کیفیتیں
نکے دل پر طاری ہوا کرتی تھیں اُن پر اپنے فلسفے کی جو اُن کا مذہب تھا بنا قائم

کرتے تھے - لیکن اس پچھلے عہد میں صوفیہ تو اسی حالت اور انھیں اصول پر
قائم ہیں مگر اہلِ مادہ جنھوں نے پہلے ارسطو کے فلسفے کو ترمیم و تنسیخ کرکے نئے
اصولوں پر قائم کرلیا ہے وہ گذشتہ اور موجودہ عربی مقلدین ارسطو کی طرح صرف
زبانی جمع خرچ کے پابند نہیں ہیں بلکہ اُنھوں نے دنیا کے فنون پیشوں اور تمام
علمی مسائل کو سمیٹ کے اپنا بنا لیا ہے - وہ عقلی طور پر بحث کرتے ہیں - مگر اُن کے
مباحث کا موضوع صرف خیال نہیں بلکہ دُنیا پر اس حیثیت سے نظر ڈالتے
ہیں کہ اُس کی ہر چیز سے کون سا علمی مسئلہ نکل سکتا ہے - اور کون بات پیدا ہو سکتی
ہے جو دنیا کے لیے بکار آمد ہو - یہ کلیں اور یہ تمام آلات اُس عہدِ قدیم ہی میں پیدا
ہوئے مروج ہو جاتے مگر نہ ہوئے - اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن اگلے فلسفیوں نے
اشراقیین کو تو خیر آج تک بحث نہیں مقلدین ارسطو نے بھی اپنے خیالات کو
اس جانب متوجہ ہی نہیں کیا - ان دنوں اکثر لوگ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ اپنے
گذشتہ لوگوں کی کوئی علمی کارستانی نکال کے زمانے کے سامنے پیش کرکے سُرخرو
بنیں مگر ہم بتائے دیتے ہیں کہ اُنکی یہ جستجو بالکل بیکار ثابت ہوگی - اور اگر کوشش
کرکے وہ کوئی ایسی بات نکال کے پیش بھی کردیں گے تو یہ خوب جان لینا چاہیے
کہ اُسکی ایجاد بحیثیت فلسفہ ہرگز نہ ہوئی ہوگی - بلکہ بحیثیت پیشہ یا تجارت کے
کسی کاریگر کا ذہن لڑ گیا ہوگا اور اُس نے کوئی ایسی چیز تیار کردی ہوگی - اُس
زمانے میں اس طرف کسی فلسفی کا خیال متوجہ ہی نہیں ہوا تھا - ایسے نتائج
ظاہر ہوتے تو کیونکر؟

خیر اب ہم پھر اس بحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ تصوف کے مقابل یہ
دونوں قدیم و جدید عقلی فلسفے کیسے ہیں؟ یہ ظاہر ہو گیا کہ اگرچہ غرض متحدہ تھی
مگر تصوف اور فلسفۂ قدیم دونوں کا مدار صرف خیالات پر تھا - لہٰذا ہم کیا کریں
ہمارا نفس ہمیں مجبور کیے دیتا ہے کہ ہم تصوف کو ترجیح دیں - اس لیے کہ ایک مسئلے
کے حل کرلینے پر عالمِ خیال میں انسان کو جو مسرت ہو جایا کرتی ہے اُس میں دونوں
شریک ہیں - اور تصوف کو اس قدر ترجیح ہے کہ خیالی ریاضتوں سے وہ از قسم
انکشاف بہت سے عمدہ کمالات حاصل کر سکتا ہے - بخلاف اُس قدیم فلسفہ کے

ارسطو کے جو سوا اسکے کہ انسان اپنے دل ہی مین آپ اپنے اوپر ناز کرے کسی
کے کام آسکتا نہ اپنے لیے کوئی دنیا وی نفع حاصل کر سکتا ہے۔ رہا دوسرا جدید
فلسفۂ یورپ جس نے بہت کچھ کمالات تھوڑے ہی دنون مین دکھا دیے۔ دنیا نے
اپنی وسیع مقدار عمر مین اتنی شان و شوکت نہ حاصل کی تھی جتنی اس فلسفے کی
وجہ سے پچھلی دو ایک صدیون مین حاصل کر لی۔ ہر انسان اُس فلسفے کے ذریعے سے
ایک ممتاز ترقی کر سکتا ہے اور بہت کچھ نفع حاصل کر سکتا ہے اور ثابت کر سکتا ہے
کہ ایک تھوڑی محنت سے انسان کس پائے پر پہونچ جاتا ہے اور اُس سے کیسے کیسے
اہم کام ظاہر ہو جایا کرتے ہین۔ بخلاف تصوف کے کہ اُسکے معتقد جس طرح افلاطون
کے مدرسۂ الٰہیات مین بیٹھ کے مراقبہ کیا کرتے تھے اُسی طرح آج بھی اپنی خانقاہون
اور کوہستان کی گھاٹیون مین سر جھکائے بیٹھے ہین۔ صوفیہ کو شاید یہ خبر بھی ہوئی ہوگی
اور فلسفۂ مادی نے عدالت کی کرسیون تک پر قبضہ کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ صوفیہ
کے کشف و کرامات اور تمام وہ روحانی خوارق عادات جو تصوف کے ذریعے سے
حاصل ہوا کرتے ہین سب خلافِ نیچر اور غیر قابل اعتبار ہین۔ بے شک تصوف کو
اس جدید مادی فلسفے کے سامنے دب جانا پڑا۔ اور ہم کو بھی تمام نظام عالم
کے دیکھتے موجودہ فلسفے ہی کے حق مین فیصلہ کرنے کی جرأت ہوتی ہے۔ اسکو
سب تسلیم کرتے ہین کہ تصوف ایک ایسی چیز ہے جسکے اصول کو اگر عقل نہ بھی قبول
کرے تو اُس کے سراپا ذوق جزئی خیالات کو ضرور اور بہت جلد قبول کر لیتی ہے۔
اور یہی وجہ تھی کہ زمانۂ قدیم مین اگرچہ مشائین کا فلسفہ تصوف کی بیخ کنی مین
اپنی پوری قوت صرف کرتا رہا مگر ہرگز کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ اُس عہد کے
علما اگرچہ ہر فن اور ہر قسم کے علوم فلسفیہ مین کمال حاصل کر لیا کرتے تھے مگر اعتقادی
حیثیت سے تصوف اُنکے دعوون پر بالکل حاوی ہو جاتا تھا۔ اور شاید یہی وجہ
ہے کہ تمام وہ مذاہب جن کو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کے سلسلہ وار پیغمبرون سے
کوئی علاقہ نہین اور جن کی بنا بہ ظن غالب عقلی فلسفے پر تھی سب کے اصول تصوف ہی
کی زمین پر قائم کیے گئے۔ یہ سب باتین اس امر کا ثبوت دے رہی ہین کہ فلسفۂ ارسطو
کو تصوف اور اشراقی فلسفے کے مقابل مین بالکل کامیابی نہ ہو سکی۔ اس عظیم الشان

فلسفے کے خیالات صرف چند مدرسون کی دیوارون کے اندر محدود تھے۔ مسلمانون نے اپنے عہد مین اگرچہ اُس فلسفے کو یہان تک ترقی دلائی کہ خاص مقامات سے نکل کے عام بازارون تک پہونچ گیا۔ مگر پھر بھی اشراق کے دلچسپ اثر نے علما مین جو ذوق تصوف پیدا کیا وہ صرف بحث و مباحثہ کی حیثیت سے نہین رہا بلکہ مذہب کا ایک جزو بن کر اعتقادون مین گھس گیا۔ ہان تصوف کے اس جہانگیر اثر کو اگر مٹایا تو اس جدید فلسفے نے۔ جس نے دکھا دیا کہ ہمارے خیالات تصوف اور نیز قدیم فلسفۂ ارسطو کی طرح صرف دماغ مین چکر کھانے کے لیے نہین ہین بلکہ ان سے اگر غور کیا جائے تو بڑے بڑے نتائج پیدا ہو سکتے ہین۔ اس فلسفے کے حامیون نے یہ دعویٰ ہی نہین کیا بلکہ کر کے دکھا دیا۔ انھون نے ثابت کر دیا کہ ہمارے اصول اور ہماری کوششون نے دنیا کو کسی طالب علمانہ بحث مین اُلجھائے نہین رکھا۔ بلکہ دنیا کے لیے عمدہ عمدہ کلین قسم قسم کے سامان مہیا کر دیے۔ الغرض یہ ایسے دلفریب دعوے ہین کہ اب دنیا تصوف کی دلخوش کُن باتون کو بھول گئی اور بھولتی جاتی ہے اور جدید فلسفہ فلسفۂ قدیم۔ تصوف بلکہ مذہب تک کو مٹا کے اپنا قبضہ کرتا جاتا ہے۔ اور در پردہ اسکے ساتھ ہی ساتھ مذہب کو بھی نقصان پہونچتا جاتا ہے۔ تصوف کے حامیون کی بعض پارٹیان قائم ہین اور کوشش کر رہی ہین کہ افلاطونی اصول کو اس جدید فلسفیانہ تہذیب کے دور رس مضرتون سے بچائین۔ مگر موجودہ عصر کے نامور فضلا اور یورپ کے بڑے بڑے فلسفی انکی باتون کو اُسی طرح سنتے ہین جس طرح کوئی سن رسیدہ شخص بچون کی بھولی بھولی باتون کو سنتا ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر یہی طریقۂ تعلیم کچھ دنون اور چلا گیا تو تصوف کو دنیا مین بالکل شکست ہو جائیگی۔ ہمارے مشہور اہل طریقت اپنی خانقاہون مین اور ہندو جوگی کوہستانی نشیبون مین یونہین بیٹھے رہ جائین گے اور زمانہ وہ پہلا ورق اُلٹ کے تصوف کو دنیا سے ناپید کر دے گا۔

اب ہمین دیکھنا چاہیے کہ مذہب کیا چیز ہے؟ اگر ہم طبی اصطلاحون سے کام لین تو کہہ سکتے ہین کہ مذہب ایک مزاج کا نام ہے جو فلسفۂ اشراقی و مشائی کے باہمی امتزاج سے پیدا ہو گیا ہے۔ یہ تعریف زیادہ عام نہین ہو سکتی۔ اس لیے

کہ بعض مذہب اپنی اصلی حالت مین صرف تصوف پر قائم کیے گئے ہین ۔ مثلاً دینِ عیسوی جسکو سوا اعتقادات کے اور کسی عملی مسئلے سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ اسلام نے دنیاوی انتظامون اور احکام معاشرت کو دیگر مذاہب کی بہ نسبت بہت زیادہ لیا ۔ لیکن اس پر سب مذہب متفق ہین کہ اصلی چیز اعتقادات ہین جن کو صرف تصوف ہی سے تعلق ہے اور جو اصل میں تصوف ہی ہین ۔ لہذا جن بناؤن کے باعث فلسفہ جدید سے تصوف کو نقصان پہونچ رہا ہے اُنھین بناؤن کے مطابق مذاہب کو بھی ضرر پہونچ رہا ہے ۔ اور اسی وجہ سے اہل مذاہب کو ضرورت ہے کہ لازمی طور پر تصوف کے روحانی مسائل کو سنبھالین ورنہ یہ جدید ہادی فلسفہ مذاہب کو جڑ سے اُکھاڑ کے پھینکدے گا ۔

شاید یہ جملہ ہم تیز کہ گئے ۔ اس لیے کہ اہل مذاہب کو نہایت ناگوار گذرا ہو گا۔ اُنکے اعتقاد کے مطابق مذہب کی حفاظت کرنے والا خود خدا ہے ۔ اور جب خدا نے حفاظت کا وعدہ کر لیا تو ممکن نہین کہ کوئی مخالفانہ کوشش کارگر ہو سکے ۔ ہان یہ بے شک صحیح ہے اور ممکن نہین کہ کوئی مذہب کی بیخ کنی کر سکے مگر ہم اتنا ضرور کہین گے کہ اسباب زمانہ دیکھ کے آپ کو اُس کی حفاظت ضرور کرنا چاہیے ۔ عیسائی ایک حد تک کوشش کر رہے ہین ۔ اگرچہ مذہب اُن کے اصلی وطن سے جلاوطن ہوتا جاتا ہے ۔ لیکن جتنی یورپ مین کمی ہوتی ہے اُتنا ہی نقصان وہ یون پورا کر لیتے ہین کہ ایشیا کے دیگر اہل مذاہب کو کسی نہ کسی طرح اپنا ہم خیال بنا لیتے ہین ۔ مگر ہان دیگر مذاہب کو صاف نظر آ رہا ہے کہ روز بروز نقصان پہونچتا جاتا ہے ۔

یہ بڑی غلط کارروائی ہے کہ ایشیا کے مذاہب باہم لڑ لڑ کے اپنی ساری قوت آپس ہی مین تمام کیے دیتے ہین ۔ جس کی وجہ سے اُن مین اور ضعف ہوتا جاتا ہے اور تعلیم جو جدید فلسفیانہ خیالات بچپن سے دماغون مین پیدا کرتی ہے وہ سب کو اُڑا کے بخوبی تمام غالب آ جاتے ہین ۔ ایسے وقت مین تمام دُنیا کو آپس مین مل کے ایک ایسا مشن قائم کرنا چاہیے جو اتحاد کے ساتھ اس فلسفے کا زور توڑنے پر کمر باندھے ۔ اور یہی مشن اگر کامیاب ہو سکا تو مذاہب کے بچنے کی اُمید ہو سکتی ہے ۔ ورنہ آیندہ ایک ایسا زمانہ ضرور آ جائے گا جب مذہب کی حفاظت انسانی قوت

کے دائرے سے خارج ہو جائے گی۔

ہم کو بالکل اُمید نہین کہ مذہب اپنی موجودہ حالت سے فلسفے کے حملون کو روک سکین۔ اور جب تک جملہ مذاہب کی متحدہ قوت ایک عام مشن مذکورہ غرض کے لیے اور مندرجہ بالا اصول پر نہ قائم کرے گی اُسوقت تک ممکن نہین کہ دنیا اُس آفت سے محفوظ رہ سکے جو فلسفے کی صورت مین نمایان ہوئی ہے۔ عیسائی بھی اس خیال سے غافل نہ رہین۔ اُن کی کوششین ایشیا مین جو ظاہری ترقی کی صورت دکھا رہی ہین یہ صرف چند روز کے لیے ہے۔ ایشیا بھی اب تھوڑے دنون مین ایشیا نہ رہے گا۔ وہ یورپ ہوتا جاتا ہے۔ اور جو جو ایشیا یورپ کی صورت اختیار کرے گا وہ وہ عیسائیون کی کوششین بیکار ہوتی جائین گی۔ لہذا ہم تمام مذہبون کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اور درخواست کرتے ہین کہ اب وہ تمام باہمی نزاعون کو چھوڑین اور اُن نوجوانون کی طرف متوجہ ہون جو دہریت کا وعظ کہتے پھرتے ہین۔

اگست ۱۸۹۳ء

سکہ اسلام مین

یہ امر ابھی واضح طور پر نہین بتایا گیا کہ اسلام مین سکے کا رواج کیونکر اور کس وقت سے شروع ہوا۔ حالانکہ اسکے جاننے کی بہت کچھ ضرورت ہے۔ عوام مین اسکے متعلق طرح طرح کے خیالات پھیلے ہوے ہیں۔ اور اُن غلط فہمیون کے مٹانے کی بالکل کوشش نہین کی گئی جو شرعی دینار و درہم کے نام سے عوام کے ذہن مین مرتکز ہین۔ ابھی تک اس بات پر یقین کرنے والے کثرت سے موجود ہیں جو چار یاری روپے کو خلفاے راشدین کے عہد کا سکہ تصور کرتے ہین۔ یورپ مین نئی ایجاد یہ مذاق عام ہو گیا ہے کہ قدیم زمانون کے سکے جمع پونجی بوپچا کے جمع کیے جاتے ہین ان کوششون کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ خلفاے بنی اُمیہ و عباسیہ و عبیدین مصر کے بعض سکے ہاتھ آگئے۔ لیکن اس امر پہ بغیر تاریخی ثبوت کے یقین نہین کیا جا سکتا کہ اسلام مین سب سے پہلے کس عہد مین ٹکسال قائم ہوئی اور کس ضرورت نے مسلمانون کو اسپر آمادہ کیا۔

اس مین کوئی شک نہین کہ مسلمان فاتحون نے جس وقت ممالک عالم کو زیر

کرنا شروع کیا اُسوقت فتوحات کے خیال اور دُھن مین وہ اس قدر ڈوبے ہوے تھے کہ بہت سی ضروری باتون کی طرف اُن کا خیال بھی نہین گیا۔ اور جب دنیا کا مرقع اُلٹ پلٹ کے اُنھون نے اپنی طرف دیکھا تو سمجھے کہ ہم کس قدر آگے بڑھ آئے ہین اور ہمین کیا کیا کرنا تھا جس کی طرف ہماری توجہ مبذول ہی نہین ہوئی۔ اگرچہ اس بے پروائی کا زیادہ تر باعث اُن کا جوش جہاد تھا۔ مگر عرب کی سادگی اور اُن کی بدویانہ صحرائی زندگی جسکو تمدن سے بہت کم لگاؤ تھا زیادہ تر اسکی معین ہوئی۔ انھین اسباب نے جہان اُن سے اور بہت سے امور نظر انداز کرادیے وہان اُنکو سکے کی طرف بھی متوجہ نہ ہونے دیا۔

جاہلیت مین عرب کے ایک کونے کو روم سے اور ایک کونے کو ایران سے تعلق تھا۔ ان تعلقات کی وجہ سے عرب کے شہرون مین عموماً ایرانی اور رومی سکون کا رواج تھا۔ کچھ سکے[ع] ملوکِ حمیر نے بھی عرب مین ایام جاہلیت مین بنائے تھے جو اُنھین رومی وعجمی سکون مین ملے ہوے کبھی کبھی نظر آجایا کرتے تھے۔

آنحضرت صلعم کے بعد چاروں خلافت ہاے راشدہ گذر گئین۔ جناب امام حسن علیہ السلام نے خلافت سے دست بردار ہوکے امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ معاویہ کا دَور بھی ابتدائی شان وشکوہ دکھا کے آخر ہوگیا۔ یزید کی سلطنت وہی دبدبہ بھی پیدا کرکے ختم ہوئی۔ مروان خلیفہ ہوا اور مر بھی گیا۔ یہ سب ہوگیا سکے[ع] وہی رومی ایرانی اور حمیری مروج تھے۔

پھر اُن سکون مین بھی یہ خرابی تھی کہ اس قدر مختلف اوزان اور قیمت کے تھے کہ تجارت وکاروبار اور خصوص بیت المال کا انتظام روز بروز اُلجھا جاتا تھا۔ مسلمانون کو مفروضہ زکوٰۃ وصدقات کے ادا کرنے مین دقت[ع] لاحق ہوئی تو جناب عمر فاروقؓ کو مجبوراً یہ انتظام کرنا پڑا کہ شرعی اغراض کے واسطے اُن تمام سکون مین سے ایک خاص سکہ مقرر کردیا جو قیمت مین سب سے متوسط اور چلن مین سب سے زیادہ مروج تھا۔ لیکن اسپر بھی ٹھیک انتظام نہ ہوسکا اس لیے

ع‍ــہ دیکھو فتوح البلدان بلاذری۔

ع‍ــہ دیکھو مقدمۂ ابن خلدون۔

اکثر لوگوں نے کھوٹے سکے بنا بنا کے ملک میں پھیلا دیے جن کی وجہ سے خزانۂ خلافت کو معمولاً نقصان اُٹھانا پڑتا تھا اور مروجہ سکے اُس قیمت سے بدرجہا زیادہ گھٹتے جاتے تھے جس پر کہ چل رہے تھے۔ ان دقتوں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے آخر یہ نتیجہ ہوا کہ عرب میں سکے کی کچھ قیمت نہیں باقی رہی تھی جو کچھ قیمت تھی سونے چاندی کی۔ بلکہ قریب قریب سونا چاندی ہی وہاں کا سکہ بن گئے تھے۔ اور سونے چاندی ہی کے پرکھنے پر مروجہ سکوں کی قیمت قائم کی جاتی تھی۔

بعض مورخین کہتے ہیں کہ انھیں مشکلوں سے عاجز ہو کر عبداللہ بن زبیر کے چند روزہ عہد خلافت میں اُنکے بھائی مصعب بن زبیر کے حکم سے حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہ قرشی نے ؁ھ میں سکے بنانا شروع کر دیے۔ یہ سکے بالکل ایرانی سکوں کی وضع پہ بنائے گئے تھے فرق اتنا تھا کہ اُن پر الفاظ "برکۃ" اور "اللہ" بڑھا دیے گئے تھے۔ مگر عام مورخین اور کل محققین کو عبداللہ بن زبیر کے عہد میں سکہ بننے سے انکار رہا ہے۔ حیرت ہے کہ ناسخ التواریخ میں لکھ دیا ہے کہ ؁ھ خلافت جناب فاروق اعظم میں اسلامی سکے کے درہم و دینار مروج ہوئے جن میں سے بعض پر "لا الٰہ الا اللہ" بعض پر "الحمد للہ" بعض پر "قل ہو اللہ احد" اور بعض پر اوپر "اللہ" اور اُسکے نیچے جناب عمرؓ کا نام منقوش تھا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس بیان کے صحیح ہونے کا گمان بھی کریں تو کیونکر؟ افسوس ہے کہ ناسخ التواریخ جس قدر مبسوط لکھی گئی ہے اُسی قدر جمع روایات میں بے احتیاطی سے کام لیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں سکہ بننا بالکل بے اصل ہے۔ اگر کسی قدر اسکی اصلیت ہو سکتی ہے تو اس قدر کہ انکے عہد خلافت ؏ میں ایک کسرویہ سکہ مروج تھا جس کا نام آخر میں بغلیہ ہو گیا۔ بغلیہ اس لیے کہ اس پر ایک جانب خچر کا سر بنا تھا اور دوسری طرف کسریٰ کی تصویر مع اُسکے تخت کے تھی۔ اور تخت کے نیچے لکھا تھا "نوش خور" (یعنی خوشی کے ساتھ نوش کر) اس بیان کی نسبت اول تو یہی نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں تک قابل اعتبار ہے اور اگر مان بھی لیا جائے تو اُسکی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے

؎ دیکھو فتوح البلدان۔

؏ دیکھو حیوۃ الحیوان مصنفہ دمیری شافعی۔

کہ جناب فاروق کے حکم سے بنا۔ پھر یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس پر خنجر کی صورت
کیوں بنائی گئی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بغلیہ نام کا ایک سکہ خلافت راشدہ کے
زمانے سے بنی اُمیہ کے دور تک ونیز اسلام میں مروج تھا۔ جس بات پر مورخین
کو اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں ترویج سکہ کے فخر کا مستحق عبدالملک بن مروان ہے
جو بنی امیہ میں سب سے زیادہ نامور خلیفہ اور دولت مروانی کا دوسرا [illegible] ہے۔

ترویج سکہ کا تفصیلی حال[خہ] ہارون رشید نے اپنے دربار میں ایک موقع پر
کسائی نحوی سے بیان کیا تھا جو بمقابلہ دیگر بیانوں کے زیادہ واضح ہے۔ وجہ یہ
ہوئی کہ ایک مرتبہ مخصوصین دربار پر تقسیم کرنے کے لیے رشید کے سامنے توڑے لاکے
رکھے گئے۔ ایک تھیلی پھٹی تھی اُس میں سے ایک دینار نکل کے باہر گر پڑا۔ اس کے
نقش خوب اُبھرے ہوئے تھے اور حروف نہایت واضح طور پر پڑھے جا سکتے تھے۔
رشید نے اُس دینار کو جھک کے اُٹھا لیا اور اُلٹ پلٹ کے اُسکے نقوش کو حیرت
سے دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے کسائی کی طرف جو حاضر دربار تھے متوجہ ہو کے کہا
"جانتے ہو یہ کس عہد میں بنے تھے؟" کسائی نے عرض کیا "جی ہاں عبدالملک
بن مروان کے عہد میں"۔ رشید نے "اچھا" اور یہ بھی جانتے ہو کہ انکے بننے کا سبب
کیا ہوا؟" کسائی نے کہا "نہیں مجھے اس کی خبر نہیں"۔ تب رشید نے یہ واقعہ
بیان کیا کہ درہم و دینار عبدالملک کے عہد تک نہیں بنائے گئے تھے۔ عرب میں
ایرانی درہموں اور رومی دیناروں کا رواج تھا۔ عبدالملک نے جو یکبیک
ٹکسال قائم کر دی اسکی وجہ یہ ہوئی کہ قراطیس وغیرہ لکھنے میں جو کاغذ کام آتے
تھے وہ مصر میں بنائے جاتے تھے (یہ گویا ایک قسم کے فارم تھے جیسے بنائے ملا کرتے
تھے) بنانے والے حسب رواج قدیم اُن کی پیشانی پر بطور نشان تجارت کے رومی
زبان میں کچھ الفاظ لکھ دیا کرتے تھے۔ یہی الفاظ مصر کے بنے ہوئے حریر کے تھانوں اور
ظروف وغیرہ پر بھی لکھے ہوتے تھے۔ اسلام میں بعد فتح مصر کبھی ان الفاظ کی طرف
توجہ نہیں کی گئی اور نہ یہ پوچھا گیا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ عبدالملک ایک متجسس
طبیعت کا آدمی تھا۔ فرمان کے اُن فارموں میں سے اتفاقاً ایک اُسکی نظر سے گذرا

خـہ دیکھو حیوۃ الحیوان۔

تو اس نے اپنے مترجم سے پوچھا "یہ کیا لکھا ہے؟" مترجم نے کہا "باپ بیٹا روح القدس"
اتنا سنتے ہی عبد الملک سناٹے میں آگیا۔ اور پھر بولا "یہ کلمۂ کفر اب تک مروج چلا آیا۔
اور حیرت ہے کہ کسی کا خیال اسکی طرف نہ گیا"۔ اسکے بعد اُس نے فوراً اپنے بھائی
عبد العزیز بن مروان کو جو والیِ مصر تھا لکھا "مصر کے تمام کاریگروں کو حکم دیدیا جائے کہ
آیندہ سے تمام فارموں کی پیشانیوں۔ تھانوں اور ظروف پر ان الفاظ کی جگہ کلمۂ
توحید" اشھد انہ لا الہ الا ہو" لکھا کریں۔ اور منادی کردی جائے کہ جو کوئی اسکے خلاف
کرے گا سخت سزا پائے گا"۔ اس حکم پر فوراً عمل درآمد شروع ہوگیا۔ اس عہد کے
بنے ہوے بعض فارم قیصر روم (جسٹنین دوم) کی نظر سے گذرے تو اُسے نہایت
ناگوار ہوا۔ قیصر نے بہت سے قیمتی ہدایا کے ساتھ عبد الملک کے دربار میں ایک
سفارت بھیجی اور خط میں یہ مضمون لکھا "ان الفاظ کا رواج تمام گذشتہ خلفا کے عہد
سے چلا آتا ہے یا تو وہ سب غلطی پر تھے یا آپ غلطی پر ہیں۔ مجھے بتائیے کہ ان
دونوں میں سے کون بات ہے"۔ اس کے بعد درخواست کی تھی کہ ان ہدایا کو
قبول فرمائیے اور ان کے معاوضے میں اُس رسم قدیم کو جاری رہنے دیجیے"۔ عبد الملک
کو اس خط پر بڑا غصہ آیا۔ مگر اُس نے ضبط کیا۔ سفارت مع اُن ہدایا کے واپس
کردی اور خط کا کچھ جواب نہیں دیا۔ قیصر کی طرف سے وہ ہدایا دُونے کردیے
گئے اور پھر سفارت آئی کہ شاید یہ ہدایا آپ کی نظر میں کم اُترے۔ لہذا اب مضاعف
کرکے روانہ کیے جاتے ہیں۔ مگر سفارت پھر اُسی طرح بےنیل مرام واپس گئی۔ تیسری
مرتبہ قیصر نے ہدایا کو اور بڑھایا اور خط میں مذکورہ مضامین کے بعد لکھا بلکہ یوں کہنا
چاہیے دھمکی دی کہ "اگر اس رسم کے پھر جاری ہونے کا حکم نہ دیا جائے گا تو میں
اپنے ہاں سکّے میں تمھارے پیغمبر (صلعم) کے نام کے ساتھ ایسے الفاظ نقش کراؤنگا
جو تم کو نہایت ناگوار ہوں گے۔ اُس وقت تمھارے بنائے کچھ نہ بنے گی اور وہ
سکّے تمھارے وہاں گھر گھر میں اور ساری دنیاے اسلام میں پھیل جائیں گے۔
یہ تم کو معلوم ہے کہ عرب اور سارے مسلمان ہمارے سکّے سے کام لینے پر مجبور
ہیں"۔ یہ دھمکی عبد الملک بن مروان پر اثر کر گئی۔ وہ انتہا سے زیادہ پریشان
ہوا۔ اور گھبرا کے کہ اُٹھا "اب کیا کیا جائے؟" اہل دربار نے مشورہ دیا کہ اس

اس امر میں آپ خالد بن یزید بن معاویہ سے رائے لیں وہ کوئی نہ کوئی تدبیر نکالیں ہی گے۔ خالد سے پوچھا تو اُنھوں نے کہا "کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ اپنے سکّے خود بنا کے مروج کر دیجیے۔ اور ممانعت کر دیجیے کہ رومی سکوں کا چلن قلمرو خلافت کے اندر نہ باقی رہے"۔ غرض اسی رائے کے مطابق اسلامی سکوں کے لیے جناب فاروق رض کے معین کیے ہوے اوزان قائم کیے گئے۔ ٹکسال جاری ہوئی اور یوں اسلام کو غیر ممالک کے سکوں سے آزادی حاصل ہوئی۔

اس واقعے کی تصدیق کسی حد تک انگریزی مورخوں کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ ۷۳ھ (۶۹۲ و ۶۹۳ء) میں جسٹینین دوم قیصر روم اور عبد الملک کے بھائی محمد بن مروان سے لڑائی ہوئی۔ محمد نے ابتداءً تو برابر رومیوں کو شکستیں دیں۔ لیکن آخر صلح ہو گئی۔ اس صلح کے بعد ۷۵ھ یا ۷۶ھ میں خلیفۂ عبد الملک کی طرف سے قیصر مذکور کے پاس ایک خط گیا جس میں ایسے الفاظ تھے جن سے قیصر کو اپنی توہین کا گمان ہوا۔ اُس نے وہ صلح توڑ دی اور اسکے ساتھ عبد الملک کو دھمکی دی کہ میں ایسے سکے مروّج کروں گا جن پر اسلام کی توہین کے کلمات کندہ ہوں گے۔ اسلام میں اسوقت تک سکے نہیں جاری کیے گئے تھے۔ (ایرانی اور رومی) سکوں سے کام چلایا جاتا تھا۔ غرض اُسوقت عبد الملک سکہ بنوانے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اُس کے حکم سے تیما کے ایک یہودی سُمیر نامے نے ٹکسال قائم کی۔

ع۵ تمام معتبر اور مستند مورخوں کی رائے ہے کہ عبد الملک نے خالد بن یزید کی ہدایت کے مطابق سکہ بنوایا۔ خالد بنی امیہ میں بہت بڑا عالم و فاضل اور گویا اسلام کا پہلا فیلسوف ہے۔ یہ یزید بن معاویہ کا بیٹا تھا۔ مگر سب کے خلاف دمیری شافعی نے بیہقی سے جو روایت کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد نہیں بلکہ امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کی ہدایت کے بموجب عبد الملک نے سکے بنوائے۔ یہ روایت تمام مورخین کے بیان کے خلاف ہے۔ اور اسی لیے ہم نے جمہور کے بیان کا تتبع کیا ہے جو قرین قیاس ہے۔

ع۶ دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانکا۔

انگریزی مورخوں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد کی تمام ترقیوں کو کسی نہ کسی طریقے سے حتی الامکان اپنی طرف اور نہیں تو کسی غیر قوم کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ اس کوشش میں کبھی اپنی امکانی قوت میں نکال کے زبردستی اور غلط بیانی سے بھی کام لینے لگتے ہیں۔ سکے کی ایجاد جو سُمیر کے نام کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے یہ بھی ایک اسی قسم کا واقعہ ہے۔ بعض قدیم تاریخوں سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنوں ایک قسم کے درہم یا دینار سُمیریہ کے نام سے مشہور تھے۔ اور سمیریہ اسی لیے کہلاتے تھے کہ اُنکے بنانیوالے کا نام سُمیر تھا۔ مجرد اتنے بیان تک یہ واقعہ مبہم معلوم ہوتا ہے مگر علامہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں صاف کر کے کھول دیا۔ جسکے بعد شبہہ کی بالکل گنجائش نہیں باقی رہتی۔ وہ سنہ ۷۶ ہجری کے واقعات میں جہاں عبد الملک بن مروان کے حکم سے اسلامی سکہ بنائے جانے کا واقعہ بیان کرتے ہیں وہاں لکھتے ہیں کہ حجاج نے اپنے سکّے مروج کرنے کے بعد قطعی ممانعت کردی کہ رعایا میں سے کوئی شخص سکہ بنانے کی جرأت نہ کرے۔ اس حکم کے خلاف سُمیر نامے ایک یہودی سکہ زنی کے جُرم کا مرتکب ہوا۔ جب اُسے گرفتار کرکے حجّاج کے سامنے لائے تو اُس نے کہا میرے بنائے ہوئے سکّے شاہی سکے سے زیادہ خالص اور کھرے ہیں اور جب میں نے دراصل سکہ بنا کے نقصان کی جگہ رعایا کو فائدہ پہونچایا تو پھر آپ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں؟ حجاج نے اُس کی اس حجت کو نہ مانا۔ اس میں شک نہیں کہ سُمیر ایک ذہین آدمی تھا۔ اُس نے مقید ہی کی حالت میں تولنے کے بٹّے ایجاد کیے۔ اس لیے کہ اُس زمانے میں دینار و درہم کی طرح بٹّے بھی غیر منتظم حالت میں تھے۔ ممالک میں کوئی عام وزن نہیں قائم ہوا تھا۔ سُمیر نے بٹّے بنا کے حجاج کی خدمت میں پیش کیے اور رہائی کے لیے ملتجی ہوا۔ مگر حجاج نے اسپر بھی نہ مانا۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ سُمیر کے بنائے ہوئے بٹّے مروج ہوگئے اور رعایا کو تاجروں اور بازاروں کے غبن سے بہت کچھ نجات مل گئی۔ سُمیر کی نسبت اس سے زیادہ پتہ نہیں لگتا کہ حجاج کی قید میں اُس کا کیا حشر ہوا۔ غالباً قتل کیا گیا ہوگا۔ کاش اگر یہ کہا جاتا کہ سُمیر نے مسلمانوں کو بٹّے دیے تو ہمیں بے شک تسلیم کرنا پڑتا کہ دنیا دی

انتظام مین ایک حدتک خلافت اُسکی زیر بار احسان تھی۔ مگر یہ تو بالکل لغو ہے کہ سُمیر نے سکہ بنا دیا۔ جو سکّے سمیریہ کے نام سے مشہور تھے غالبًا وہ وہی تھے جن کو سمیر نے مجرانہ طور پر بنا کے پھیلا دیا تھا۔

بعض مورخین اسلام نے پہلے پہل سکہ بننے کا حال یون لکھا ہے کہ عبدالملک کی طرف سے جو خطوط قیصر کے پاس جاتے تھے اُنکی پیشانی پر لکھا ہوا تھا۔ "قل ہو اللہ احد" اسکے بعد محمد صلعم کا نام مبارک اور اُس کے نیچے تاریخ لکھی جاتی تھی۔ قیصر کو یہ ناگوار ہوا۔ اُس نے جواب مین لکھا "اس وضع کو چھوڑ دو ورنہ مین دینارون پر تمھارے پیغمبر کی نسبت ایسے کلمات نقش کراؤن گا جو تمھین ناگوار ہون گے"۔ یہ امر عبدالملک کو بہت ہی دشوار معلوم ہوا۔ اُس نے لوگون سے مشورہ کیا۔ خالد بن یزید نے رائے دی کہ "آپ خود اپنا سکہ جاری کرین"۔ عبدالملک نے حجاج کو ٹکسال قائم کرنے کا حکم دیا۔ حجاج نے اس حکم کے مطابق درہم و دینار بنانا شروع کیے اور اُن پر یہ عبارت نقش کرائی "اللہ احد اللہ الصمد" یہ سکہ عام اہل اسلام کے خلاف ہوا اس لیے کہ یہ قرآن کی عبارت تھی جس کو بے طہارت و وضو مس کرنا حرام ہے۔ تاہم اس ناراضی کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ یہ سکہ ۷۴ھ مین بنا اور ۷۵ھ مین تمام ممالک مین پھیلا دیا گیا۔

چند روز بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ سکہ خالص نہین ہے۔ چنانچہ یزید بن عبدالملک کے عہد مین جب ابن ابی ہبیرہ والی عراق مقرر ہوا تو اُس نے اس سکے کے خالص کرنے کی کوشش کی۔ پھر ہشام کے زمانے مین خالد قسری نے اور خالص کرنا چاہا۔ ان دونون کے بعد یوسف بن عمر نے سب سے بڑھ کر اس مین اہتمام کیا اور ٹکسال کا اچھی طرح امتحان کرکے اپنے عہد کا سکہ بالکل خالص بنا دیا۔ اسی وجہ سے ہبیری۔ خالدی۔ اور یوسفی سکے عہد بنی اُمیہ کے سب سے خالص اور کھرے سکے تصور کیے جاتے تھے۔ یہی خیال تھا جس نے بنی عباس کے دوسرے خلیفہ ابوجعفر منصور کو حکم عام دیدینے پر آمادہ کیا کہ خراج مین مذکورہ تین سکون کے سوا اور کوئی سکہ نہ لیا جائے۔

قبل اسلام سلاطین ارض کا عام قاعدہ تھا کہ سکوں پر مختلف قسم کی تصویریں بنایا کرتے تھے - کبھی تو بادشاہ کی تصویر کندہ ہوتی تھی - کبھی کسی قلعے کا نقشہ بنایا جاتا تھا - کبھی کوئی جانور بنا ہوتا تھا کبھی کوئی اور چیزیں ہوتی تھی - مسلمانوں نے جب سکہ بنایا تو تصویرین بنانا چھوڑ دین اور اُنکے عوض پر زور کلمات کندہ کرائے - زیادہ تر اس کی وجہ تو یہ تھی کہ شریعت اسلامیہ مین تصویروں کی ممانعت ہے - مگر قطع نظر اسکے ایک اور بھی خیال تھا جس نے انکو تصویروں کی جگہ الفاظ کندہ کرانے پر آمادہ کیا - عرب فصاحت وبلاغت کو اپنا قدیمی تمغہ خیال کرتے تھے - انکو دعوے تھا کہ شوکتِ الفاظ مین کوئی ہمارا مقابلہ نہین کر سکتا - اور اسی وجہ سے الفاظ وکلمات ہی کو اُنھون نے اپنا معرکہ قرار دیا - یہ سکہ مدور وضع کا تھا - ایک رخ پر تو اللہ جل شانہٗ کا نام منقوش ہوتا تھا اُسکے نیچے رسول مقبول صلعم پر درود کندہ ہوتا تھا - اور دوسرے رخ پر تاریخ اور بادشاہِ وقت کا نام لکھا جاتا تھا - آیات قرآنی لکھنے کا سلسلہ حجاج کے بعد سے موقوف ہو گیا - اسلامی سکہ بنی اُمیہ عباسیہ اور عُبیدین مصر کے زمانون مین اسی قطع کے مدور رہے - لیکن مغرب مین جب دولت موحدین قائم ہوئی تو مہدی سے لوگون کے لیے مربع قطع کے سکّے سکون کیے جن کا براہِ اُسی خاندان مین رواج رہا -

یہان پر ہم سکے کے بیان کو ختم کرتے ہیں اور آخر مین اتنا اور لکھتے ہین کہ وہی سکہ جو عبد الملک کے عہد مین مروج ہوا وہی شرعی سکہ کہلاتا تھا اس لیے کہ جناب فاروقؓ کے قائم کیے ہوے اوزان پر بنایا گیا تھا -

عربی سے فارسی واُردو کے تعلقات ستمبر ۹۳ء

بعض لوگون کو ان دنون ہم اس خیال مین محو پاتے ہین کہ فارسی یا اُردو زبان میں سے عربی کے الفاظ بالکل نکال ڈالے جائین - یہ خیال کچھ ان مشرقی زبانون ہی کے ساتھ مخصوص نہین ہے بلکہ ہم انگریزی مین بھی دیکھتے ہیں کہ ایسی کوشش ایک عرصہ سے جاری ہے - انگریزی زبان میں بے انتہا لاطینی (رومی) الفاظ ملے ہوے ہیں -

جو انگریزی قوم پسے رومیون کی غلامی کا داغ کسی طرح مٹنے نہین دیتے۔ اور کوئی تعجب نہین کہ لاطینی الفاظ کے نکالنے پر جو چیز آمادہ کر رہی ہے اُس مین زیادہ حصہ اسی خیال کا ملا ہو۔

فارسی اور اُردو مین جو عربی الفاظ ملے ہوے ہین وہ بھی اس امر کا ثبوت دیتے ہین اور ہمیشہ دین گے کہ ایران و ہندوستان کو کسی زمانے مین اسلام کی غلامی نصیب ہوئی تھی۔ جو لوگ ان الفاظ کو نکالنا چاہتے ہین غالبًا اُن کا بھی یہی خیال ہوگا کہ اپنی زبان کو عربی یا دوسرے الفاظ مین یون کہا جائے کہ اسلام کی قید سے آزاد کرانا چاہتے ہین۔ مگر شاید ایسی کوششین ہمارے خیال مین بڑی مشکل سے کامیاب ہوسکین۔ فردوسی نے ایک شاہنامہ لکھا جسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ عربی الفاظ سے بچنے کی پوری کوشش کی تھی۔ لیکن اب شاہنامے کے دیکھنے والے بتا سکتے ہین کہ فردوسی کو اس ارادے مین کہان تک کامیابی ہوئی۔ بڑی تحقیق کے بعد جو کچھ فیصلہ کیا جا سکا وہ اسی قدر ہے کہ شاہنامے مین عربی الفاظ بہت کم ہین۔ یہ کوئی نہین کہہ سکتا کہ عربی الفاظ اُس مین بالکل نہین۔ ادھر آخر زمانے مین ناصرالدین شاہ ایران کے چچانے نثر مین ایک تاریخ بنام نامۂ خسروان لکھی۔ اس میں بھی عربی الفاظ بالکل متروک کردیے ہین۔ اور بے شک وہ اسوجہ سے بہت کچھ قابل تعریف ہین کہ اپنی وضع کو آخر تک نباہ لیجا سکے۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ اُسکی عبارت مروجہ فارسی سے کہان تک موافق رہی ہے اور محاورات کی کسوٹی پر کس قدر پوری اُترتی ہے تو شاید اُنکو جواب دینا دشوار ہوگا۔ زبان کی اصلاح وہین تک جائز ہے جہان تک کہ محاورہ اور اہل زبان کی پیروی کا سے ہو۔ جب ایرانیون کی زبان پر ہزارہا ایسے عربی الفاظ چڑھے ہوے ہین جن کی جگہ پر کوئی ٹھیٹھ فارسی لفظ بولنے والون کو روزمرہ کے استعمال کے لیے نہین ملتا تو اُنکے نکالنے کی کوشش کرنا زبان کی اصلاح نہین بلکہ ایک قسم کا جنون ہے۔ دری زبان کے الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے استعمال کرنا کوئی مشکل کام نہین ہے اگر دشواری ہے تو یہ کہ اُنکے استعمال مین محاورے کا لحاظ رکھا جائے۔

تاہم یہ کتا مین تاریخ مین ہین کسی علم و فن کی دنیا مین قدم رکھتے وقت

نسان کو معلوم ہو سکتا ہے - فارسی زبان کس قدر بے مایہ ہے - بغیر اسکے کہ عربی الفاظ سے مدد لی جاوے کوئی شخص ایک علمی مسئلہ بھی فارسی مین نہین بیان کر سکتا - جو صاحب اس قسم کی کوشش کرنا چاہتے ہین اُن کا کام ہے کہ زبان کو اپنے ہوں سے درست کریں - آج تک کسی نے اتنا تو کیا نہین کہ فارسی کی صرف و نحو ہی درست کی ہوتی - آج تک جس کسی نے نحو مین کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ کیا اس نے وہی عربی کے قواعد عربی ہی اصطلاحات کے ساتھ فارسی میں بیان کر دیئے - حالانکہ سمجھنے والے خوب جانتے ہین کہ گو ہزار ہا عربی الفاظ فارسی مین مستعمل ہین مگر زبان اپنے طرز سے ایسی علٰحدہ واقع ہوئی ہے کہ عربی کے قواعد فارسی پر ٹھیک منطبق نہین ہو سکتے بلکہ عربی کی جگہ اگر انگریزی نحو و صرف سے فارسی مین کام لیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا - بہرحال فارسی کے ہمدرد آج تک اُسکے لسانی قواعد تو درست ہی نہین کر سکے عربی کی غلامی سے اُسے کیا خاک آزاد کرالین گے؟

ایک پارسی صاحب نے ایک انگریزی اخبار مین ابھی اس خیال پر زور دینا چاہا تھا جو ماشاء اللہ نہ فارسی ہی جانتے ہین اور نہ عربی ہی - اُنھون نے محض اپنے حسن عقیدت سے یہ دعوے کر دیا کہ فارسی اس قدر مکمل زبان ہے کہ بعض موقعون پر عربی کو اُسکے خزانے سے الفاظ عاریت لینا پڑے - چنانچہ انھون نے شاید کسی سے سُن کے لگام کے لفظ کو پیش کیا ہے جسکو عربون نے معرب کر کے لجام کر لیا - اور آج تک مروج ہے - یہ خیال بعض ایرانی صاحبون مین بھی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ دو ایک عجمیون کی زبان سے ہم نے خود بھی سنا ہے - وہ کہتے ہین کہ جاہلیت مین سیف بن ذی یزن کی فریاد پر جب ایرانیون نے ملک یمن پر قبضہ کر لیا تو اُس زمانے مین فارسی کے بہت سے الفاظ عربون کی زبان پر مروج ہو گئے - قطع نظر اسکے عرب کے حصۂ حیرہ وغیرہ پر دتون سے ایران کی حکومت تھی - یہ بھی ایک کافی ذریعہ عربی مین فارسی الفاظ کے جانے کا تھا - لیکن یہ خیال ایک جاننے والے کے نزدیک بالکل لغو اور بے سر و پا ہے دل تو جہان عرب کے حصہ حیرہ وغیرہ کی حکومت ایرانیون کے ہاتھ مین تھی وہان سرحد شام سے ملے ہوئے اضلاع عرب پر روم کی حکومت تھی - علیٰ ہذا القیاس یمن پر جہان چند

روز کے لیے ایرانیون کی حکومت رہی وہان اُن سے پیچھے بہ ساعت نجاشی بہت تک روم کی بھی حکومت رہی - کوئی وجہ نہین کہ عربی نے ایرانیون سے اُنکی زبان کے الفاظ تو لیے ہون اور رومی زبان کے الفاظ یونہیں چھوڑ دیے ہوں -

قطع نظر اسکے شاید اس خیال والون کو یہ نہیں معلوم کہ اضلاع عرب پر غیر ممالک کی حکومت تھی بھی تو کس طرح کی - سیف بن ذی یزن کے عہد مین جو ایرانیون نے ملک یمن کو فتح کیا اُس کی یہ حالت تھی کہ یمن پر بادشاہ حبشہ سے متصرف ہوکے جب وہان کے شرفا کی آبروریزی شروع کردی تو سیف بن ذی یزن نے کسریٰ کے دربار مین جاکے فریاد کی اور بہت دنون تک پڑا رہا - آخر کسریٰ نے ایک فوج دے کے اپنے ایک افسر کے ساتھ اُسے یمن پر روانہ کیا - اس فوج نے حبشہ والون کا قلع وقمع کیا اور سیف بن ذی یزن کو بادشاہ بنایا - اس مین شک نہین کہ ملک کو ایرانیون نے فتح کیا مگر حکومت سیف بن ذی یزن کی رہی جو عربی نژاد تھا - بس اتنا تھا کہ وہ ایران کے آگے سر جھکائے ہوئے تھا - ورنہ یہان کے انتظامات اور معاملات سے شہنشاہ ایران کو کوئی تعلق نہ تھا - باقی رہے اضلاع حیرہ وغیرہ یہان کی بھی یہی حالت تھی - ان مقامات پر نعمان بن منذر کا خاندان حکمران تھا - سیف بن ذی یزن کی طرح یہان کے فرمانروائون نے بھی یہی کیا کہ تاج ایران کے آگے سر جھکائے رہے - غرض ایرانی رعایا سے عربی رعایا کے تعلقات کبھی اتنے نہین بڑھنے پائے کہ الفاظ و خیالات کا باہم تبادلہ ہوتا یا عجمی الفاظ عربی مین پہونچتے -

دوسرے سب سے زیادہ جس بات نے عربی زبان کو خارجی اثرون سے بچایا وہ یہ تھی کہ عرب مین سب سے زیادہ مستند اور قابل تتبع قریش کی زبان تھی جن کو خدا نے ہمیشہ غیر قومون کی اطاعت سے بچایا - قریش نے کبھی کسی کے آگے سر اطاعت نہیں جھکایا - اور نہ اُن کو سوا خاص تاجرانہ سفرون کے غیر زبان بولنے والون سے ملنے کی ضرورت لاحق ہوتی تھی - لہذا اُنکی زبان ہمیشہ ان خارجی اثرون سے محفوظ رہی - اور عربی زبان مین کوئی لفظ شامل ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ قریش کے لوگ اُسکو تسلیم نہ کرلین - غرض ان وجو

سے کبھی قیاس ہی مین نہین آ سکتا کہ فارسی کے الفاظ عربی مین شامل ہوے ہون۔
ہان بعد اسلام البتہ عربی مین فارسی کے بعض الفاظ مستعمل ہو گئے جس کی وجہ یہ ہوئی کہ خلافت عباسیہ نے اپنا مستقر بغداد کو قرار دیا جو دراصل ایک ایرانی شہر تھا۔ صرف اتنا ہی نہین ہوا بلکہ عجمی خاندان وزارت کے درجے کو پہونچ گئے۔ جس کی وجہ سے عربون کو ایرانیون سے ملنے جلنے کی بہت ضرورت ہوئی اُسپر طرہ یہ ہوا کہ خلفا اور اُن کی وجہ سے تمام امرائے عرب عیش و عشرت کے سامانون کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جن کے لیے مملکت ایران اگلی دنیا مین مشہور تھی۔ یہ وہ سامان تھے جو کبھی اہل عرب کے خواب و خیال مین نہ گذرے تھے۔ اور ان مین بہت سی ایسی چیزین تھیں جن کے لیے عربی زبان کو فارسی ہی سے الفاظ لینا پڑے۔ ہمنے عربی زبان مین "شمعدانات" کا لفظ بھی دیکھا ہے جو اسی عہد مین عربون کی زبان پر جاری ہوا۔ بلکہ حکومت کی وجہ سے اس سے پیشتر بھی تعلقات قائم ہو گئے تھے کہ بنی اُمیہ ہی کے دور مین عربون کی زبان پر فارسی کے الفاظ چڑھ گئے۔ بنی اُمیہ کے ابتدائی زمانے کا شاعر ابن مفرغ جو زیاد کے بیٹے عباد کے ہمراہ سیستان کے جہاد پر آیا تھا۔ شہدائے سندھ کے مرثیے مین کہتا ہے۔ ؎

کم بِالجُرُومِ وارضِ الہند من قَدَمٍ
وَمِن سَرَاتِک قتلٰی لا ہم قُبِرُوا

(ممالک گرم مین اور ارض ہند مین بہت سے نقش قدم ہین اور بہت سے سرہنگان قوم ہین جو شہید ہوے اور دفن نہین کیے گئے)

اس شعر مین اول تو "جروم" جرم کی جمع ہے جو لفظ گرم کا معرب ہے۔ دوسرے مصرعے مین سراتک ہے جو فارسی لفظ سرہنگ کو بگاڑ کے بنایا گیا ہے۔
بہر حال فارسی الفاظ اگر عربی مین آئے تو فتوحاتِ اسلام کے بعد آئے۔
مگر ان الفاظ کے عربی مین مروج ہو جانے سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ عربی ان الفاظ کی محتاج تھی۔ عربی زبان کے خزانے مین اس کثرت سے الفاظ موجود ہین کہ یہی زبان تھی کہ تمام علوم فلسفیہ و طبیہ یونانی و رومی زبانون سے لیے بغیر اس کے کہ اسے ایک اصطلاح کے لیے بھی ان زبانون کا زیر بار احسان ہونا پڑا ہو۔

جناب شہربانو

ہم نے ایک مضمون "خاندان نبوت" کے متعلق لکھا تھا۔ بادی النظر میں ہمارا خطاب انگریزی مورخوں کی طرف تھا۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان بھی ہم سے خفا ہو گئے۔ سنتے ہیں ہماری تکفیر کے لیے فتوے لیے گئے۔ مگر کسی نے اتنی عنایت نہ کی کہ اُن فتوون کو ہمارے پاس بھی بھیج دیا ہوتا کہ دیکھتے آخر ہماری خطا کیا ہے؟ اور کون کون صاحب ہین جو ہماری تکفیر فرماتے ہین؟

لاؤ تو قتل نامہ مرا مین بھی دیکھ لون
کس کس کی مُہر ہے سر محضر لگی ہوئی

تاہم ہمکو بجائے خود اطمینان ہے۔ اور ہم بہت خوش ہین کہ اس مضمون مین ہمنے جو کچھ لکھا اُس مین سے ایک لفظ بھی بے اصل نہین۔ بعض احباب کی زبانی معلوم ہوا کہ ہم نے جو جناب شہربانو کے زبید کے نکاح مین آنے کا حال لکھا تھا اُسی پر لوگون کو غصہ آگیا۔ اگر یہی ہے تو افسوس کی بات ہے۔ یہ امر تو ایسا ہے کہ مستند مورخین مین سے کسی کو انکار نہین۔ ہم دو کتابون کی عبارتون کا ترجمہ کیے دیتے ہین۔ اور کتابین بھی کون؟ جن سے زیادہ مستند تاریخین تاریخ کی دنیا مین نہین مل سکتین۔

محمد بن جریر طبری کی تاریخ مطبوعہ لیڈن کے صفحہ ۲۴۸۰ مین ہے "علی بن حسین بن علی بن ابی طالب۔ آپ کی والدہ غزالہ تھین جو اُم ولد تھین۔ بعد امام حسینؑ کے زبید اُنکے غلام نے اُنکو اپنے عقد نکاح مین لیا۔ تب عبداللہ بن زبید پیدا ہوے جو علی بن حسین کے بھائی ز اخیافی ہین"۔

معارف ابن قتیبہ مطبوعہ لیڈن کے صفحہ ۱۱۰ مین مندرج ہے "اور علی بن حسین اصغر امام حسین کی نسل آپ ہی سے چلی۔ بعض کہتے ہین آپ کی والدہ سندیہ تھین۔ جن کا نام بعض سلافہ اور بعض غزالہ بتاتے ہین۔ بعد امام حسینؑ کے اُنکو امام حسینؑ کے غلام زبید نے اپنے عقد مین لیا۔ اور عبداللہ بن زبید پیدا ہوئے جو علی بن حسین کے اخیافی بھائی ہین"۔

آغانی جو باعتبار اسناد اسی پایے کی کتاب ہے اُس میں بھی یہی واقعہ مندرج ہے۔ قدیمی تاریخیں جن پر کہ استناد و اعتبار کا دارومدار ہے وہ یہی ہیں۔ اور یہی اصلی سرچشمہ ہیں جن سے سلسلے کے متاخرین نے مصنفین کا فخر حاصل کیا۔ ابتداءً ہم نے اس واقعے کو ابن خلکان سے نقل کیا تھا۔ جو نہایت متداول کتاب ہے۔ اور غالباً ہر جگہ دستیاب ہو سکے گی۔ جن صاحب کو اطمینان حاصل کرنا ہو اُس کے ورق اُلٹیں اور امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے حالات میں دیکھ لیں۔ ابن خلکان نے شاید غلطی سے جناب شہربانو کے دوسرے شوہر کا نام زید لکھ دیا ہے۔ اگرچہ یہ بتایا ہے کہ وہ جناب امام حسین کے غلام تھے۔ مگر اب ہم کو بعد تحقیق معلوم ہو گیا کہ اُن بزرگ کا نام زید نہیں زُبید تھا۔

سب سے بڑھ کر لطف کی یہ بات ہے کہ جو خدشہ اس معاملے میں معترضون کو گذرا ہے یہی خدشہ انکی طرح خاص اُسی زمانے میں عبدالملک بن مروان کے دل میں بھی گذرا تھا۔ لہذا ہم بھی اُنکو وہی جواب دینا مناسب خیال کرتے ہیں جو عبدالملک مذکور کے مقابلے میں جناب امام زین العابدین کی زبان فیض ترجمان سے ظاہر ہوا تھا۔ مذکورۂ بالا کتاب معارف ابن قتیبہ میں ہے "علی بن حسین (رضی اللہ عنہ) نے اپنی والدہ کا عقد اپنے غلام سے کر دیا۔ اور اپنی ایک لونڈی کو آزاد کر کے خود اپنے عقد نکاح میں لے لیا۔ یہ سُن کے عبدالملک بن مروان نے اُنکو ایک خط لکھا۔ جس میں اس معاملے پر شرم دلائی تھی۔ علی بن حسین نے جواب میں تحریر فرمایا۔ قد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃٌ حسنۃٌ۔ رسول اللہ صلعم نے صفیہ بنت حیی کو آزاد کر کے اپنے نکاح سے مشرف فرمایا تھا۔ اور زید بن حارثہ کو آزاد فرمایا اور اپنی چچا زاد بہن زینب بنت جحش کو اُن کے نکاح میں دے دیا۔ اب اس سے بڑھ کے کیا شافی جواب ہو سکتا ہے؟ یہ متاخر الذکر واقعہ بھی ابن خلکان میں موجود ہے۔

اس موقع پر ہمیں ایک اور امر کا جواب دینا ہے۔ ایک صاحب نے دلگداز کے اُس مضمون پر بھی جو فتح قسطنطنیہ کے متعلق ہے ایک اعتراض کیا ہے۔ اور اس اعتراض کو اودھ پنچ کے صفحوں پر شایع کیا ہے۔ دلگداز کے مضمون میں ہے کہ

قسطنطنیہ پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد مین جو حملہ ہوا تھا اُس مین جناب امام حسین علیہ السلام بھی شریک مجاہدین تھے - اُس مضمون کے نیچے فٹ نوٹ مین تصریح کردی گئی ہے کہ گبن کا تتبع کیا گیا ہے ۔ ہمارے دوست پہلے گبن ملاحظہ کرلیتے تب اعتراض کرتے۔ شہادت جناب امام حسین علیہ السلام کے بیان مین وہ دیکھین معلوم ہو جائیگا - باقی رہا کہ کسی اسلامی تاریخ سے ثابت کیا جائے اسکے ہم مکلف نہین - اس لیے کہ مضمون مین گبن کے تتبع کی تصریح کردی گئی ہے -

اس موقع پر ہمین معزز ہمعصر اتحاد کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ ایسے نازک وقتون پر وہ ہماری مدد پر آمادہ ہو جاتے ہین - لیکن اُنکو ایسی فضول بحثون مین نہ پڑنا چاہیے - جواب کسی لائق آدمی کے مقابلے مین ہو تو ایک بات بھی ہے - اور یون ہر نادان کی چھیڑ چھاڑ پر اُنھیں اپنے قلم کو زحمت دینے کی ضرورت نہین ہے -

اسلام اور تھیٹر

(۱)

فی الحال یہ بحث پیش ہے کہ اسلام کو تھیٹر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے - اور برگزیدگان دین کا بہروپ بھر کے ایکٹرون کا ناٹک کے اسٹیج پر آنا اسلامی پبلک کی نظر مین کیسا ہے - یہ منحوس بحث تو جہان تک نہ چھیڑی جاتی وہین تک اچھا تھا - اس لیے کہ کوئی مسلمان اس بحث پر کچھ لکھنے کے لیے قلم ہاتھ مین لینے کے بعد اپنے ہوش مین نہین رہ سکتا - ہم اسوقت لکھ رہے ہین اور ہماری آنکھون مین خون اُترا آرہا ہے - جو جو ہمارا قلم آگے بڑھتا جاتا ہے وہ وہ ہمارے دماغ سے نیک و بد کے تمیز کرنے کی حس زائل ہوتی جاتی ہے - بعض پنجابی ہمعصرون نے اس معاملے مین نہایت قیمتی اور پُرجوش مضامین لکھے ہین - اور ان جاہلون کو اسلامی دینی حمیت کا نہایت اچھا سبق دیا ہے جو حیرت سے پوچھتے تھے کہ مسلمانون

کو اس پر کیوں طیش آگیا۔
تھیئٹر کیا چیز ہے؟ اس سے پہلے تو ہم اسی قدر جانتے تھے کہ روساء کی شادیوں اور اکثر عام خوشی کی تقریبوں میں ذلیل بھانڈ کسی خوبصورت لڑکے کو لاکے نچاتے ہیں۔ اور اُس کے ناچ کے درمیان میں کبھی کبھی خود سامنے آکے کوئی مسخرے پن کا واقعہ بیان کرکے یا کسی کا ہروپ بھر کے اوچھی طبیعت والے روسا اور بچوں کو ہنسی کے مارے لٹا لٹا دیتے ہیں۔ ہمارے قدیم اسٹیجوں کے اصلی ایکٹر یہی لوگ تھے۔ یہ عام ہندوستانی سوسائیٹیوں میں نہایت ذلیل سمجھے جاتے تھے۔ اور کوئی مہذب شخص اُن لوگوں کو اپنے پاس بٹھانا بھی جائز نہ سمجھتا تھا۔ لیکن باوجود اس ذلت کے اُنکا جوش مذہبی مشہور تھا۔ چند روز پیشتر کے مسلمان بھانڈوں کا یہ واقعہ ہندوستان کے ہر ہر بچے کو یاد ہے کہ ایک مرتبہ کسی غیر مذہب رئیس کے ہاں کوئی خوشی کی تقریب تھی۔ بھانڈوں کا قاعدہ ہے کہ جسکے ہاں جاتے ہیں پہلے اُسی کی نقل کرتے ہیں۔ شاید اسی امر سے ناراض ہوکر یا خدا جانے کس وجہ سے صاحب خانہ رئیس نے اُن لوگوں سے فرمائش کی کہ اپنے پیغمبر اور اُنکے دوستوں کی نقل نہیں کرتے؟ اسلامی حمیت ان نقالوں کے دل میں بھی کسی نہ کسی قدر ضرور ہونا چاہیے تھی۔ اُنکو یہ متعصبانہ فرمائش سُن کے ملال بھی ہوا ہوگا۔ لیکن اس ملال کو اُنھوں نے نہایت خوبصورتی سے مخفی رکھکے تیور نہ پہچاننے والے متعصبوں سے عرض کیا کہ "بہتر۔ آپ کچھ تلواریں اور نیزے منگوا دیجیے"۔ خود فراموش رئیس اس پر بھی نہ سمجھا۔ اور اُس نے اسلحہ منگوا دیے۔ اس سامان کے ملتے ہی بھانڈوں نے اپنا دلی جوش پورا کرنے کے لیے نہایت ہی خونخوار پارٹ شروع کر دیا۔ ایک شخص (معاذاللہ) محمد رسول اللہ صلعم بنا۔ باقی سب اُنکے جان نثار اور وفادار صحابی بنے۔ مصنوعی پیغمبر آخر الزمان نے تبلیغ رسالت کرکے اپنے پیرووں کو حکم جہاد سنایا۔ اتنا سنتے ہی سب تلواریں کھینچ کھینچ کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جسکے بعد اُن بنے ہوئے پیغمبر صاحب نے حملے کا آخری حکم دے دیا۔ اور وہ اسلامی (مصنوعی) لشکر جو اُسوقت تک ایک شام فاشٹ (جنگ مصنوعی) کا تماشا دکھا رہا تھا سچے

مجاہدین کا گروہ بن گیا - سبھون نے چارون طرف سیر دیکھنے والے اہل مجلس پر حملہ کیا اور دم بھر مین مع اہل خانہ تھیٹر کے سب کو کاٹ کے ڈال دیا گذشتہ برس ایک اسٹیج پر پیغمبر آخرالزمان کا بہروپ دیکھنے کی فرمایش کی گئی تھی اُس کا یہ نتیجہ ہوا - اور اسی لئے ہم کہتے ہین کہ ہمارے متعصب انگلش دوستون کو اگر پیغمبر آخرالزمان کا ناٹک دیکھنا ہے تو خود ہم سے بلا کے کہین اور دیکھین کہ ہم کیسا اچھا اور کسقدر سچا پارٹ کرتے ہین - ایسا پارٹ جسکو دیکھ کے اُنھین کچھ مزہ بھی آئے - اور وہ اُنیسوین صدی کا ناٹک صرف لندن والون کی تفریح گاہ ہی نہ رہے ملکہ خود محمدؐ صاحب کی لائف کی طرح ایک تاریخی یادگار کی بھی حیثیت حاصل کر سکے

اب ہم یہ بتاتے ہین کہ ڈراما کی ابتدا کس وقت اور کیونکر ہوئی - انگریزی مورخین کے نزدیک اسکے بانی اور موجد یونانی بت پرست ہین - اگرچہ ہندوؤن کو بھی اپنی جگہ پر اسکی ایجاد کا دعویٰ ہے - مگر چونکہ یونانیون کے ڈراما کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے - لہذا ہم پہلے یونانیون سے بحث کرتے ہین - پھر ہندوؤن کا ذکر کرین گے -

مسلم ہے کہ سب کے پہلے جمہوری سلطنت یونان مین قائم ہوئی تھی جمہوری ریپلکن اصول کا اصلی مقتضا یہ ہے کہ عام اہل ملک خوش رکھے جائین - یہ غرض بغیر ڈراما کے اور کسی طرح حاصل نہین ہو سکتی تھی - بس انھین ضرورتون کی وجہ سے ڈراما یونان مین پیدا ہوا - اور برابر ترقی کرتا گیا - اگرچہ ڈراما کو زیادہ عروج خاص اتھنس والون کے ہاتھون حاصل ہوا مگر اسکے اصلی موجد ڈوریا والے ہین - جنھون نے پہلے پہل اس کی بنا ڈالی - اور ابتدا اس کی دو نون قسمین ٹریجڈی (حسرت) اور کامڈی (خوشی) ڈوریا والون کی ریاستون پلاپونی نس (جو مقام فی الحال موریا کے نام سے مشہور ہے) مین مروج تھین اور اسی وجہ سے آتیکا کی ٹریجڈی بن گانے والون کی چوکیان جو ڈراما کی اصلی بنا تھین - ڈوریا والون ہی کی لغت مین لکھی جاتی تھین - یہین سے پتہ لگتا ہے کہ اہل اتھنس نے ڈراما کو ڈوریا والون ہی سے لیا تھا -

ابتدائی عہد مین دونون مذکورہ اقسام ڈراما کی ایجاد یون ہوئی کہ

انہیں کے ذریعے سے ڈایونی سس (شراب کے دیوتا) کی پرستش کی جاتی تھی اور دونوں میں ایسا فرق نہ تھا۔ جیسا آج ہے۔ بلکہ اس عہدہ فرق ایسا تھا کہ گانوں اور دیہاتوں مین ڈایونی سس کی پوجا کامڈی کے ذریعے سے کیجاتی تھی۔ اور شہرون مین ٹریجڈی کے ذریعے سے۔ مگر اس ٹریجڈی مین کوئی غم و حسرت کی بات نہ ہوتی تھی۔ ٹریجڈی مین ایک قسم کے ایکٹر بنا کرتے تھے جو سٹائرس کہلاتے تھے۔ اور وہ بکریون کی قطع اور وضع مین اسٹیج پر آکے ڈایونی سس کے بھجن گاتے تھے اور ناچتے تھے۔ اسکے خلاف کامڈی مین جو ایکٹر اسٹیج پر آتے تھے وہ مسخرہ پن کرتے تھے اور ہنستے ہنساتے تھے اور تماشا دیکھنے والون پر پھبتیاں لیتے اور آوازے کستے تھے۔ اسکے بعد دونون قسم کے ڈراما کو تدریجاً ترقی ہوتے گئی۔

ٹریجڈی کو اُسوقت سے ترقی ہونی جب سے اُس مین غزلین گائی جانے لگیں ان غزلون مین اکثر مضامین حسرت ہوتے تھے یعنی ڈایونی سس دیوتا کے مصائب کا دکھڑا رویا جاتا تھا۔ اور اسی وقت سے حسرت واندوہ کے خیالات ٹریجڈی کا جزو رری ہو گئے۔ غزلین اس طرح گائی جاتی تھین کہ پچاس آدمی اس کے ڈایونی سس کی قربان گاہ کے گرد کھڑے ہوتے تھے اور آوازین ملاکر گاتے تھے۔ اس عہد کے بعد کارنتھ مین ایک شخص پیدا ہوا اریان اُس نے اُن غزلون مین اور ترقی پیدا کی

ہوتے ہوتے وہ زمانہ آیا کہ پائی سس ٹرٹیس بادشاہ کے زمانے مین تھس پس نے اسی ڈراما کو ترقی دلانے مین ناموری حاصل کی۔ معمولی ایکٹر جو پیشتر سے معین چلے آتے تھے۔ اُنکے علاوہ تھس پس نے ایک نیا ایکٹر ایجاد کیا اور یہ طریقہ ہو گیا کہ تین ٹریجڈیان ایک ہی غرض سے کیجاتی تھین اور انکے بعد ایک نقل ہوتی تھی۔ اور ڈراما انھین اصول پر چلا آتا تھا۔ یہان تک کہ قبل مسیح ۵۲۵ مین اسکلیس پیدا ہوا۔ اس شخص نے ڈراما مین بہت زیادہ ترمیم کی اور اُس نے گویا ڈراما کی ایجادہ کا وصفت دوریا والون سے چھین کے اتھنس والون کو دیدیا۔ اسکلیس اتھنس کی ٹریجڈی کا موجد ماناگیا ہے۔ اس نے

اول تو تھس پس کی طرح ایک نیا ایکٹر اضافہ کیا - علاوہ برین ڈراما کی حیثیت کذائی جو آج ہمین نظر آتی ہے یہ اسکلیس ہی کی ایجاد ہے - اس لیئے کہ رنگ آمیز پردے اور ایکٹرون کا بیش قیمت اور فوق البھڑک لباس اُسی کی ایجاد ہے - جسکی وجہ سے ڈراما مین رونق کے علاوہ اثر کو بہت کچھ ترقی ہوگئی - پھر حضرت مسیح سے ۴۹۵ برس پہلے سفاکلیز پیدا ہوا - اس نے بھی اپنی یادگار مین ایک ایکٹر اور بڑھایا اور گویا یونانی ڈراما کی تکمیل کر دی - قبل مسیح ۴۸۰ مین یوری پائڈیز پیدا ہوا تھا - اُسنے مذہب اور پوجا کے اغراض سے عام کرکے ڈراما میں اخلاقی معاملات شامل کئے تھے - جس سے بیان کیا جاتا ہے کہ ڈراما خراب ہو گیا تھا - مگر اتنا ضرور ہوا کہ جذبات اور اثر کو بہت کچھ ترقی ہو گئی -

یہ ٹریجڈی کا حال تھا - اب کامڈی کا حال سنئے - قدیم کامڈی کو ابتداءً کریٹینس نے ترقی دلائی جس نے شاہ پری سیس کے زمانے میں شہرت پائی تھی اسکے بعد آرسٹو فینز نے جو کامڈیان مرتب کیں تھیں وہ یا پولیٹکل تھیں - اور ان کے ذریعے سے ممتاز اور سربرآوردہ لوگون کی نقلین کی جاتی تھیں - جن میں ظرافت کا بہت زیادہ حصّہ ہوتا تھا - یونان کے عہد وسطیٰ مین جو کامڈی مروج تھی - اس میں گانے والوں کی چوکیاں موقوف کر دی گئیں تھین اور شخصی نقلین بھی اُڑا دی گئی تھیں - یونانی کامڈی اسی وضع پر رہی اور یونان کے عروج کا زمانہ آخر ہو گیا - یہاں تک کہ فلی من (جو ۳۶۰ برس قبل مسیح پیدا ہوا تھا) اور مینانڈر (جو قبل مسیح ۳۴۲ میں پیدا ہوا تھا) ترقی کے اسٹیج پر نظر آئے - ان میں پچھلا شخص مقدونیہ کے زمانہ عروج کا بہت بڑا نامور شخص تھا - ان دونوں نے مفسر سلطنت سمجھ کے ڈراما میں پولٹیکل واقعات دکھانا ممنوع کر دیا -

اس کے بعد رومیون کا دور شروع ہوا - چونکہ اُنھون نے اپنی ترقی کی بنا یونانی تہذیب کے کھنڈرون پر قائم کی تھی لہذا ڈراما ان مین بھی مروج ہوا - اور انکی بُت پرستی اور دیوتاؤں کی پرستش میں برابر کام آتا رہا -

رومی اور یونانی لوگون کے علاوہ ادھر ہندؤں کو دعوے ہے کہ ہمنے اپنے زمانہ عروج مین ڈراما کو بھی بہت کچھ ترقی دلائی تھی اور بیشک یہ دعوے صحیح ہے

ہندوؤں کی مذہبی تقریبوں مین اب بھی ہمین اُن ڈرامون کے بگڑے ہوے سین کبھی کبھی نظر آجاتے ہین۔ دسہرے مین رام لیلا اور بعض موقعون پر کرشن لیلا دیکھ کے ہم سمجھ جاتے ہین کہ ہندوؤن کو قدیم عہد مین ڈراما کا ضرور شوق تھا۔ بعض مورخین نے تو ڈراما کا موجد ہندوون ہی کو قرار دیا ہے۔ جو بیان کرتے ہین کہ بہت قدیم زمانے مین جبکہ ہندوستان اپنے تمام رسوم کے اعتبار سے وید کی پابندی کرتا تھا اور پورانو کے اجتہاد اور ریفارم نہین ظاہر ہوے تھے اُس عہد مین سادی سادی نقلین جن مین زبان سے کچھ نہین کہا جاتا اور صرف اشارون سے ما فی الضمیر ظاہر کیا جاتا ہے ہندوستان مین مروج تھین۔ اور انھین نقلون سے ڈراما نکلا ہے۔ سنسکرت مین بعض ناٹک موجود ہین لیکن انکی تصنیف یونان کے زمانۂ ترقی کے بعد ہوئی ہے۔ ہندوستان کی اس مقدس زبان مین ڈراما کے متعلق جتنے تصانیف ہیں سب ایک سو برس قبل مسیح سے لیکے آٹھوین صدی عیسوی تک لکھے گئے۔ اس سے پیشتر ہندوستان مین کسی ڈراما کا پتہ نہین لگتا۔ گو اصول ڈراما یا اسباب ظہور ڈراما بہت پہلے پائے گئے ہون۔ سنسکرت ناٹک (ڈراما) کا بہت بڑا باکمال موجد کالی داس شاعر ہے۔ اور یہی پہلا شخص ہے جس نے سنسکرت مین پہلے پہل ڈراما لکھے۔ اُس کا نہایت مشہور ڈراما سکنتلا ناٹک ہے۔ اس مین دربار وغیرہ کے سین نہایت عمدہ دکھائے گئے ہین۔ کالی داس حضرت مسیح سے ۵۷ برس قبل اُجین کے مشہور علم دوست راجہ بکرماجیت کے ممتاز مشیرون مین تھا۔

سنسکرت کے ناٹکون مین مرچھ کٹک (کھلونا گاڑی) بھی قیمتی اور قابل قدر ہے جو دس حصّون پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت کا ایک اور ڈراما ہے۔ نل دمینتی (شاہین گجواری ...) اس ناٹک کی بھی نہایت قدر کی گئی اور زمانے نے اسکو بہت زیادہ شہرت دی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ فارسی کے معجز بیان اور فاضل شاعر فیضی فیاضی نے اس کا ترجمہ نظم فارسی مین اس خوبصورتی اور عمدگی سے اور ایسے شاندار الفاظ مین کیا کہ تمام فارسی مثنویان اُسکے سامنے دب گئین۔

باوجود ان سب قصون کے اس امر کے خیال کر لینے کا نہایت آسان

موقع ہے کہ ہندوؤن نے بھی ناٹک کی بنا ابتداءً مذہبی پیرائے ہی سے کی ہوگی۔ اس لیے کہ رام لیلا اور کرشن لیلا جو ہندوون کے قدیم مذہبی کھیل بلکہ ذرائع عبادت ہین یقیناً انکی بنا کالیداس اور دیگر شعراے سے پہلے پڑی ہے۔ کالی داس اور جن شاعرون نے جو کچھ لکھا ہے اگرچہ اُسکے پلاٹ مصنفون کی ذہانت کے شاہد ہین مگر ماخذ سب کا وہی مذہبی ڈراما ہین جو ہندوون کی عبادت مین داخل تھے۔ اورجن کے ذریعے سے قدیم ناموروں کی زندہ مورتین بناکے ہندمین پرستش کی جاتی تھی رومیون نے بھی ڈراما کو یونانیون سے سیکھ کے اپنی بت پرستی رسوم مین شامل کر لیا تھا اور ایطالیہ مین بھی حضرت مسیح سے پہلے یہ ڈراما بتون کی عبادت کا کام دیتے تھے۔ بہرحال اس مین کوئی شک نہین کہ ڈراما کی ایجاد جہان کہین ہوئی ہو خواہ یورپ مین یا ایشیا مین لیکن اُس کی بانی بت پرست قومین اور اسکی غرض بت پرستی تھی۔

ان قدیم عہد کی ترقی یافتہ قومون اور موجودہ یورپ کے درمیان مین صرف ایک مسلمان تھے۔ جنھون نے پہلی قومون سے اصول ترقی کو حاصل کیا تھا۔ لیکن مسلمانون کے خیالات ہر عصر اور ہر عہد مین دین کے تابع اور پابند رہے۔ نیز اُس وقت جب وہ تلوارین ہاتھ مین لیے فتوحات کا سیلاب بہا رہے تھے۔ اور نیز اُسوقت جب وہ علوم کو اپنی مذہبی زبان مین لا رہے تھے اور ترقی وتہذیب کے دریاؤن کی شناوری مین مشغول تھے۔ اُس حالت مین بھی جب وہ مفلس اور محتاج تھے اور اُس حالت مین بھی جب وہ دولتمند تھے اورعیش وعشرت کے جام اطمینان کے ساتھ نوش کر رہے تھے۔ اُنھون نے کسی وقت اور کسی حالت مین دین کو نہ چھوڑا۔ لہذا یونانیون اور اپنے سے پہلی تمام ترقی یافتہ قومون سے اُنھون نے جو کچھ حاصل کیا وہ وہی تھا جو دین اسلام کے خلاف نہ تھا۔ مصوری اگرچہ ایک عمدہ اور دلچسپ فن تھا انھون نے اُسکو بالکل چھوڑ دیا۔ موسیقی جو بت پرستون کے عبادات مین داخل تھی اور جو بت پرستوں ہی کی تقلید مین اب چرچ آرگن (گرجے کا باجا) اور بھوشون کی تانون کے پیرائے مین نمودار ہوئی ہے اُس کی طرف بھی مسلمانون نے توجہ نہین کی۔ محض اس لیے کہ اُنکے ہادی

برحق نے انھین اس فن سے قطعًا روک دیا تھا۔

بخلاف عیسائیون کے حنفون نے شریعتِ عیسوی کی کبھی قدر نہین کی اور ہمیشہ انکے اعتقادات مین بت پرستون کی رسمین حضرت مسیح کی تعلیمات پر غالب آگئین۔ خود آنحضرت صلعم کے عہد مین عیسائیون نے اپنے کلیساؤن کو بتخانون کی نقل بنا دیا تھا۔ جس طرح منروا کی مورت ایتھنس کے بڑے مندر مین تھی۔ اور جس طرح رادھکاجی کی مورت ہندوؤن کے اکثر دیوہرون مین ہوتی ہے اُسی طرح حضرت مریم کی مورت اُنکے کلیساؤن مین تھی یورپ کے مسیحیون نے ترقی یافتہ غیر قومون کی کوئی لغویات نہ تھی جو نہ حاصل کرلی۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ یونانیون اور رومیون کی دیوبانی جس پر اُنکے کفر اور بت پرستی کی بنا تھی اُسکو بھی مسیحیون نے نہ چھوڑا۔ ایلیڈ اور آڈسی ہومر (جو اصل مین یونانیون کا ویلمیکی ہے) کے تصانیف بھی آج مسیحی دنیا کے قیمتی ہی نہین واجب التعظیم شئے ہین۔ لندن کے بازارون مین جوکی جو یونانیون کا دیوتا ہے آج قسمین کھائی جاتی ہین۔

بیشک مسیحیون اور مسلمانون مین یہ بڑا بین اور قابل غور فرق ہے کہ پہلون کا مسلک ماقال (کیا کہا) تھا اور آخرالذکر فریق کا سلک صرف تقلیدی طور پر من قابل (کس کا قول ہے) رہا۔ خود پیغمبر عرب (بابی انت وامی یارسول اللہ) نے باوجودیکہ مشرکین کے رسوم کے مقابلے مین ہمیشہ اہل کتاب کی رسمون کو ترجیح دی لیکن اہل کتاب کی بھی لغو اور شہرت پسندی کی باتین ہمیشہ چھوڑ دین۔ جوبلی جو یہودیون کی لغو رسم تھی اور جس سے اُن کا بہت بڑا اوچھا پن ظاہر ہوتا تھا اُسکا نام بھی مسلمانون مین مروج نہ تھا مگر یورپ کے مسیحیون مین یہان تک مروج ہوئی کہ خود روم کے بعض پوپون کی جوبلی یورپ کی تاریخ مین موجود ہے۔

جس طرح یہ سب باتین یورپ کے مسیحیون نے لین اُسی طرح ڈراما کو بھی انگلستان کے مسیحیون نے علمی نہین خاص مذہبی حیثیت مین یونانیون اور رومیون سے حاصل کرلیا۔ حالانکہ مسلمانون نے اسکی طرف توجہ بھی نہین کی تھی۔

یورپ کی تاریخ بتا رہی ہے کہ مسٹری یعنی راز کی باتون اور خون ریزی کے واقعات کے تماشے ایڈورڈ (بادشاہ انگلستان) کے عہد سے مدتون تک انگلستان

کے گرجون [illegible] ان پر برابر نظر آیا کرتے تھے - اور اُنکے ذریعے سے عموماً انجیل
کے قصے دکھائے جاتے تھے - اور تسلیم کر لیا گیا تھا کہ مذہبی تاریخ بتانے کا یہ نہایت
[illegible] جس سے صریحاً ثابت ہوگیا کہ ڈراما کو ابتداءً انگلستان کی علمی
سوسائٹی نے نہین بلکہ مذہبی مقدس گروہ نے لیا تھا - انگلستان کے ان پہلے ڈرامون
مین پھر اتنا تغیر ہوا کہ اخلاقی معاملات پر اثر ڈالنے کے لیے آلیگری کا رواج ہوا -
الیگری یہ چیز ہے کہ خاص قوتین جو محسوس چیزین نہین ہین وہ استعارۃً شخص
کرلی جائین اور کوئی ایکٹر اُن کا ہروپ بھرے - مثلاً ایک شخص وفا کے نام سے
نامزد کیا جائے - اور ایک دغا کے نام سے - اور دونون کی رفتار علٰحدہ علٰحدہ
دکھائی جائے - ان الیگری ڈرامون مین پند اور مذاق کی باتین زیادہ ہوتی تھین -
سب سے پہلے اس قسم کا ڈراما آٹھوین ہنری کے عہد مین نکولس یوڈل نے تصنیف
کیا جو آخر مین وسٹ منسٹر اسکول کا ماسٹر تھا - یہ ڈراما کانڈی تھا اور "رالف رسٹر
ڈائسٹر" کے نام سے نامزد تھا - ممدوح ماسٹر صاحب نے یہ ڈراما لکھ کے اپنے
شاگردون کو دیا کہ وہ ہروپ بھر بھر کے اُس کا تماشا دکھائین - جسکے ذریعے سے
لنڈن کے بہادرون اور عام باشندون کا طرز تمدن نظر آسکتا تھا - ملکہ الیزبتھ
کے زمانے مین ڈراما کا ذوق لوگون کے دل مین بڑھ گیا - اور اُسی زمانے مین
تھیٹر کی عمارتین قائم ہوئین - اور اصول ڈراما کی تعلیم کا ایک اسکول بھی تیار
ہوگیا - اس عہد کے تعلیم پائے ہوے لوگون مین سے بعض لوگون نے اصول ڈراما
مین بہت کچھ وقعت اور شہرت حاصل کی مگر آخر شیکسپیر کے آگے جو اسی عہد کا
بلکہ انگریزون کے نزدیک تمام اگلے اور پچھلے عہدون مین ڈراما کا سب سے بڑا
مصنف تھا - سب کی شہرت مٹ گئی - لنڈن کے محلے بنیک سائڈ مین جو ملکہ الیزبتھ
کے عہد کا بہت بڑا تھیٹر مشہور یہ گلوب تھیٹر تھا - اور سنہ ۱۵۹۴ء مین قائم ہوا تھا
اسکے مالکون مین ایک شیکسپیر بھی تھا - شکسپیر نے انگلستان مین ڈراما کو بہت ترقی
دلائی تھی - اور اُسکے بعد سے انگلستان کے اخلاق عموماً تھیٹرون کے ساتھ
وابستہ ہو گئے - لیکن اس سے انگلستان کے اخلاق کو سخت ضرر پہونچا - انگلستان
کی یہ اخلاقی خرابیان ہماری ہی نظر مین نہ تھین بلکہ خود انگلستان نے بعض اوقات

اس کا اعتراف کر لیا۔ چنانچہ کرامول کے عہد میں کامڈی کے ڈراموں کی سخت ممانعت کر دی گئی۔ اس لیے نہیں کہ ان میں ظرافت اور مذاق [illegible] تھا بلکہ مجرد اس وجہ سے کہ انکی وجہ سے اخلاق پر بہت برا اثر پڑ گیا تھا اور سوسائٹی کی حالت نہایت ذلیل اور شرمناک ہو گئی تھی۔

اگرچہ آج اہل انگلستان کو اپنی سوسائٹی کے نہایت اعلیٰ ترقی پر ہونے کا دعوےٰ ہے لیکن دیکھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ وہان کی تہذیب کیسی ہے۔ ڈراما کی دونوں قسمیں وہان آج مروج ہین۔ فی الحال کی کامڈی مین عموماً وہ عشق و شوق کی داستانین ہوتی ہین جن کا نتیجہ حسرت و غم اور مایوسی ہے۔ کامڈی کا یہ اثر صاف ظاہر ہے کہ واقعاتِ عشق و محبت مین جیسی آزادی اور بزرگون کی مخالفت انگلستان کے نوجوان مردون اور عورتون مین ہے ویسی آزادی دنیا کے پردے پر اور کسی ملک مین نہین۔ جو لوگ انگلستان ہو آئے ہین اور نیز وہان کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوشیزہ لڑکیان جس قدر وہان خراب ہو جاتی ہین اُس قدر اور کہین نہین خراب ہوتین۔ زنا جتنا وہان مروج ہے ویسا کہین ڈھونڈھے نہ ملے گا۔ وحشی اور ناتربیت یافتہ بلکہ جنگلی لوگون مین عصمت و عفت ہے اور نہین ہے تو اُس تربیت یافتہ اور مدعی تہذیب قوم مین۔ یہ تو کامڈی کا اثر تھا۔ اب ٹریجڈی کا حال سُنیے۔ خودکشی جو ہر مذہب اور ہر فلسفی کی نظر مین انتہا سے زیادہ نالائقی بزدلی اور بدنام کرنیوالی چیز ہے وہ انگلستان مین دنیا کی اکثر قومون سے زیادہ مروج ہے۔ خودکشی کے جیسے نئے اور عجیب و غریب حادثے انگلستان مین ظاہر ہوے ہین ویسے اور کہین نہین ظاہر ہوے۔ بلکہ اسی مین وہان ہر خود اپنی جان دینے والا ایک نئی جدت دکھا کے دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ یہ ظالم بدذوقی صرف ٹریجڈی سے نمایان ہوئی ہے۔ ٹریجڈی نوجوانون کے دل مین اُس ناموری کی موت کا شوق پیدا کر دیتی ہے جو کسی ناکام اور مایوس عاشق کو نصیب ہوئی تھی اور تھیٹر کے اسٹیج پر نظر آئی۔ یہ فائدے ہین جو انگلستان نے اور اسکے ساتھ یورپ کی دوسری تربیت یافتہ قومون نے تھیٹر سے حاصل کیے۔ اور یہ وہ ناموریان ہین جو مغرب زمین کو ڈراما کی بدولت نصیب ہوئین۔ کیا اسکے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے

کہ ڈراما کوئی عمدہ چیز ہے؟ سچی اور نہایت ہی حق پر ہے شریعت اسلامیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) جو بتاتی ہے کہ تمام اس قسم کی لغو چیزین اور کل بیہودہ کھیل ناجائز اور خدا کو۔ اُس خلاق عالم کو نہایت ناپسند ہین -

افسوس! اور صد ہزار افسوس!! کہ وہی پیغمبر برحق - وہی ہادی مطلق - جسنے ان لغو افعال کو حرام اور ناجائز بتایا - ایک چھچھورا نقال - ایک ذلیل ناچنے والا اُس کی صورت بن کے اسٹیج پر آئے! اُسکی زبان کٹ جائے اگر وہ ایسا دعوے کرے! وہ مقام دھنس جائے جہان اُسکے منحوس قدم آئین!

علاوہ برین اس ڈراما مین صرف اتنی ہی خرابی نہین کہ اُس مین ایک ذلیل شخص پیغمبر عرب کی صورت بن کے اسٹیج پر آئے گا - نہین بلکہ اسکے ساتھ ہمارے پیغمبر محمد صلعم کی توہین بھی کیجائے گی - وہ واقعات دکھائے جائین گے جنکی نہ کوئی اصلیت ہے اور نہ جنکو ذرا بھی محمد رسول اللہ صلعم کی شان سے کوئی مناسبت ہے

ابھی تک صاف صاف نہیں معلوم ہوا کہ اس ڈراما کا اصلی پارٹ کیا ہو مگر ہان جس قدر اشارۃً معلوم ہو سکا اُسکا ماحصل یہ ہے کہ ایک ایکٹر محمد صلعم بن کے آئے گا اور ایک ایکٹرس آن حضرت کی پیاری بی بی جناب عائشہ صدیقہ کا پارٹ کریگی - مصنوعی آن حضرت دعوی کرین گے کہ مین افضل الناس - افضل البشر بلکہ افضل الخلق ہون - عائشہ صدیقہ دعوی کرین گی کہ نہین یہ جوہر خاص جناب مسیح کا ہے - اور فضیلت کا تاج اُنھین کے سر پر ہے - آنحضرت مین اور جناب صدیقہ مین بہت دیر تک بحث ہوگی اور وہ بحث بہت طول کھینچے گی - آنحضرت ہر پہلو سے اپنی فضیلت و فوقیت ثابت کرینگے - اور صدیقہ ہر پہلو سے اس کی تردید کردین گی - آخر وہ فرضی آن حضرت صاحب ہر امر مین عاجز آکر خودکشی کر لیتے ہین اور اس ٹریجڈی کی حیثیت سے یہ ڈراما تمام ہوگا -

یہ مضمون ابھی ناتمام ہے - باقی حصہ دسمبر کے پرچے مین شائع ہوگا - اس وجہ سے یہ مضمون دو نمبرون پر تقسیم کر دیا گیا - پہلا نمبر ہم یہین پر تمام کرتے ہین - دوسرا نمبر ناظرین آیندہ دیکھین گے -

بعض مسیحیوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ "اہل اسلام بزرگان دین کا ڈراما بحیثیت مذہب دکھایا کرتے ہیں"۔ زیادہ ضرورت ہے کہ اس امر پر ہم ذرا تفصیل سے بحث کریں۔ مسلمانوں میں دو بہت بڑے فریق ہیں۔ ایک سُنّی (یعنی پابندان سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) دوسرے شیعہ (یعنی محبان اہلبیت رسالت علیہم السلام) اسلام کی ایک پولیٹکل نزاع نے یہ دونوں گروہ پیدا کیے۔ ان دونوں میں وہ جھگڑا ایک جزئی امر پر مبنی تھا۔ روزافزوں تعصبات کی وجہ سے بڑھتا گیا۔ اور بڑھتے بڑھتے اس درجے کو پہونچا۔ کہ ہزارہا علما تہ تیغ ہوئے۔ ہزارہا مدارس و معابد میں آگ لگی اور صدہا شہر تباہ و برباد ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ اسلام کی موجودہ تباہیوں کا اصلی سبب یہی اختلاف تھا۔ گو کہ اسلام میں اور بھی فرقے ہیں مگر زیادہ صاحب اثر یہی دو فرقے ہیں۔ ایک تیسرا فرقہ اس عہد میں جدید نظر آتا ہے جو وہابی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اصل میں یہ فرقہ جدید نہیں ہے۔ ہر عہد میں ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے اسلام میں سے پیدا ہو جانے والے رسوم کو سرگرمی سے مٹانا چاہا۔ اور کوشش کی کہ اسلام اپنی قدیم اصلی حالت پر پہنچ جائے۔ گذشتہ اسلامی سلطنتوں نے ایسے لوگوں کو کبھی اُبھرنے نہ دیا۔ اور اسی وجہ سے اُن عہود سابقہ میں اس فرقے کے عقائد مخفی خیالات کی حیثیت سے کسی خاص شخص کے سینے میں مخفی رہے۔ جو زیادہ ہم خیال رہنے کی وجہ سے اپنے عقائد کو دل ہی میں چھپاتے رہے۔ اور اگر کسی نے ظاہر بھی کیا تو مخالف پولیٹکل قوتوں کے خوف سے کوئی اور شخص اُس کا ہم خیال نہ ہو سکا۔ انگریزی دَور نے آزادی دی اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ خیالات یک بیک اُبھر پڑے۔ اور اب روزافزوں غلبہ حاصل کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اسلام میں ایک جدید قوی فرقہ پیدا ہو گیا۔

ان تینوں فرقوں میں اہل حدیث لوگ جنھوں نے متعصب دشمنوں کی طرف سے وہابی کا خطاب پایا ہے وہ تو اُن تمام باتوں کے مخالف ہی نہیں دشمن ہیں جو اسلام کے زمانۂ ابتدائی میں نہ پائی گئی ہوں۔ اُن سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ کوئی ایسی کارروائی جائز رکھیں جو ڈراما کی قسم سے ہو، بڑی غلطی ہے۔ باقی رہے عام اہل سنت اور اثنا عشریہ جو عرف عام میں شیعہ کے لفظ سے مشہور ہیں۔ جہاں تک ہماری واقفیت

ہے دونون مین سے کوئی فریق بھی کسی ایسی کارروائی کو جسکے ذریعے سے بزرگان دین کے واقعات کی نقل دکھانا مقصود ہو جائز نہین سمجھتا - ایسے امور کی اجازت سے دونون معتبر و مستند کتابین خالی ہین - اگر کسی کو شک ہو تو دونون مذہبون کے علما سے بذریعۂ استفتا دریافت کر لے -

باقی رہی تعزیہ داری - جو واقعی ایک قسم کا ڈراما ہے اور جسکے موجد سُنّی ہین اور حامی شیعہ خیال کیئے جاتے ہین - اول تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ تعزیہ داری کی ایجاد کیون اور کیونکر ہوئی - سارا زمانہ جانتا ہے کہ پیغمبر آخر الزمان - اُس نبی برحق اُس شفیع المذنبین کے چھوٹے نواسے کو یزید بن معاویہ کی فوج نے اہل کوفہ نے غدر و فریب کے ہجرت کے ساٹھ برس بعد ارض کربلا مین شہید کیا تھا - اس شہادت سے اسلام کو ایک ایسا سخت صدمہ پہونچا جو اُسے ہمیشہ یاد رہے گا - اور جسکو یاد کر کے مسلمان اگر مسلمان ہین تو ہمیشہ روئین گے - یہ غم چاہے کتنا بڑا ہو مگر سچ یہ ہے کہ اُس عہد مین جزو دین اور جزو ایمان نہین خیال کیا گیا تھا - مسلمانون کو اگر صدمہ ہوا تو اسی قدر جتنا کسی قوم کو ایک عہد کے سب سے بڑے نامور اور مقتدا کے مارے جانے کا غم ہو لیکن جو جو زمانہ گذرتا گیا یہ غم زیادہ باعث درد و الم خیال کیا جانے لگا - ایک طرف سُنی یعنی متبعین سنت کے خیالات مین یہ غم ہمیشہ ایسا ہی سمجھا گیا جیسا کہ ابتدا مین خیال کیا گیا تھا - لیکن دوسری طرف یعنی متبعان اہل بیت نے اسکو جزو ایمان تسلیم کر لیا اور آخر الامر اُنکے خیال مین یہ غم عملاً عقائد اسلامیہ پر غالب آگیا -

اہل سنت مین بھی اکثر اوقات ایسے لوگ پیدا ہوے جو تمام عقائد مین تو پورے سُنّی تھے لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم اُنکو معمول سے زیادہ تھا - چنانچہ اسی قسم کے سُنیون مین تیمور لنگ تھا جو ہندوستان کے مغلیہ خاندان کا بانی ہے - اسکو حضرت سید الشہداء علیہ السلام سے نہایت محبت تھی - اُسی محبت نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ ہر وقت غم کے تازہ رکھنے کے لیے اُس نے روضۂ حضرت امام حسین کی ایک نقل بنوا کے رکھ لی جو اسلام مین ایک بالکل نئی مثال تھی - سُنیون نے اُسکو ایک معمولی امر خیال کیا لیکن شیعون نے جو محبت اہل بیت کے سب سے بڑے مدعی ہین اس رسم کو بڑی دلچسپی کے ساتھ اُٹھا لیا - تیمور مر گیا اور اُسکی یہ ایجاد شیعون میں رواج

پائی گئی - جو زیادہ جدتوں کے ساتھ آج تک اسلام کے اس فرقے میں تعزیہ داری کے
نام سے مروج ہے - اور جس کی وجہ سے آج یورپ کے متعصبوں کو اسلام کا ڈراما
بتانے کے لیئے ایک سند ہاتھ لگی -

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ شیعوں کی مذہبی کتابیں اس رسم کی بابت بالکل
ساکت ہیں - اور اسی وجہ سے اُنکے علما بھی اگرچہ خود تعزیہ داری کم کرتے ہیں مگر
اسکے جواز و عدم جواز میں ساکت نظر آتے ہیں - مگر چاہے کچھ ہو اس سے عیسائیوں
کو کسی قسم کے استدلال کا موقع نہیں مل سکتا -

اول تو یہ دیکھنا چاہیے کہ شیعہ تعزیہ داری میں کیا کارروائی کرتے ہیں - وہ
ایک عملدرے کا نقشہ بنا کے سامنے رکھتے ہیں - چونکہ رسول اکرم کے نواسے کی طرف
وہ منسوب ہے لہذا اُسکی تعظیم اور اُس کا ادب کرتے ہیں - اُسکو دیکھ کے ایک اسلامی
سب سے بڑی مصیبت کو یاد کر کے روتے ہیں اور ثواب جنت کے مستحق ہوتے ہیں
وہ کسی کی توہین نہیں کرتے - کسی کے ساتھ تمسخر نہیں کرتے - اور نہ اُس قسم کی کوئی بات
ظاہر کرتے ہیں جسکو ڈراما سے تعلق ہو -

دوسری بہت بڑی بات یہ ہے کہ وہ کسی شخص کی صورت اور تصویر نہیں بناتے
وہ تو ایک عمارت ایک مقبرے یا ایک تربت کی نقل بناتے ہیں - وہ ہرگز پسند نہیں
کرتے کہ اس زمانے کا ایک فاسق و فاجر اُنکے سامنے آکے کھڑا ہو اور معاذ اللہ
یہ زبان سے نکالے کہ "میں امام حسین ہوں" اگر کوئی ایسا کہے تو اُسکو روکنے
اُس کا منہ بند کرنے کے لیے شیعہ اُسی سرگرمی، اُسی طیش، اُسی غصے سے موجود
ہو جائیں گے جس سرگرمی سے اسوقت شیعہ اور سُنی دونوں اُس شخص کو جو محمد صلعم
کا بہروپ بھر کے تھیٹر میں آئے ٹانگ کھینچ کے ذلت سے اسٹیج کے نیچے گرا دینا
چاہتے ہیں -

بیان کیا جاتا ہے کہ کربلا اور ایران میں کربلا کا ڈراما دکھایا جاتا ہے - شاید
ایسا ہو - لیکن ہمارے نزدیک اُن لوگوں پر یہ بہت بڑی تہمت ہے - اگر کسی جاہلیت
کے پُرجوش دور میں دکھایا گیا ہو تو اور بات ہے مگر بحیثیت مذہب اگر آج کوئی شخص شیعہ
مقدس مجتہدین کے سامنے کھڑا ہو کے یہ دعوے کرے کہ میں نے امام حسین علیہ السلام

کا بہروپ بھرا ہے تو شاید اُسکی تکفیر مین کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا جائے گا - اور شیعون کی دنیا مین اُسکو کسی جگہ ٹھہرنے کا موقع نہ ملے گا -

یہ بھی دعوی کیا گیا ہے کہ بعض شیعہ اُن خلفا کی تصویرین بنا کے توہین کرتے ہین جو اُنکے خیال مین غاصب تھے - لیکن ایسا امر سوا عوام شیعہ کے خواص اور مہذب پارٹی کی جانب سے کبھی وقوع مین نہین آیا - جو لوگ ایسے امور کے مرتکب ہوے اور جنھون نے ایسے رسوم کو جائز رکھا وہ شیعون کی سوسائٹی مین کبھی قدر کی نگاہون سے نہین دیکھے گئے - علاوہ برین سب سے زیادہ غور طلب یہ امر ہے کہ جب کبھی جن لوگون نے ایسی کارروائیان کین اُن کا نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ بلوے ہوے - فوجداریان ہوئین - خون کے سیلاب بہے - سُنیون اور شیعون کی طرف سے خونریز مذاق کے لوگ اُٹھے اور اُنھون نے کوئی امر بد انتظامی اور بے امنی کا نہ تھا جو اُٹھا رکھا ہو - ہزارہا عورتون کی بے عزتی ہوئی - صدہا خاندان برباد ہو گئین - بہت سے بچے یتیم - اور بہت سے باپ لاولد ہوے - مدارس مین آگ لگائی گئی مسجدین مسمار کی گئین - کتابین دریا مین غرق ہوئین - قبرین کھود کھود کے لاشین نکال لی گئین اور اُنکی بے عزتی و توہین مین کوئی دقیقہ اُٹھا نہین رکھا گیا - کلیسا کی تاریخ کی طرح مسلمانون کی تاریخ مین قتل و خونریزی اگر پیدا ہوئی تو انھین اسباب کی وجہ سے - اور انھین خیالات کی بنا پر -

تو کیا یہ پسند ہے اور گوارا ہے یا انگریزی دور مین اُن قدیمی تعصبات کا پُرجوش اور پُرخروش سین دیکھنا مقصود ہے جو کوشش کیجاتی ہے کہ تھئیٹر کے اسٹیج پر پیغمبر عرب کی توہین کیجائے اور اسلام کے تمام فرقے آپس مین اتفاق کر کے وہی فساد اور وہی آفت پیدا کر دین جو پہلے آپس مین پیدا کیا کرتے تھے؟ اور کیا گورنمنٹ جو پبلک بدنظمیون کو نفرت کی نگاہ سے نہین دیکھتی ہے بلکہ اُنکے نام سے ڈرتی ہے ایسی کارروائیون کو جائز رکھے گی؟

اس مین کوئی شک نہین کہ قدیم زمانے مین تعصبات بہت بڑھے ہوے تھے - اور اُن دنون ایک مذہب کے تبع دوسرے مذہب کی توہین کے نئے نئے اصول اور طریقے ایجاد کیا کرتے تھے - اُنھون نے جو کچھ کیا اُسکو اُس عہد کی پُرشور دنیا پبلک نے

دلچسپی کے ساتھ قبول کر لیا - علیٰ ہذا القیاس دوسرے مذہب والون نے اُس کا بدلہ لینے کے لیے بھی ویسی ہی کارروائیان کین اور اپنے ہاتھ پاون اور اپنے جوش و خروش سے کام لے کے اپنا کلیجا ٹھنڈا کر لیا - اسکی وجہ یہ تھی کہ زمانۂ سابق کی گورنمنٹون نے دو اصول معین کیے تھے - ایک جو سب سے مقدم تھا وہ یہ کہ غیر بادشاہون کے حملے روکنے کی قوت ترقی کے ساتھ قائم کی جائے - دوسرے یہ کہ سلطنت اپنی مالگذاری رعایا سے وصول کرلے - اسکی طرف بہت کم توجہ کی جاتی تھی کہ رعایا کے حقوق کی حفاظت اور حمایت گورنمنٹ کرے - اور اس سبب سے اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا کہ دو مذہبون مین لڑائی ہوئی اور گورنمنٹ نے اُسکے فرو کرنے کی کوشش نہ کی - دونون طرف کے لوگون نے خوب جی کھول کے اپنے دلون کا بخار نکال لیا - لہذا اُس زمانے مین اگر گورنمنٹ ایسی کارروائیون کو روکتی نہ تھی تو اُن لوگون کو جو اپنی مذہبی توہین کا انتقام لینا چاہتے تھے اپنے اسلحہ اور اپنی قوت سے کام لینے کا بھی پورا موقع دیتی تھی - ہمارے وہ دوست جو اس وقت اس قسم کی باتون کے لئے گذشتہ توہین مذہبی کرنے والی کارروائیون کو بطور حجت پیش کرتے ہین وہ بخوبی سمجھ لین گے کہ اگر گورنمنٹ اُنکو اجازت دیگی اور نبی برحق پیغمبر عرب صلعم کا بہروپ بھرنے کا موقع دیگی تو لازمی طور پر گورنمنٹ کا یہ بھی فرض ہو جائے گا کہ مسلمانون کو بھی انتقام لینے اور اُس منحوس تھیٹر مین آگ لگا دینے کا حق دے - اور اگر حق نہ دے تو شاید مسلمانون کے دل کا جوش اور اپنی توہین مذہبی کا انتقام لینے کا جنون دل مین ایسی اُمس پیدا کرے گا کہ دل بے اختیار ہو جائے گا - اور شاید گورنمنٹ کو اپنا انتظام متعلقۂ امن و امان قائم رکھنے مین کسی قدر دقتین لاحق ہونگی -

بالفرض شیعہ بلکہ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہین کہ تمام مسلمان اپنے مذہبی معاملات کو ڈراما کی حیثیت سے بنا کے دکھایا کرتے ہین لیکن پورے مراتب تعظیم و تکرم کے ساتھ - یہ نہین ہوتا کہ ہم کسی کے مذہبی مقتداؤن کی اپنے ڈراما مین توہین کرتے ہون - ہمارے دوست ہندو نہ رام چندرجی اور سری کرشن جی کے ڈرامے دینی آداب کے ساتھ دکھاتے مین لیکن اُنکے ویسی اسٹیجون پر نہ کوئی موسیٰ آتا ہے نہ کوئی عیسیٰ آتا ہے اور نہ کسی محمد کی صورت نظر آتی ہے اور نہ اُس کی توہین کیجاتی ہے - علیٰ ہذا لقیاس ہمارے

شیعون کے ڈراما مین مظلوم سید الشہدا علیہ السلام کی مصائب کھائے جاتے ہین۔ نہ وہ مریم بتول کو بے عزتی کی وضع مین نکالتے ہین اور نہ کسی اور عیسائی پیشوا کی وضع مین کسی کو لاکے ذلیل کرتے ہین۔ ہمارا ڈراما اپنا دُکھڑا رونے کے لیے ہوتا ہے۔ ہم اورون کی توہین کرنے سے کوئی غرض اور کوئی مطلب نہیں رکھتے۔

جب ہمارے یہ خیالات ہین تو ہم کیونکر دیکھ سکتے ہیں ہنہین۔ کیونکر سُن سکتے ہین کہ کوئی اور بیہودہ شخص ہمارے مذہبی مقتداؤن کی توہین کرے۔ جہان تک ہمارا دسترس ہوگا ہم اُسکو روکین گے۔ اُسکی ناجائز اور بیہودہ اور لغو خواہشون کو بڑی ذلت کے ساتھ خاک میں ملانے پر آمادہ ہونگے اور ہرگز موقع نہ دین گے کہ دنیا بھر مین کوئی شخص ایسے تعصبات کا ظاہر کرنے والا نظر آئے۔

انگلستان کے پولیٹکل تعلقات زیادہ تر مسلمانون ہی کے ساتھ ہین۔ ہندوستان مین مسلمانون کی بہت زیادہ آبادی ہے۔ افغانستان اُسکی حمایت مین اپنے تئین سینہ سپر ثابت کر رہا ہے۔ ایران مین روس کے مقابل مین اپنی پالیسیون کے کامیاب کرنے کی ابھی اُسے بہت ضرورت ہے۔ ترکون سے اسکے تعلقات قدیم سے چلے آتے ہین اور اب تک انگلستان ترکون کا ہمدرد ہے۔ اسکے علاوہ بھی پالیسیون کا ایک بہت بڑا میدان افریقہ ہے۔ جس مین انگلش گورنمنٹ کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اُسے مصر کو اپنے موافق کرنا ہے۔ زنجبار کو اپنا مطیع بنانا ہے۔ اور سب سے بڑی بات جسکی تکمیل مسلمانون ہی کی یاری اور اعانت سے ہوسکتی ہے وہ بردہ فروشی ہے۔ انسداد بردہ فروشی کے لیے انگلستان بڑی بڑی کوششین کر رہا ہے وہ چاہتا ہے کہ یہ ظالم رسم دنیا سے اُٹھ جائے۔ اور سب سے بدتر تجارت انسانی کو دنیا مین زوال ہو۔ اس تجارت کے حامی اسوقت مسلمان ہی ہین۔ اور اسی وجہ سے افریقہ مین اکثر انگلستان کے خلاف جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔ عرَبی پاشا کا جوش، مہدی کی فوج کشیان ان سب کی اصلی بنا انسداد بردہ فروشی تھی۔ انگلستان اپنی دھمکیون سے اور اپنی فوجی قوت دکھا کے تمام بازارہاے بردہ فروشی واقع افریقہ کو بند نہین کرا سکتا۔ ہان اگر وہ بند کرا سکتا ہے تو اسی طرح کہ انگلستان کی انسانیت اُن لوگون کے ذہن مین مرتکز ہو جائے جو بردہ فروشی کے حامی ہیں

اور انکو یقین آجائے کہ انگلستان میں کوئی تعصب اور کسی قسم کی بدنیتی نہین ہے۔ وہی
سب لوگ جواب بڑی مصیبتون سے راضی کیے گئے ہین کہ انگلستان کی صلاح نیک
پر عمل کرین۔ جب یہ سنین گے کہ انگلستان کے دارالسلطنت کے تھیٹر مین ڈراما کے
ذریعے سے محمد صلعم کی توہین کی جاتی ہے تو کیا کہین گے؟ اور خود انگلستان بھی سمجھ
سکتا ہے کہ برٹش پالسی کو کتنا بڑا ضرر پہونچ جائے گا۔

بیشک ملکۂ معظمہ نے نہایت عمدہ کارروائی کی جو اُس ڈراما کو موقوف کرا دیا۔
اور اگر خدانخواستہ ایسا امر وقوع مین آجاتا تو انگلستان کو بارہ کروڑ مسلمانون کی
دل آزاری سے جن مین بیشتر جنگجو خود مختار روالیان ملک سلطان، شاہ، رئیس، او
عوام بھی شامل ہین ایسی صورت مین کہ جب وہ اس ڈراما پر نہایت شد و مد سے
اعتراض کر چکے ہین بہت بڑا پولیٹکل نقصان پہونچتا۔

عنقاء

عربی۔ فارسی۔ اور اُردو لٹریچر مین عنقاء کی بے انتہا شہرت ہے۔ وہ ایک ایسا
طائر ہے جو کبھی دنیا میں نہین دیکھا گیا صرف شعرا کے خیال مین رہتا ہے۔ متقدمین
نے اسکے بہت کچھ حالات بھی لکھے ہین۔ مگر وہ سب عموماً اُن روایتون سے اخذ
کیے گئے ہین جو انسانی تمدن کے بچپن اور میتھالوجی یعنی دیومالا کے زمانے کی ہین۔
فی الحال عنقاء سے عموماً ہر ایسی چیز مراد لی جاتی ہے جو صرف وہم و گمان مین ہو
مگر کبھی ظہور مین نہ آتی ہو۔

ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ کا ابتدائی اور افتتاحی زمانہ اُس کی دیومالا
سمجھا جاتا ہے۔ جس مین عموماً ایسی باتین ہوتی ہین جو بعید از عقل اور انسان کے
بچپن کے خیالات و اوہام کا نمونہ ہوتی ہین۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہر قوم
کی دیومالا مین اِس قسم کا کوئی نہ کوئی جانور بیان کیا گیا ہے۔ ابتداءً اُسے دیوتاؤن
کی ایسی وقعت دی گئی۔ بعد والون نے اُسکے وجود سے انکار تو نہین کیا مگر
اُس کے طرح طرح کے حالات بیان کیے۔ اور کہا اُن مقامات مین رہتا ہے
جہان انسان کا گذر نہین ہوتا۔ لیکن اب جبکہ تحقیق اور خاصۃً علمِ حیوانات کے

ماہرین نے ساری دُنیا چھان ڈالی تو سب کو تسلیم کر لینا پڑا کہ وہ محض ایک خیالی چڑیا ہے جسے خدا نے نہیں بلکہ قدما کے وہم و گمان نے پیدا کیا تھا۔

غور طلب یہ ہے کہ عنقا کا خیال اصل میں عربوں کا ایجاد کیا ہوا ہے یا اسے اُنھوں نے کسی قوم سے اخذ کیا؟ اگر خود لفظ کو دیکھا جائے تو "عنقاء" کا لفظ خالص عربی ہے۔ اور کسی عجمی زبان سے نہیں لیا گیا ہے۔ عربی میں "عنق" گردن کو کہتے ہیں۔ اور حیوٰۃ الحیوان میں دمیری شافعی نے عنقاء کی وجہ تسمیہ دو باتیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ عربوں کے خیال کے مطابق اس عظیم الشان اور خیالی طائر کے گلے میں ایک سفید طوق سا بنا ہوتا ہے۔ اور دوسری یہ کہ اسکی گردن بہت لمبی ہوتی ہے۔ غرض انھیں دونوں میں سے کسی خیال کی بنیاد پر اس کا نام "عنقاء" قرار دیا گیا۔

لیکن یہ صرف نام کی بنا پر ہے۔ ورنہ یہ خیال اور اس قسم کا کوئی نہ کوئی طائر ہر قوم کی دیو مالا میں موجود ہے۔ قدیم مصریوں نے اس قسم کے ایک خیالی طائر کی تصویریں اپنی عمارتوں پر بنائیں اور اُس کی بڑی بڑی عظیم الشان مورتیں تراشی تھیں۔ جس کا سر کہیں آدمی کا سا کہیں مینڈھے کا سا اور کہیں عقاب کا بنایا تھا دھڑ شیر کا اور اُس میں عقاب کے ایسے دست و بازو لگائے تھے۔

اسی طرح نسروس نام ایک طائر کی صورت اہل بابل کی دیو مالا میں تھی جسے وہ اپنا ایک زبردست دیوتا خیال کرتے تھے۔ اُنکے مذاق میں نسروس کا دھڑ آدمی کا تھا۔ اور چونچ اور پر عقاب کے ایسے تھے۔ یونانیوں اور رومیوں کے عقائد میں بھی اسی قسم کا مجمع الاضداد طائر موجود تھا جسے وہ گرِفون کہتے تھے۔ اُس کا دھڑ شیر کا اور چونچ اور بازو عقاب کے تھے۔ ہندوؤں کے اعتقاد میں بھی اسی قسم کا ایک زبردست طائر موجود ہے جسے وہ گرُڑ کہتے ہیں۔ اُن کی دیومالا میں اگرچہ اس طائر کے متعلق چوپایوں یا انسان کا دھڑ تو نہیں تجویز کیا گیا۔ مگر صرف عظمت و قوت کے لحاظ سے اُسے بہت کچھ ترقی دی گئی۔ بتایا گیا کہ سری کرشن جی مع تمام خاندان کے اُس پر سوار ہو کے سیر کرتے تھے۔ اور مہابھارت کے نامور سورما اُسی پر سوار ہو کے میدان رزم میں آئے تھے۔ اسکے ساتھ اُس کا یہ بھی روحانی

کمال بتایا گیا کہ اُڑتے وقت اُس کے پروں سے مقدس وید کے اشلوک سُنے جاتے ہیں۔ ایرانیوں میں بھی سیمرغ موجود تھا جس نے رستم کے باپ زال کی پرورش کی تھی اور وقتاً فوقتاً رستم کی مدد کو آیا کرتا تھا۔

اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہے کہ عربوں میں اس وہمی طائر کا خیال کس قوم سے آیا۔ ظہور اسلام سے پیشتر اُن کا تمدن تین قوموں کے خیالات کا مجموعہ تھا۔ اول عرب عاربہ جو آل قحطان کہلاتے تھے اور جن کا اصلی وطن ملک یمن تھا۔ اور دراصل یہی لوگ اصلی عرب تھے۔ دوسرے یہود جو حضرت اسماعیلؑ کے زمانے ہی سے یہاں آنا شروع ہو گئے۔ جن سے اور قحطانیوں کے امتزاج سے ایک نئی نسل پیدا ہوئی جو عرب مستعربہ کے نام سے مشہور تھی۔ اور اس گروہ کے قائم ہو جانے کے بعد بھی موسوی آداب و تمدن کا بہت کچھ اثر عربوں پر پڑا ہوا تھا اور تیسرے ایرانی جو قدیم الایام سے اہل عرب کے ساتھ تعلقات رکھتے آئے تھے اور جن سے پیشتر اُنھیں کے ملک یمن سے صابئین جو حقیقۃً قدیم بابلی مذہب کے پیرو تھے سارے عرب میں پھیل چکے تھے۔ ایرانیوں اور صابئین میں کسی ایسے طائر کا خیال موجود ہونا خود اُن کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے۔ یہود کے مسلمات میں بھی کوئی نہ کوئی ایسا طائر ضرور موجود ہوگا۔ اس لیے کہ گو اُن کی کتابوں میں ڈھونڈھنے کی ہمیں نوبت نہیں آئی مگر عربی کہانیاں جو اسرائیلی روایتوں سے ماخوذ ہیں اس کی شہادت دے رہی ہیں۔ باقی رہے اصلی عرب اور قحطانی اُن کے زمانے کی کوئی کتاب یا تحریر موجود نہیں ہے۔ مگر زیادہ تر قیاس اسی طرف جاتا ہے کہ عربوں میں عنقاء کا خیال اُنھیں لوگوں سے شروع ہوا۔ اس لیے کہ عنقاء کے جتنے خالص عربی قصے کتب عربیہ میں نقل کیے گئے ہیں سب ملک یمن اور صنعاء ہی سے علاقہ رکھتے ہیں۔

اتنی تاریخی تنقید کے بعد اب ہمیں بتانا چاہیے کہ اہل عرب کے نزدیک عنقاء کیا چیز ہے؟ اُس کی صورت کیسی ہے؟ اور وہ کب اور کہاں پایا گیا؟ ربیع الابرار سے صاحب حیوٰۃ الحیوان نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے جو یقیناً بنی اسرائیل کی روایتوں اور کہانیوں سے ماخوذ ہے کہ ”اللہ جل شانہ نے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک چڑیا پیدا کی جس کا نام عنقا تھا۔ اسکے
جسم میں چاروں طرف چار بازو تھے۔ چہرہ آدمی کا سا تھا۔ اور خدا نے اُسے
ہر چیز میں سے کچھ نہ کچھ ضرور عطا فرمایا تھا۔ اور اُسکے لیے اُسی کا سا ایک نر بھی
پیدا کیا۔ پھر جناب موسیٰ پر وحی نازل کی کہ میں نے دو عجیب و غریب چڑیاں پیدا کی
ہیں اور اُن کا رزق اُن وحشی جانوروں کو قرار دیا ہے جو بیت المقدس کے گرد
رہتے ہیں۔ اسکے بعد اُن کی نسل بڑھنا شروع ہوئی۔ مگر جب حضرت موسیٰ کا
انتقال ہو گیا تو یہ طیور ارض فلسطین چھوڑ کے نجد میں چلے آئے۔ جہاں وحشی درندوں
کو کھاتے اور بچوں کو اُٹھالے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت رب العزت نے بنی
عبس میں سے خالد بن سنان عبسی کو پیغمبر بنا کے مبعوث کیا۔ لوگوں نے اُن کی
خدمت میں حاضر ہو کے فریاد کی تو اُنھوں نے درگاہ خداوندی میں دعا کی۔ جس کا
یہ اثر ہوا کہ اس جانور کی نسل ہی فنا ہو گئی۔"

یہ تو وہ روایت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عنقاء کا خیال اہل عرب میں بنی
اسرائیل سے آیا۔ مگر دوسری روایتیں جن سے اس طائر کا وجود عرب عاربہ اور
بنی قحطان میں میں ثابت ہوتا ہے۔ عربوں میں زیادہ مشہور ہیں۔ اور اُن روایتوں
کے ذریعے سے قوم رس کے زمانے میں اِس طائر کا ظاہر ہونا بتایا جاتا ہے۔ سہیلی
نے لکھا ہے کہ قوم رس کا مرکز شہر عدن تھا۔ اور جو قوم وہاں آباد تھی وہ قوم ثمود
کی باقیماندہ یادگاروں میں تھی۔ انھیں لوگوں کے زمانے میں عدن والوں کے
لیے پانی کے وہ قابل حیرت عظیم الشان حوض اور کنویں بنائے گئے جو آج تک
موجود ہیں اور جن میں بارش کا پانی پہاڑوں سے اُتر کے جمع ہوتا اور برس بھر
تک اہل شہر اور دیگر مخلوق کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اِسی سرزمین میں اور اسی مذکورہ
قوم کے زمانے میں علامۂ عکبری طائر عنقاء کا ظہور بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اُنکے
علاقے میں ایک پہاڑ تھا جو دمخ کہلاتا تھا اور اُس کی چوٹی زمین سے ایک میل اونچی
تھی (غالباً اس سے وہ مقام مراد ہے جہاں آج کل شہر مخا آباد ہے) اس پہاڑ پر
انواع و اقسام کے طیور رہا کرتے تھے جن میں عنقاء بھی تھا۔ یہ بہت بڑا قوی ہیکل
طائر تھا جس کا چہرہ آدمی کا ایسا تھا۔ اور دنیا میں جتنے جاندار ہیں اُن سب کی

اُس مین کوئی نہ کوئی چیز ضرور موجود تھی - باوجود اس عظمت کے یہ نہایت خوبصورت چڑیا تھی - اور اس پہاڑی پر ہر سال مین ایک مرتبہ آیا کرتی تھی - اور اسکے تمام طیور کا شکار کر لیا کرتی تھی - ایک سال یہ اتفاق پیش آیا کہ پہاڑ کی چڑیان اُسکے لیے کافی نہ ہوئین اور بھوک نے ستایا تو انسانون کی طرف متوجہ ہوئی - پہلے ایک لڑکے کو جھپٹ لے گئی - پھر ایک لڑکی کو اُٹھالے گئی - ان دنون حضرت حنظلہ بن صفوان علیہ السلام موجود تھے جو قوم رس پر مبعوث ہوے تھے - لوگون نے اُن کی خدمت مین جا کے شکایت کی - حنظلہ نے بارگاہِ خداوندی مین دعا کی - جس کی مقبولیت یون ظاہر ہوئی کہ عنقا پر بجلی گری اور وہ جل بھُن کے خاک ہو گئی -

اسی مضمون کو تھوڑے اختلاف کے ساتھ علامہ قزوینی نے عجائب المخلوقات مین بھی بیان کیا ہے - وہ لکھتے ہین کہ "عنقا سب سے بڑا طائر ہے - ہاتھی کو اس طرح اپنے پنجے مین اُٹھالے جاتا ہے جس طرح کہ چیل چوہے کو اُٹھالے جاتی ہے - اگلے دنون یہ چڑیا آدمیون مین رہتی تھی جنھین اُس سے اذیت پہونچنے لگی - یہان تک کہ ایک دن وہ ایک دولھن کو جبکہ وہ زیور سے آراستہ و پیراستہ بیٹھی ہوئی تھی اُٹھا لے گئی - یہ حالت دیکھ کے حضرت حنظلہ نبی نے بارگاہ الٰہی مین دعا کی - اور خدا نے اُسے وہان سے اُڑا کے بحر اعظم کے کسی جزیرے مین پہونچا دیا جو خط استوا کے اُس پار ہے آدمیون کا وہان تک گذر نہین ہوتا - اور بڑے بڑے وحشی جانور اور درندے وہان کثرت سے ہین جن کو شکار کر کے وہ اپنی زندگی بسر کرتی ہے عنقا جس وقت اُڑتا ہے اسکے پرون سے گرج اور پانی کے دھڑدھڑا کے گرنے کی سی آواز نکلتی ہے - اُسکی عمر دو ہزار برس کی ہوتی ہے - اور پانچ سو برس کا پٹھا بالغ ہوتا اور انڈے دیتا ہے - اور انڈا دینے کے وقت اُسے نہایت سخت تکلیف ہوتی ہے - عرب لوگ عنقا کو عنقاء مغرب کہتے ہین - جسکی وجہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکے خیال مین اس کا اصلی وطن سرزمین مغرب ہے -

یونانیون مین ہم بیان کر آئے ہین کہ اس قسم کا ایک طائر مشہور ہے جو گرفون کہلاتا ہے - غالباً اُسی کا حال ارسطو نے اپنی ایک کتاب مین بیان کیا ہے جس سے عرض مصنفین کو اپنے خیال کی تصدیق ہو گئی - اور اُن واقعات کو اُنھون نے عنقا

کے تذکرے میں نقل کر لیا۔ ارسطو طالیس نے سب سے بڑھ کے یہ کمال کیا ہے کہ کہتا ہے "اس طائر کا شکار بھی کیا جاتا ہے۔ اور اُسکے پنجوں سے پانی پینے کے نہایت نفیس اور بڑے بڑے کا سے بنائے جاتے ہیں۔" پھر خود ہی اُس کے شکار کی یہ تدبیر بتاتا ہے کہ "لوگ دو بیل لاکے کھڑے کرتے ہیں اور اُن کے درمیان میں ایک بڑا بھاری تھیلا رکھتے ہیں جو دونوں جانب اُن میں باندھ دیا جاتا ہے اور اُسکے اندر بہت بڑے بڑے وزنی پتھر بھر دیے جاتے ہیں۔ جن کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے اور اُس تھیلے کے سامنے ایک کوٹھری بنائی جاتی ہے جس میں کوئی آدمی چھپ کے بیٹھ رہتا ہے۔ اور وہ اپنے پاس آگ تیار رکھتا ہے۔ عنقا اوپر سے گرتا ہے کہ اُن بیلوں کو جھپٹا مار کے اُڑا لے جائے۔ مگر وہ بیل اُن پتھروں کی وجہ سے نہیں اُٹھ سکتے۔ اور اُسکے پنجے اُن کے جسم میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی آدمی کوٹھری سے آگ لیے ہوئے نکلتا ہے اور اُسکے پروں میں آگ لگا دیتا ہے۔" ارسطو اس جانور کا حلیہ یہ بتاتا ہے کہ "اُس کا پیٹ بیل کے مثل ہوتا ہے اور ہڈیاں درندوں کی ایسی ہوتی ہیں۔"

ارسطو نے تو اس کے شکار ہی کی تدبیر بتائی تھی۔ مسلمان مصنفین میں سے بعض بزرگوں نے اُسے دیکھا بھی تھا۔ چنانچہ علامۂ ابن خلکان کہتے ہیں احمد بن عبد اللہ بن احمد فرغانی نے (جو ارض مصر میں آکے اقامت گزین ہو گئے تھے) اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ "خلفائے بنی فاطمۂ مصر کے خاندان والوں میں سے عزیز بن نزار بن معز نے اپنے یہاں طرح طرح کے زندہ جانوروں کا ایک عجائب خانہ قائم کیا تھا۔ جس میں ایسے ایسے عجیب جانور لاکے جمع کیے گئے تھے جیسے کہ شاید اُس سے پیشتر کبھی نہ جمع کیے گئے ہوں گے۔ انھیں میں عنقا بھی تھا۔ جو بلندی مصر کے علاقوں سے لایا گیا تھا۔"

عربوں میں اسی حیثیت و شان کا ایک جانور رُخ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ جس کا الف لیلہ میں ذکر آیا ہے۔ اور شاید وہ الف لیلہ ہی کی ایسی کہانیاں تھیں جن سے اخذ کر کے اُسکے حالات عجائب المخلوقات اور حیوٰۃ الحیوان میں درج کر دیے گئے ہیں۔ مگر اب عنقا، سیمرغ، اور رُخ، ان تینوں ناموں کا مفہوم ایک

ہی خیال کیا جاتا ہے جو گولر کے پھول یا کسی ایسی چیز کے مترادف ہے جسکا وجود صرف خیالات مین ہو۔ اور ظاہری و مادی دنیا مین اُس کا کبھی پایا جاتا نہ ثابت ہوتا ہو۔

تخلیق عالم اور نیچرل ہسٹری کے موجودہ محققین کی راے اب یہ قائم ہوتی جاتی ہے کہ انسان کی پیدایش سے پیشتر اور اُس کے ابتدائی دور مین کرۂ زمین ایسے ایسے عظیم الشان، عجیب و غریب اور خوفناک پرندون، چوپایون اور چھپکلی کے ایسے جانورون سے بھرا ہوا تھا جن کی نسلین باہمی لڑائیون اور خلقت کی کشمکش سے فنا ہوگئین۔ اُن مین سے بعض کی ہڈیون کے ڈھانچے بھی برفستانی مقامات مین پڑے مل گئے جو دُنیا کے بڑے عجائب خانون مین لا کے رکھے گئے ہین۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی کوئی چڑیا اُس زمانے مین اور نوع انسانی کے بچپن مین موجود ہو۔ جس مین وہ پوری شان پائی جاتی ہو جو عنقا یا رُخ یا سیمرغ کی بتائی گئی ہے۔ فی الحال انسان نے زمین کے ہر ہر کونے کو چھان ڈالا اور ایسے کسی طائر کا پتہ نہین لگا۔ لہذا تجربہ اور مشاہدہ ہمین یہی کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ عنقا خارج مین نہین بلکہ صرف ہمارے ذہن اور ہمارے خیال مین ہے۔

گریک فائر یا نفطہ

جن دنون لڑائی کے میدانون مین توپون اور بندوقون کی آوازین نہین گونجتی تھین۔ اور جان باز سپہگرون کو بارود کا استعمال نہین معلوم تھا۔ شمشیر و خنجر اور نیزون اور تیرون سے دشمن پر حملہ کیا جاتا تھا۔ اور گُرز و تبر کے ذریعے سے بہادر سورما اور سرکف نبرد آزما جوش شجاعت ظاہر کیا کرتے تھے اُن دنون یکایک آتش باری کی ایک نئی اور نہایت ہی خوفناک ترکیب ظاہر ہوئی۔ اور لوگ گھبرا اُٹھے۔ اس آگ کا نام یورپ والون مین "گریک فائر" یا آتش یونان مشہور ہوا۔ اور عربون مین "نفطہ" یا روغن نفط"۔

اس بارۂ خاص مین یونان سے مراد پُرانا یونان نہین ہے جبکہ اُنکے ابتدائی تمدن اور اُنکے فلسفہ و حکمت کا عروج تھا۔ اور اُن مین لیکرغوس و سولن کے سے

محققین - افلاطون اور ارسطو کے ایسے فلسفی اور فیلقوس و اسکندر کے ایسے بادشاہ
پیدا ہو رہے تھے - نہین بلکہ یہ اُس یونان کا ذکر ہے جب قسطنطنیہ مین مشرقی سلطنت
روم کے بعد یونانی مشرقی سلطنت قائم تھی جو کلیسائے یونان کی حامی اور کلیسائے
روم کی دشمن تھی - جبکہ پوپ کو ان یونانی سلاطین سے عداوت تھی - اور یونانی پوپ
کی عظمت و حرمت کو نہ مانتے تھے - غرض ان دونون اور ظہور اسلام کے بعد قسطنطنیہ
مین پہلے پہل اس کا رواج مورخین یورپ کو نظر آیا - خود یونان والے اس آگ
کو آتش یونان نہین کہتے تھے بلکہ وہ ایسے الفاظ سے یاد کرتے تھے جن کا ترجمہ
ہے "آتش سیال" اور "آتش بحری" مگر مورخین یورپ نے اسے "آتش یونان" کہنا
شروع کیا - اس لیے کہ یورپ کو اس کا پتہ پہلے پہل قسطنطنیہ کی مشرقی سلطنت
ہی مین لگا - پھر اسکے بعد صلیبی لڑائیون کے موقع پر جب یورپ کی تمام قومین
لڑائی اور جہاد کے لیے شام - ارض فلسطین اور مصر مین آئین تو اُنھون نے
ان ممالک کے قابض مسلمانون کو اس آگ کے برسانے مین نہایت ہی باکمال
اور مشاق پایا -

نفطہ کا استعمال خشکی کی لڑائیون اور نیز بحری معرکہ آرائیون مین یکسان
طریقے پر کیا جاتا تھا - اور اسکے استعمال کے طریقے یہ تھے کہ قلعون اور شہرون
کی فصیل پر سے تانبے اور سیسے کی پچکاریون مین بھر کے پھینکتے تھے یا لوہے اور
پتھر کی دیگچیان بھر بھر کے دشمن کی طرف پھینکتے تھے - جہازون مین عموماً تانبے
کی پچکاریون کا رواج تھا - جو چارون طرف لگا دی جاتی تھین - اور اُنکے دہانے
دشمن پر ہیبت ڈھلانے کے لیے اژدھون، مگرمچھون، شیرون اور دیگر مہیب
جانورون کے ایسے بنے ہوئے ہوتے تھے - چند روز بعد اِس مین یہ ترقی کی گئی
کہ یہ آگ بن جانے والا رقیق روغن لاکھ یا موم ملا کے موم سا بنا لیا جاتا - اور حملے
کے وقت تیرون اور برچھیون کے پھلون مین چپکا دیا جاتا - پھر جب تیر پھینکے جاتے
اور نیزے گھما کے مارے جاتے تو حرکت کی گرمی اور ہوا کے اثر سے فوراً مشتعل ہو
جاتے اور کسی کے بدن مین چھو بھی جاتے تو جلا کے خاک کر دیتے
ہوا مین پھینکنے سے اسے جو حرکت خط قوسی کی وضع پر ہوتی وہی اس کے

مشتعل کر دینے کے لیے کافی تھی۔ ہوا مین چڑھتے ہی بڑے زور سے پھٹنے کی ایک آواز بلند ہوتی۔ سخت غلیظ دھوان نمودار ہوتا۔ اور ساتھ ہی شعلہ پیدا ہو جاتا۔

ژوان ویل مورخ جو فرانس کے بادشاہ لوئی نہم کے ساتھ صلیبی جہاد کے لیے ارض مقدس مین آیا تھا اُسکے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبیون پر سب سے بڑی آفت یہی نفطہ تھا۔ جس سے وہ بالکل آشنا نہ تھے۔ وہ لکھتا ہے "یہ آگ رات کو برسائی جاتی تو سارا کیمپ روشن ہو جاتا۔ لوگ گھبرا گھبرا کے اوندھے منہ گر پڑتے۔ آستینون سے منہ چھپا لیتے۔ یعنی اس ہولناک منظر کے دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکتی۔ اور دعا کرتے کہ خدایا بچا۔ ہوا مین اس وضع و شان سے اُڑتی دکھائی دیتی کہ معلوم ہوتا جیسے کوئی پردار اور لمبی دُم کا آتشین اژدہا اُڑتا چلا آتا ہے۔ رعد کی کڑک اور بجلی کی چمک دونون چیزین اُس مین موجود ہوتین۔ اور اندھیری رات مین ایک ہیبت ناک روشنی عالم پر چھا جاتی۔

فرانسیسی مورخ جوزف فرانسوا مشو اپنی تاریخ صلیبی مین لکھتے ہین "صلیبیون کو اس مہیب آگ کی صورت پہلے پہل نظر آئی تو نائٹ لوگ بد حواسی کے ساتھ دوڑ کے اپنے چوبی برجون کو بچانے مین۔ بعض نے اپنے مددگارون کو پکارنا شروع کیا۔ دوسرے لوگ زمین پر گر پڑے یا گھٹنون پر جھک کے درگاہ الٰہی مین التجا ئین کرنے لگے۔ خود لوئی نہم بھی اپنے اُمرا اور نائٹون سے کم مرعوب و ہیبت زدہ نہ تھا۔ اور جیسے ہی اُس نے گریک فائر کے پھٹنے کی گرج سُنی آنکھون سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور چلا اُٹھا "خداوندا! اے عیسیٰ مسیح! مجھے اور میرے ساتھیون کو بچا!"

مسٹر گبن کے بیان کے مطابق اُسی زمانے کا ایک نائٹ جو مسلمانون کی سپہگری کا نہین قائل تھا اور اُنکے اسلحہ کی نہایت توہین و تحقیر کیا کرتا تھا مگر آتش یونان کی نسبت نہایت سادگی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ "جن منجنیقون سے نفطہ کی پچکاریان ماری جاتی تھین اُنکی صورت دیکھ کے یا اُن کی آواز سُن کے میرا اور میرے تمام ساتھیون کا دل دہل جایا کرتا تھا"

مگر یونانیون کی مشرقی سلطنت قسطنطنیہ مین اس کا رواج اس سے بہت پیشتر تھا۔ اس لیے کہ گبن اور دیگر مورخین بیان کرتے ہین کہ قسطنطنیہ پر عربون نے جو

ابتدائی دو حملے جناب معاویہ اور ولید بن عبد الملک کے عہد میں کیے تھے اُن میں اسی آتش یونان کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ اور مشرقی قیاصرہ کے زمانے میں اُنھیں حوصلہ شکن ناکامیاں ہوئی تھیں۔ لہذا یورپ کے مورخین مسرت ظاہر کرتے ہیں کہ مسیحیوں کی اُنھیں دو فتحوں کی بدولت یورپ عربوں کی اطاعت سے محفوظ رہ گیا۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ عربوں کو مغلوب کرنا یا انکی رفتار ترقی کو روک دینا اُس زمانے میں اتنی بڑی حیرت انگیز اور خلاف اُمید کامیابی تھی کہ سارے فرنگستان اور کل مغربی ممالک یورپ میں قسطنطنیہ کی مشرقی سلطنت کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور سب اُس سے ڈرنے اور کانپنے لگے۔ جس رعب کا اصلی اور قوی باعث یہی آتش یونان تھی۔

چونکہ قسطنطنیہ کی عظمت کا سارا دار و مدار اسی پر قرار پا گیا تھا لہذا اس کے نسخے اور اسکے استعمال کی ترکیب کو وہ لوگ ایک نہایت ہی مخفی راز سلطنت کی طرح چھپاتے تھے۔ قرب و جوار کی دوست اور معاہد سلطنتوں کو ضرورت کے اوقات میں بڑی بڑی منجنیقیں، فوجیں، اور بہت سے جہاز عاریۃً دیدیے جاتے تھے مگر یہ ممکن نہ تھا کہ گریک فائر کی پچکاریاں یا اس کا سامان کسی قریب سے قریب دوست کو بھی عاریت دیا جائے۔ اس رازداری پر مذہب نے اپنا رنگ جمایا۔ اور مقتدایان دین سے روایتیں تصنیف کر لیں۔ چنانچہ خود سلطنت مشرقی یہ ظاہر کرتی تھی کہ "گریک فائر کا راز ایک فرشتے کے ذریعے سے خاص قسطنطین اعظم کو بتایا گیا تھا۔ اور بتانے سے پہلے اُس سے شرط کرائی گئی تھی کہ اس برکت ربانی اور رحمت خداوندی سے کوئی اور شخص عام اس سے کہ دوست ہو یا دشمن ہرگز نہ مطلع کیا جائے"۔ نتیجہ یہ تھا کہ بادشاہ اور رعایا سب کے سب مذہبی احکام کے ذریعے سے مجبور کیے گئے تھے کہ اس بارۂ خاص میں اپنی زبان کو ہمیشہ کے لیے بند رکھیں۔ اور اگر کوئی اس حکم سے انحراف کرتا تو اُسکے لیے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی سخت سزائیں تجویز کی گئی تھیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کے یہ اندیشہ دلایا جاتا تھا کہ اگر کوئی شخص اس جُرم کے ارتکاب کا ارادہ بھی کرے گا تو ملک و قوم پر خدا کا غضب نازل ہو جائے گا۔ الغرض رازداری

کی ان تاکیدون کا یہ اثر تھا کہ کچھ اوپر چار سو برس تک یہ راز قسطنطنیہ والون ہی مین محفوظ اور قسطنطنیہ کی چار دیواری کے اندر محدود رہا۔

اس کا نسخہ اگرچہ مکمل طور پر نہین بتایا گیا ہے مگر انسائیکلوپیڈیا اور نیز گبن کی تحریرون کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کا جزو کامل تو ہی روغنِ نفط ہے جسے ہم مٹی کا تیل کہتے ہین اور جو آب ہمارے گھرون مین اور ہمارے لیمپون مین کثرت سے جلا کرتا ہے۔ اس مین کچھ حصہ گندھک کا ملایا جاتا تھا۔ صنوبر کا گوند بھی پڑتا تھا۔ اور غالباً کچھ اور اجزا بھی ہون۔

یورپ والون کا عام خیال ہے کہ اس کا نسخہ سب کے پہلے گیارہوین صدی عیسوی کے آخر مین شہر پیسا والون نے جو اُن دنون سب سے بڑے جہاز ران خیال کیے جاتے تھے یونان والون سے چُرا کے حاصل کر لیا۔ اور اسی کے قریب زمانے مین مسلمانون نے بھی خواہ چُرا کے معلوم کیا یا خود ہی ایجاد کر لیا۔ اور صلیبی لڑائیون مین اسے اس کمال کے ساتھ کام مین لانے لگے کہ جس حربے سے معاویہ اور ولید کے زمانون مین اُنھون نے قسطنطنیہ کی دیوارون کے نیچے شکست کھائی تھی اُسی حربے سے حملہ آور صلیبیون کو پسپا کیا

مگر غور کرنے اور تحقیق و تنقید سے کام لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے مین محقق مورخان مغرب سے سخت غلطی ہوگئی ہے۔ اول تو انسائیکلوپیڈیا کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ "گریک فائر کا استعمال زیادہ قدیم زمانون مین بھی پایا جاتا ہے۔ برٹش میوزیم مین اسیریا والون کی جو یادگارین موجود ہین اُن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ بھی اس کا استعمال جانتے تھے"۔ کتاب "لیٹن کنگڈم آف جروسلیم" کے مصنف مسٹر کانڈر بھی لکھتے ہین کہ "آتش باری کی یہ ترکیب وسط ایشیا کے ملکون اور یونانیون کو مدت ہاے دراز سے معلوم تھی"۔

لیکن اس مین شک نہین کہ قدیم الایام والون کی اس سخت آتش باری کے مفصل و مشرح حالات بالکل ہمین نہین معلوم ہو سکتے اور نہ ہمین یہ متیقن ہو سکتا ہے کہ وہ اسی نفطے کے ذریعے سے آتش باری کرتے تھے یا کسی اور طریقے سے۔ قرون وسطیٰ اور تحقیق و تنقید کے زمانے مین یورپ والے اسے قسطنطنیہ ہی کے محاصرون مین

بتاتے ہین -

غور طلب یہ امر ہے کہ یونانیون کو اس کا نسخہ کیونکر معلوم ہوا - آیا اُنھون نے اسے ایجاد کیا یا کسی اور شخص سے حاصل کیا؟ اس سوال کا جواب مسٹر گبن سے یہ ملتا ہے کہ کالی نیکوس نام ایک شامی نژاد شخص جو شہر بعلبک کا رہنے والا اور مسیحی المذہب تھا خلیفۂ اسلام کی ملازمت چھوڑ کے قسطنطینیہ چلا گیا - اور شہنشاہِ یونان کی ملازمت اختیار کر لی - اُس شخص سے پہلے پہل یونانیون کو یہ نسخہ ہاتھ لگا - جس نے یا تو خود ایجاد کیا تھا، یا کسی اور سے سیکھا - یہ خیال غالبًا غلط ہے - کالی نیکوس کو عرب لوگ لوقا بن قسطا کے نام سے یاد کرتے ہین جو سلیمان بن عبدالملک کے عہد مین قلمرو اسلام سے ناراض ہو کے چلا گیا تھا -

میسو مشو نے اپنی تاریخ کے ضمیمہ جات مین سوانحعمری سلطان صلاح الدین مصنفہ "رینو دو" کے ایک قلمی نسخے سے نفطے کے حال مین کچھ کیفیت نقل کی ہے - اُس مین بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ پُرانے یونانیون مین ایک ایسی ہی چیز موجود تھی مگر اسکو اس آخر وقت کی آتش یونان سے کوئی علاقہ نہین - جو قسطنطنیہ مین عربون کے محاصرے کے وقت ظاہر ہوئی - مسیحی لوگ صرف اس بنیاد پر اسے آتش یونان کہنے لگے کہ تاثیر اور کیفیت مین دونون ملتی جلتی تھین - اس مین کالی نیکوس کا صرف اتنا حال بتایا گیا ہے کہ قسطنطین پوگوناٹوس کے عہد مین اُس نے اسکے استعمال کی کلین اور منجنیقین تیار کرائین - اور تانبے کی پچکاریان بنائین - جن کے ذریعے سے یہ دشمنون پر پھینکی جا سکتی تھی - اسکے بعد وہ اُسی مین لکھتا ہے کہ ابن المجاس نام ایک شخص نے (جو بالکل مسلمانون کا سا نام ہے) اسے بالکل نئی صورت سے ایجاد کیا - افسوس کہ ہم کو عربی اور انگریزی دونون زبانون کی کتابون سے پتہ نہین لگ سکا کہ یہ ابن المجاس کون شخص ہے - مگر مسیو رینو دو نے جس طرح ابن المجاس کا نام بتایا ہے اُسی طرح یہ بھی نئی بات کہی ہے کہ "اس کے نام کے متعلق مختلف قومون کو سخت دھوکا ہوا - یعنی یونان والے تو اسے مسلمانون کی آگ کہتے تھے - لاطینی مسیحی اسے یونانیون کی آگ کہتے تھے - اور اہل مشرق نفطہ کہتے تھے" -

ابن المجاس کا پتہ لگانے سے تو ہم عاجز ہین - مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ کالی نیکوس

کون شخص تھا اور کس عہد مین تھا۔ بیٹن کی بیاگریفیکل ڈکشنری مین اسکا صرف اتنا حال لکھا ہے کہ "وہ فن عمارت کا ایک قدیم ماہر تھا۔ جس نے آتش یونان کو ایجاد کیا۔ اور اس کا نسخہ راز کے طریقے پر قسطنطین ثالث ملقب بہ پوگوناطوس کو بتا دیا۔ جس نے اس کے استعمال سے عربون کے جہازون کے بیڑے کو ۶۷۳ء مین جلا دیا۔ وہ قلمرو مصر کے شہر ہلیو پولی مین پیدا ہوا تھا"۔ ہلیو پولی ارض شام کے شہر بعلبک کو کہتے ہین۔ اس لیے یہ غلط ہے کہ وہ مصر کا رہنے والا تھا۔ بلکہ دیگر مصنفین اور خود شہر بعلبک دونون تصدیق کر رہے ہین کہ کالی نیکوس ایک شام کا مسیحی المذہب شخص تھا۔ مسٹر گبن لکھتے ہین اور یہی انسائیکلو پیڈیا مین بھی ہے کہ وہ خلیفۂ اسلام کی ملازمت چھوڑ کے قسطنطینیہ چلا گیا تھا اور قسطنطین ثالث کی ملازمت اختیار کی تھی جو ۶۶۸ء مین مشرقی سلطنت کے تخت پر بیٹھا تھا۔ یہ زمانہ خلافت اسلامی کی تاریخ مین جناب معاویہ کا تھا۔ لہذا یہ سمجھنا چاہیے کہ کالی نیکوس حضرت معاویہ کی نوکری چھوڑ کے گیا ہوگا۔ اور گریک فائر کی ایجاد بھی اسی دور مین ہوئی۔ مسلمان مورخین اپنی تحریرون مین کہین اس بات کا پتہ نہین دیتے کہ انھین قسطنطینیہ کی دیوارون کے نیچے یا اُس کے قریب کے سمندر مین جو شکستین ہوئین اُن میں دشمنون کی طرف سے آتشباری کی گئی تھی۔ اور وہی آتشباری باعث شکست ہوئی۔ تاہم مغربی مورخین مین یہ واقعہ انتہاسے زیادہ مشہور ہے۔ اور ہم اُسے تسلیم کیے لیتے ہین۔

لیکن یہ کیونکر تسلیم کیا جائے کہ کالی نیکوس ہی نفطے کا موجد تھا؟ کیا یہ ممکن نہین ہے کہ بعلبک مین اُس نے نفطے کو مسلمانون سے سیکھا ہو؟ اور قسطنطینیہ پہونچ کے جب دیکھا ہو کہ تمام لوگ اس سے ناواقف ہین تو موجد کی حیثیت سے اُسنے لوگون کو اسکی تعلیم کی ہو؟

یورپ والے سمجھ رہے ہین کہ اُسکے بعد بہت صدیون تک نفطہ کا استعمال قسطنطینیہ والون مین ایک راز سربستہ رہا۔ کسی کو اسکی خبر نہ تھی۔ اور مسلمانون مین بھی اس کا استعمال پہلے پہل صلیبی لڑائیون کے وقت دیکھا گیا۔ لیکن ہمارے پاس اسکی کافی شہادتین موجود ہین کہ کالی نیکوس کے زمانے کے قریب ہی مسلمان لوگ کامیابی کے ساتھ نفطہ کا استعمال کر رہے تھے۔

چچ نامہ اور میر معصوم بھکری کی تاریخ سندھ میں صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ ۷۱۲ء مطابق ۹۲ھ کے قریب یعنی جناب معاویہ کے ۳۹ برس بعد جب سندھ میں محمد بن قاسم اور راجہ داہر سے مقابلہ ہوا تو مسلمانوں کی طرف سے نفطہ کے ذریعے سے آتش باری کی گئی۔ راجہ داہر جس ہاتھی پر سوار تھا اُس پر عربوں نے حقہ ہائے آتش بازی (آگ کے بھرے ہوئے ظروف) برسائے۔ چچ نامے کے دو نسخوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "محمد بن قاسم کے ہمراہ نو سو تیر انداز تھے جو تیروں کے ذریعے سے حریف پر نفطہ برسا کے آگ لگاتے تھے"۔ میر معصوم کی تاریخ کا ممکن ہے کہ اعتبار نہ کیا جائے۔ مگر چچ نامے کے بیان پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلیے کہ مسٹر ایلیٹ کے نزدیک بظن غالب وہ کتاب ۷۵۳ء مطابق ۱۳۶ھ سے پہلے کی تصنیف ہے۔

اُسی زمانے اور اُسی پائے کی ہم ایک اور شہادت بھی پیش کر سکتے ہیں۔ جس سے یہی ثابت نہیں ہوتا کہ عرب لوگ نفطہ کے استعمال کو اُن دنوں جانتے تھے بلکہ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ صرف وہی اپنے آپ کو اس فن کا مالک خیال کرتے تھے۔

تاریخ یعقوبی مطبوعہ لیڈن میں ہے کہ جنید بن عبدالرحمن مری نے (جسے خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے عہد ۱۰۸ھ (۷۲۶ء) میں بصرے کے گورنر جنرل خالد قسری نے والی سندھ مقرر کر کے بھیجا تھا) چین کے ایک مضبوط قلعے کا محاصرہ کیا۔ ایک زمانے تک سرگرمی دکھانے میں جب کامیابی نہ ہوئی تو اُس نے روغن نفط برسانا شروع کیا۔ لیکن اُسے یہ دیکھ کے حیرت ہوگئی کہ اس آگ اور روغن کے شعلوں کو قلعے والے فوراً بجھا دیا کرتے تھے۔ جنید نے ذرا تامل کر کے کہا معلوم

ع۔ چین سے مراد مسٹر ایلیٹ کی تحقیق میں شہر چینا پٹ ہے جہاں کنشک نے اپنے چینی کفیلوں کو رکھا تھا۔ یہ شہر پنجاب میں دریائے بیاس سے مغرب جانب دس میل کے فاصلے پر تھا چینی سیاح ہوئین تسانگ نے ۶۴۵ء اور ۶۹۹ء کے درمیان میں اسے دیکھا تھا۔ اور چودہ مہینے تک وہ یہاں رہا۔ سر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے خیال کے مطابق حملۂ عرب کے زمانے میں یہاں ایک حکومت قائم تھی جس کے فرماں روا کو عرب بادشاہ چین کہتے تھے۔

ہوتا ہے اس قلعے میں کچھ عرب لوگ بھی موجود ہیں - اس لیے کہ بغیر انکی تعلیم کے یہ آگ نہیں بجھ سکتی - اس شبہے کی وجہ سے اُس نے محاصرے میں اور سختی کی - آخر قلعے والون نے عاجز آ کے پیغام صلح دیا - اور اطاعت قبول کی - بعد تکمیل معاہدہ جنید قلعے مین داخل ہوا اور ہر طرف تلاش کرنا شروع کیا تو واقعی دو عربی الاصل شخص ملے - اور تفتیش سے ثابت ہوگیا کہ اُنھین کی حکمت سے وہ آگ بجھائی گئی تھی - ان دونون کی اس قومی نمک حرامی پر جنید کو سخت غصہ آیا - اور اُنھین قتل کر ڈالا "

اب اس تصدیق کے دیکھنے کے بعد شبہہ نہین کیا جا سکتا کہ عرب لوگ اس فن مین اپنے آپ کو یکتا اور فرید عصر خیال کرتے تھے - اور اُنکے علم مین بھی نہ تھا کہ نفطہ کا استعمال اُنکے سوا کوئی اور بھی جانتا ہے - اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یونانیون کی طرح اُنھین بھی اسکے مخفی رکھنے مین اہتمام تھا - چنانچہ مسٹر ایلیٹ کو بھی اپنی تاریخ ہند مین یہ لکھ دینا پڑا کہ " اگر یہ سچ ہے تو داہر کی لڑائی (۷۱۲ء) پہلا موقع ہے جبکہ عربون نے نفطہ یا آتش یونان کا استعمال کیا -

ان تمام واقعات کے ملانے سے نفطہ کی ایجاد کے متعلق جو سچی اور قابل وثوق رائے قائم کی جا سکتی ہے یہ ہے کہ روغن نفط کے کنوؤن کے گرجستان اور عراق مین موجود ہونے کے باعث اس کا نسخہ قدیم بابلیون اور مغلون کو مدت ہاے دراز سے معلوم تھا - اُن سے مسلمانون نے اپنے ابتدائی عہد مین اخذ کیا اور ترقی دینے لگے - اسی اثنا مین اُنکے ملک کا ایک مسیحی شخص اِس نئی چیز کا حال دریافت کر کے قسطنطنیہ مین بھاگ گیا - اور وہان کی حکومت کو اُس سے مطلع کر دیا - قسطنطنیہ والے اسے اُسی کی ایجاد سمجھے - اور ایک نعمت ربانی تصور کر کے اُسے چھپانے لگے -

عربون نے چند روز بعد اُسے اپنے فوجی حربون میں شامل کر لیا - اور دشمنون کے مقابل کام مین لانے لگے - یورپ والون کو جو اُن دنون مشرقی دنیا کے حالات سے بالکل ناواقف تھے اسکی خبر نہ ہونے پائی - اور سمجھتے رہے کہ یہ چیز قسطنطنیہ والون ہی کے اندر محدود ہے - مگر جب صلیبی لڑائیون کے زمانے مین اُولو العزمی سے کام لے کے شام و فلسطین مین آئے تو مسلمانون کو نفطہ کے ذریعہ سے آتش باری کرتے دیکھ کے ہکا بکا

رہ گئے۔

عربون کا سب سے بڑا کمال اس بارہ خاص میں وہ تھا جسے ہم اس سے پیشتر دلگداز کے ایک نمبر میں بتا چکے ہیں کہ عکہ کے محاصرے کے وقت اُنھون نے اسکی قوت اتنی بڑھا دی کہ جو چیزین آگ نہین پکڑتین اُن میں بھی اس کے خوفناک اثر کو قائم کر دیا۔ اور وہ بُرج جلا کے خاک کر دیے جو بڑے اہتمام کے ساتھ فائر پروف بنائے گئے تھے اور جن پر آگ سرایت ہی نہ کر سکتی تھی۔ نفط میں قیامت کی یہ بات تھی کہ اسکی آگ پانی سے بجائے بجھنے کے اور مشتعل ہوتی تھی۔ سمندر اور تالاب کی سطح پر وہ اسی طرح مشتعل رہتا تھا جس طرح کسی لکڑی کی چیز پہ مشتعل ہو۔ اور اس کی بجھانے والی صرف تین چیزین تھین۔ بالو۔ پیشاب اور سرکہ۔ جن لوگون کو یہ اجزا نہ معلوم ہوتے وہ اس کے بجھانے سے عاجز تھے۔

مغربی یورپ والون اور فرنگیون کو اس کا نسخہ یونانیون اور قسطنطنیہ والون سے نہین حاصل ہوا۔ بلکہ صلیبی لڑائیون کی بدولت اُنھین یہ چیز مسلمانون سے ہاتھ لگی۔ مسٹر کانڈر اپنی کتاب لیٹین کنگڈم آف جروسلیم مین لکھتے ہین کہ فرانس کا بادشاہ فلپ دوم تھوڑا سا روغن نفطہ عکہ سے واپس جاتے وقت اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ جس کی مدد سے وطن پہونچ کے اُس نے شہر ڈی اپ کی لڑائی مین انگریزون کا پورا بیڑا تباہ کر دیا۔ مگر پھر بھی مدت ہاے دراز تک فرانسیسیون کو اس کے بنانے کی ترکیب نہین معلوم تھی۔ اور انسائیکلو پیڈیا برٹانکا مین ہے کہ ۱۷۵۵ء مین دو فرانسیسی شخصون نے جن کے نام گوبیر اور ڈوپرے تھے اس آتش سیال کا از سر نو پتہ لگا لیا تھا۔ مگر وہ بھی اُس کے شائع کرنے سے روکے گئے۔

لیکن اسی نفط کے نسخے اور استعمال نے انسان کو بارود کا نسخہ بتا دیا جسکے ظاہر ہوتے ہی دنیا کا فن جنگ ہی بدل گیا۔ اور وہ آتش سیال اسکے مقابل دشوار اور دقت طلب ہونے کے باعث ایسی مٹی کہ آج دنیا مین شاید کوئی صحیح نسخہ جاننے والا بھی نہ موجود ہوگا۔ بارود کے متعلق ہم کسی اور موقعے پر بحث کرین گے۔ لہذا اس بحث کو یہیں پر ختم کرتے ہیں۔

ریش مقدس

انسان کی متلون مزاجیون کی جس قدر مکمل تصویر ڈاڑھیون کو دیکھ کے نظر آتی ہے ہم اور کسی جگہ نہیں دیکھ سکتے۔ تمام حیوانات خاص کر طیور میں پوری طرح نمایان ہے کہ قدرت نے نر و مادہ مین کچھ نہ کچھ امتیاز ضرور رکھا ہے۔ نر کو بعض قسم کے پر و بال زیادہ دیے ہین۔ جن مین طرح طرح کی رنگ آمیزی اور حیرت انگیز چمک دمک ہوتی ہے اور مادہ کی دلفریبی اور دلکشی مین چاہے کتنا ہی جذب و اثر ہو مگر غیر جنس کی نظر مین نر کی زیبائی و رعنائی مادہ سے کہین زیادہ ہے۔ ہم اپنے شوق اور اپنے تقاضاے نفس سے عورتون کو زیور پہناتے اور اُنھین ہر قسم کے سامانِ زینت سے آراستہ کرتے ہین۔ مگر قدرت نے اپنا خوشنما اور نظر فریب زیور نر ہی کو پہنایا ہے۔ اسی قدرتی زیور مین سے ایک ڈاڑھی بھی ہے جو قدرت کی جانب سے مرد کو دی گئی ہے۔ لیکن مرد نے بجاے قدر کرنے کے اس زیور مین ایسی ایسی قطع و برید کی اور اُس مین ترمیم و تغیر کر کے ایسی ایسی دھجین بنائین کہ حیرت معلوم ہوتی ہے۔

ابتدائی زمانے مین جبکہ انسان نے زیادہ ہاتھ پانون نہین نکالے تھے اور جب تک نہ اُسترا ایجاد ہوا تھا نہ قینچی نہ کنگھی تھی نہ آئینہ۔ ڈاڑھیان اپنی اسی اصلی حالت پر رہین۔ جیسا کہ خدا نے اُنھین بنایا تھا۔ توراۃ کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے منہ پر اچھی خاصی ڈاڑھی تھی۔ جو بظن غالب جھنڈولی اور ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ پاپایان روم کے ایوان مین حضرت آدم کا ایک پرانا سنگی تابوت رکھا ہے جس پر آپ کی ایک تصویر بھی ترشی ہوئی ہے۔ اُس مین بھی سنگتراش نے آپ کی اسی وضع کی ڈاڑھی تراشی ہے۔ روایت توراۃ کی بنا پر یہود نے اس سنتِ آدمی کو اپنا اخلاقی قانون بنا لیا تھا۔ اور ہر یہودی کے منہ پر لمبی چوڑی مقدس ڈاڑھی ضرور ہوا کرتی تھی۔ اور اُنکا اعتقاد تھا کہ ڈاڑھی کی جس قدر خدمت کی جائے اُسی قدر ثواب ہوتا ہے۔ کیونکہ ڈاڑھی خدا کی ایک متبرک ودیعت ہے۔ یہود کو اپنی داڑھیون سے جس قدر محبت تھی اُس کا پتہ اسی سے لگ سکتا ہے کہ مصر مین باوجودیکہ فراعنہ اور قبطی ڈاڑھی مُنڈاتے تھے اُن لوگون

کو گویا ڈاڑھی سے عناد سا تھا مگر یہودنے اُنکی وضع کو ہرگز اختیار نہ کیا۔ اور صدیوں کی غلامی کے بعد بھی اپنی ڈاڑھیان بچاکے نکل آئے۔ یہودہی پر منحصر نہین۔ اگلے زمانے کے اکثر شریف قوموں مین ڈاڑھی شرافت وعزت کا مرکز خیال کیجاتی تھی۔ سچے آدمی کے لیے ایک متبرک و محترم چیز اور مرد کی مردانگی کا تمغہ اور اُس کی شرافت و عزت کا مظہر خیال کی جاتی تھی۔ سچے آدمی کے لیے راست بازی کی نمایان علامت ڈاڑھی ہی تصور کی جاتی تھی۔ کوئی شخص کسی بڑے کام کا حوصلہ کرے اور کسی دشواری کے مقابلے پر جائے تو اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہتا "انشاءاللہ!" کوئی کسی سے پناہ مانگے اور اپنے آپ کو امان مین دینا چاہے تو اُس کی ڈاڑھی کو ادب و نرمی سے چھو لیتا۔ چنانچہ تاریخ توراۃ کا بہادر یوآب اپنے حریف اماسا کے سامنے گیا تو فریب کی راہ سے اس کی ڈاڑھی چومی اور کہا "بھائی اچھے ہو؟" اماسا اس فقرے مین آکے غافل ہو گیا اور یوآب نے اپنی تلوار اُسکے سینے مین بھونک دی۔ بچے۔ عزیز و اقارب۔ اور دوست احباب اپنے محترم عزیز یا دوست کی ڈاڑھی کو تعظیماً آہستہ سے ہاتھ لگاتے تو سمجھا جاتا کہ وہ نہایت ہی محبت و عزت سے پیش آئے۔ لیکن اگر کوئی شخص گستاخانہ حیثیت سے کسی کی ڈاڑھی پر ہاتھ ڈال دے تو سمجھا جاتا کہ اُس نے اُس کی سخت توہین کی۔ مصر مین فراعنہ اور امراے قبط اگرچہ سب کے سب ڈاڑھیان مُنڈاتے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے ذہن مین ڈاڑھی کی قدر و منزلت کا خیال ضرور موجود تھا چنانچہ بڑی عیدون اور خاص تیوہارون مین فراعنہ مصنوعی ڈاڑھیان منہ پر لگا لیا کرتے تھے جیسا کہ اُن کی تصویرون سے ظاہر ہوتا ہے۔ ادھر دیوتاؤن کے چہرون پر بھی نوکیلی ڈاڑھیان بنایا کرتے تھے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانے والے فرعون کی ڈاڑھی موتیون سے گُندھی ہوئی تھی۔

ادھر مشرق مین بھی ڈاڑھی کی قدر تھوڑی نہ تھی۔ شاہان فارس ڈاڑھی کے اوپر جو فولادی ریش پوش لگاتے اُسے سونے کے تارون سے کستے تھے۔ اور زبردست تاجداران نینوا اپنی گھونگھردار ڈاڑھیون مین تیل ڈال کے اور کنگھی کر کے بڑے بناؤ سے گھر سے باہر نکلا کرتے تھے۔ اگلے دنون یہ بھی نظر آتا ہے

کہ بعض ملکوں اور سلطنتوں میں محض داڑھی کے باعث لڑائی چھڑ گئی اور بڑی بڑی خونریزیاں ہوئیں۔ تاتاریوں اور ایرانیوں اور چینیوں اور تاتاریوں میں صرف اس اختلاف کے باعث لڑائی ہوئی کہ ایک قوم کہتی تھی داڑھی مونڈی جائے اور دوسری کا دعوے تھا کہ مونڈی نہ جائے بلکہ اُسکے بال اُکھاڑے جایا کریں۔
یونانیوں اور روسیوں میں بھی ابتداءً سب کے مُنہ پر داڑھی ہوتی تھی۔ اُنکے تمام فلسفی اور بڑے بڑے مشاہیر داڑھی والے تھے۔ مگر حضرت مسیح سے تین سو برس پیشتر جب صقلیہ (سسلی) کے نائی وہاں پہونچے تو لوگوں نے داڑھیوں کو خیرباد کہنا شروع کیا۔ لیکن اب جو داڑھیوں کے مُنڈنے کا رواج ہوا تو اس شدت سے کہ "باربرس" کا لفظ جسکے معنی داڑھی والے کے ہیں تمام وحشی قوموں اور اُن جماعتوں کی نسبت استعمال کیا جانے لگا جو اُنکے حلقۂ اثر سے باہر تھیں۔ مگر پھر بھی اُن میں داڑھی کی عزت کا اس قدر خیال ضرور موجود تھا کہ جو شخص عاقل و بالغ ہوتا اور جسے مرد آدمی کہنا چاہتے تو "بادپوس" یعنی صاحب ریش کہتے۔ اور اسی کا اثر تھا کہ اُنکے نوخیز امرد لڑکے روز ٹھُڈی میں تیل ملا کرتے کہ جلد ہی داڑھی نکلے۔ اور ہمارا اشمار قوم کے بڑوں میں ہو۔ زمانہ مابعد کے بعض قیاصرہ اور سلاطین کے مُنہوں پر بھی داڑھیاں تھیں۔ اُنکے مصنفین ہومر۔ ورجل۔ پلینی۔ پلوٹارک۔ اسٹرابو۔ ڈیو دورس۔ جووِنل۔ اور پرسیوس نے داڑھی کے متعلق اسقدر مباحث لکھے ہیں کہ اگر اُنکو جمع کیا جائے تو اچھا خاصہ لٹریچر تیار ہو جائے۔ یہ سب تو داڑھی رکھنے کے مؤیدین میں تھے مگر قیصر روم جولین نے داڑھی کی مذمت میں بھی ایک کتاب لکھ ڈالی۔ لیکن باوجود اس مخالفت کے خود اُسکے منہ پر اُسکے فلسفیانہ تقلید میں جھنڈولی داڑھی تھی۔ اور گو اُسکے سارے جسم پر بال تھے مگر اُسترا سوا سر کے کہیں نہیں لگنے پاتا تھا۔ پرسیوس کہتا ہے کہ دانائی داڑھی سے وابستہ ہے۔

یہ خیال اگلے دنوں لوگوں کے دماغ میں اس قدر بسا ہوا تھا کہ کسی بادشاہ نے ایک بے ریش و بروت لڑکے کو ایلچی بنا کے کسی دوسرے بادشاہ کے دربار میں بھیجا۔ اس امرد سفیر کی صورت دیکھتے ہی اُس نے سخت برہمی کے ساتھ کہا

میرے دربار میں ایک بے ریشے لونڈے کو سفارت پر بھیجا ہے"۔ یہ سن کے نوعمر ایلچی بولا "میرے آقا کو اگر یہ معلوم ہوتا کہ حضور کے نزدیک ڈاڑھی کی اس قدر ضرورت ہے تو میرے عوض ایک بکرے کو بھیجدیتا"۔

اسکندر اعظم کے عہد میں معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں اور مقدونیہ والوں میں ڈاڑھی کا عام رواج تھا۔ مگر سکندر نے یہ بدعت ایجاد کی کہ سپاہیوں کی ڈاڑھیاں منڈوادیں۔ اور اس کارروائی کا محرک یہ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو دشمن ان سپاہیوں کی ڈاڑھیاں پکڑ پائیں اور بے بس کر کے مغلوب کریں لیکن اسکے بعد یورپ میں ڈاڑھیوں کا پھر رواج ہوگیا۔ جس کا حال ہم آگے بیان کریں گے۔

قوم عرب میں مدت ہائے دراز سے ڈاڑھی رکھنے کا رواج چلا آتا تھا۔ جسکو اسلام نے بھی شرافت و مردانگی کا تمغہ تسلیم کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام کے زمانے تک یہ بات اہل عرب کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ کوئی شریف قوم ڈاڑھی منڈاتی ہے۔ صرف عجمیوں اور مجوس کی نسبت اتنا جانتے تھے کہ ان کی ڈاڑھیاں منڈی ہوتی ہیں۔ جب داراے ایران خسرو پرویز کے سفیر مدینے میں آئے۔ اور حضرت رسالت کے مہمان ہوئے تو ان کی منڈی ہوئی ڈاڑھیاں دیکھ کے آپ نے پوچھا "تم لوگ ڈاڑھی کیوں منڈاتے ہو؟" انھوں نے کہا "ہمارے مالک ہی حکم ہے"۔ یہ سن کے آپ نے ارشاد فرمایا "مگر میرے مالک (خدا) نے مجھے داڑھی کے چھوڑنے اور مونچھوں کے کتروانے کا حکم دیا ہے"۔ اسی واسطے آپ نے صحابہ کو تعلیم فرمائی "فطرت (انسانی یا ایمانی اس لیے کہ اسلام میں دونوں متحد ہیں) کا تقاضا یہ ہے کہ ڈاڑھی چھوڑ دی جائے اور مونچھیں کتروائی جائیں"۔ حضرت رسالت کے اس ارشاد نے ڈاڑھی کا مرتبہ اور بڑھا دیا۔ صحابہ کی عام وضع یہ تھی کہ لمبی ڈاڑھیاں اور کتری ہوئی مونچھیں۔ حضرت ابن عمر اور بعض دیگر صحابیوں کا معمول تھا کہ مٹھی سے ڈاڑھی کو ناپتے اور جتنی بڑھتی نظر آتی اُسے کاٹ ڈالتے۔ اور چاروں طرف سے برابر کرنے کے لیے بھی کاٹتے تھے۔ مگر یہ بھی خاص خاص لوگوں کی وضع تھی ورنہ عموماً سب کی ڈاڑھیاں مطلقاً چھوٹی ہوئی تھیں۔ اور مونچھیں اس قدر کتری ہوئی کہ

جلد نظر آئے۔ اسلام اس وضع و حلیہ کی اشاعت کرتا ہوا عرب کی حدود سے باہر نکلا۔ اور جہان جہان پہونچا وہان ڈاڑھی کی قدر و منزلت بھی زیادہ ہوتی گئی اور چندروز مین شام و مصر۔ ایران و توران۔ اور افریقہ و اندلس مین جہان دیکھیے نورانی ڈاڑھیون کا جلوہ نظر آرہا تھا۔ اور حریف پر جتنا رعب لمبی ڈاڑھیونکا پڑتا تھا کسی چیز کا نہ پڑ سکتا تھا۔

مسلمانون کی یہ عام وضع تھی کہ لمبی داڑھیان ہوتین۔ اُن مین تیل ڈالا جاتا۔ کنگھی کی جاتی۔ اور سن رسیدہ شہسوارون کی ڈاڑھیون پر مہندی کی سرخی اور کبھی نیل کی سیاہی اپنا جلوہ دکھاتی۔ ڈاڑھی کو اپنی عزت سمجھتے۔ اور ساتھ ہی خیال کیا جاتا کہ ڈاڑھی چونکہ مردانگی کا فطری زیور ہے لہذا عورتین بھی بالطبع ڈاڑھی والے مرد کو بے ڈاڑھی والے سے زیادہ محبوب رکھتی ہین۔ ڈاڑھی کی شرم سب سے بڑی شرم ہوتی۔ اور ڈاڑھی کی عزت کرنا سب سے بڑی خاطرداری خیال کی جاتی۔ یہان تک کہ بچون کے ساتھ اظہار شفقت منظور ہوتا تو بڑے بوڑھے اُن کی ٹھڈیون کو اپنے ہاتھ مین لیتے۔ اور سمجھتے کہ گو ان کے ڈاڑھی نہیں مگر ڈاڑھی نکلنے کی جگہ پر ہاتھ لگانا اُنکی عزت بڑھانا ہے۔

اب بعد کا زمانہ آیا۔ اور مسلمان دیگر اقوام مین مل جل کے اُنکی وضع قطع اختیار کرنے لگے۔ پہلا تغیر تو بظن غالب عباسیہ کے آخری دور مین یہ ہوا کہ بعض مسلمان ایرانیون کی تراش خراش سے متاثر ہوئے اور ڈاڑھیان کتروانے اور چھوٹی کرانے لگے۔ اور ڈاڑھی کی اُس اگلی عزت و حرمت مین کمی ہونے لگی۔ یہان تک کہ عرب کے ہاتھ سے حکومت ہی نکل گئی۔ اور تاج و تخت کی وارث ترکی قوم ہوئی۔ جس نے مختلف ممالک مین مختلف سلطنتین قائم کین۔ اور ہر سلطنت کے مسلمان اپنی قلمرو کے لوکل اثرون سے متاثر ہونے لگے۔ اُدھر دولت عثمانیہ کے وارث تاج و دیہیم سلطان سلیم اول نے (جس کا زمانہ ۱۵۱۲ء سے ۱۵۲۰ء تک تھا) غالباً مسیحیون کی وضع پسند کر کے سب کے پہلے ڈاڑھی کو خیرباد کہی۔ ادھر دولت مغلیۂ تیموریہ کے وارث شہنشاہ جلال الدین اکبر نے (جسکا عہد ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک تھا) اپنے سالے سُسرون کے اثر سے متاثر ہو کے

ڈاڑھی کا صفایا بول دیا۔ ہندوستان مین اکبر کے اس فعل کو مسلمان سوسائٹی نے گو ناپسند کیا مگر سب نے ایسی خاموشی اختیار کی کہ نہ کسی نے مخالفت کی آواز بلند کی اور نہ کسی نے بادشاہ کی وضع اختیار کی۔ مگر سلطان سلیم کی مخالفت نے ذرا زیادہ جوش دکھایا۔ گو سلطان کے سامنے کسی کو زبان کھولنے کی مجال نہ تھی مگر شیخ الاسلام نے جی کڑا کرکے پوچھا "حضور نے ڈاڑھی کیون مُنڈا ڈالی"۔ سلیم نے ہنس کے مسخرے پن سے کہا "تاکہ وزیر کے ہاتھ مین میری کوئی ایسی چیز نہ آسکے جسے پکڑ کے وہ مجھے جدھر چاہے کھینچ لیجائے"۔

مگر اسلام کی گرفت ایسی نہ تھی کہ اسلامی ممالک مین یورپ کی طرح بادشاہ کی وضع کا اثر عام سوسائٹی پر پڑ جاتا۔ نہ اکبر کی وجہ سے مسلمان شرفا و اُمرا نے اپنی ڈاڑھیان مُنڈائین۔ اور نہ سلیم کی وجہ سے ترکی امرا و ارکان دولت نے۔ بلکہ خود اُنکے جانشینون مین بھی یہ وضع نہ قائم رہ سکی۔ اکبر کے بعد جہانگیر نے تو البتہ ڈاڑھی مُنڈائی تھی مگر بعد جو دیکھا گیا تو ساری دنیا کے مسلمان تاجدارون کے مُنہ پر لمبی اور نورانی ڈاڑھیان تھین۔

اب موجودہ مسلمانون کی ڈاڑھیون کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ہمین یہ بتانا چاہیے کہ ظہورِ نیر اسلام کے بعد یورپ کی سرزمین مین غریب ڈاڑھی پر کیسی کیسی آفتین نازل ہوئین۔ اور وہان اُسے کن کن مصیبتون کا سامنا کرنا پڑا۔ ڈاڑھی نے نشیب و فراز عالم اور انسانی تلون مزاجیون کے جیسے جیسے کرشمے اس مغربی حصۂ زمین مین دیکھے کہین نہین دیکھے تھے۔ کبھی تو بڑی بڑی لمبی ڈاڑھیان تھین اور کبھی صفاچٹ۔ مذہب عیسوی اگرچہ یہود مین سے نکلا تھا۔ اور حضرت مسیح اور آپ کے حواری سب ڈاڑھی والے بزرگ تھے مگر مذہب نے اسکی کچھ پروا نہ کی۔ کلیسائے روم و کلیسائے یونان مین جہان اور اختلافات ہین وہان یہ بھی ہے کہ کلیسائے یونان ڈاڑھی کا موید و حامی ہے اور کلیسائے روم غالباً رومیون کے آخری مذاق کی پابندی مین ڈاڑھی کے خلاف۔ بلکہ مغربی مقتدا ڈاڑھی کو عیب خیال کرتے ہین۔ اسوقت خود پوپ اور اُنکے تمام کارڈنل (جن مین سے پوپ منتخب ہوتے ہین) سب کی ڈاڑھیان خوب مُنڈی

ہوتی ہیں - لیکن شاید یہ آخر عہد کے پاپاؤں کا بنایا ہوا قانون ہے - کیونکہ قدیم الایام کے اکثر پاپا ڈاڑھی والے تھے - نیپلز میں قدیم پاپاؤں کی مورتیں پر اسے ہی زمانے کی ترشی ہوئی رکھی ہیں - جن میں پوپ کلیمنٹ سابع (سنہ ۱۵۲۳ء) سے لے کے پوپ اسکندر ہشتم (سنہ ۱۶۸۹ء) تک کی مورتیں ترتیب وار نظر آتی ہیں - اور موجودہ پوپوں کی منڈی ہوئی ڈاڑھی موچھوں کے بعد اُنکے چہروں پر نظر ڈالیے تو حیرت معلوم ہوتی ہے - آخر عہد میں جب پوپ نے ڈاڑھی منڈانے کا فتویٰ دیا تو ہر طرف ڈاڑھیوں پر ظلم ہونے لگا - یہاں تک کہ بلجیم کے ریفارمروں نے خواہش کی کہ ڈاڑھی والے مسیحی لامذہب اور دین عیسوی سے خارج کیے جائیں -

تیرہویں صدی عیسوی تک انگلستان میں بھی ڈاڑھی رکھنے کا عام فیشن تھا - مگر پندرھویں صدی میں ڈاڑھیوں پر ایسے ہاتھ صاف ہونے لگے کہ ڈاڑھی والے چند ہی چہرے باقی رہ گئے تھے - ہنری ہشتم کے عہد میں لنکنز ان کے معزز و محترم ارکان نے یہ قاعدہ جاری کیا کہ جس کے منہ پر ڈاڑھی ہو وہ بغیر دونی فیس ادا کیے بڑے میز پر نہ بیٹھ سکے - لیکن ابھی تک اکثر لوگوں کو ڈاڑھیاں اس قدر عزیز تھیں کہ باوجود ان جابرانہ قواعد کے ڈاڑھیوں سے دست بردار نہ ہوتے تھے - چنانچہ سنہ ۱۵۵۵ء میں ملکہ میری نے اپنے چار معزز اُمرا کو روس کے دربار میں سفیر بنا کے بھیجا تو اُن چاروں کے چہروں پر ڈاڑھیاں تھیں - خصوصاً اُن میں سے ایک شخص جارج کلنگ وِتھ کی ڈاڑھی پانچ فٹ دو انچ لمبی تھی - جس کی صورت دیکھتے ہی شہنشاہ روس "ایوان مہیب" کو بیساختہ ہنسی آگئی - جارج کی ڈاڑھی گھنی چوڑی اور دراز تھی - اور کھانے کے بعد ایوان اُس سے کھلونے کی طرح کھیلنے لگا -

لیکن انگلستان میں اُنکے بعد جب ملکہ ایلزبتھ کا زمانہ (سنہ ۱۵۵۸ء سے سنہ ۱۶۰۳ء تک) شروع ہوا تو ڈاڑھیوں پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی - اس لیے کہ اس اقبالمند مگر درشت مزاج ملکہ کے حکم سے ڈاڑھیوں پر محصول لگایا گیا - اور حکم جاری ہوا کہ ہر ڈاڑھی والا شخص اپنی ڈاڑھی کی طرف سے سالانہ ۳ شلنگ ۴ پنس محصول ادا کرے - اور جس کسی کے چہرے پر پندرہ دن اُسترا نہ پھرے یعنے

اُس کا خط پندرہ دن کا ہوگیا ہو اُسکے ذمے یہ محصول واجبی ہوجائے۔ ہم نہین جانتے کہ اُن دنون انگلستان مین نائیون کو ڈاڑھی مونڈنے کی کیا اُجرت دینی پڑتی تھی۔ لیکن اس مین شک نہین کہ یہ سرکاری ٹکس نائیون کی سالانہ اجرت سے زیادہ ہی دینا پڑتا ہوگا۔ کیونکہ انگلستان مین اُن دنون زندگی بسر کرنا اس قدر گران نہ تھا جس قدر کہ اب ہے۔ اور اس مین شک نہین کہ انگریزون مین جو رواج ہوگیا ہے کہ ہر شخص صبح کو منہ دھوتے وقت اپنی ڈاڑھی آپ مونڈ لیا کرتا ہے یہ اُسی دَور کی برکت ہے۔ تاہم بہت سے لوگون نے اب بھی ڈاڑھی نہ منڈائی۔ بلکہ سرکاری محصول ادا کرنے سے اور زیادہ خوش ہو ہو کے اپنی ڈاڑھیون پر ہاتھ پھیرتے کہ محصول دینے پر بھی انکی محبت ہمارے دل مین باقی ہے۔

اسکے تقریباً نوے برس بعد پیٹر اعظم نے روس مین بھی ڈاڑھیون پر محصول لگا دیا۔ مملکت ہسپانیہ مین جو دو صدی پیشتر عروج پر تھی غالباً عربون کے اثر سے ڈاڑھی کی اچھی داشت ہوتی تھی۔ اور کل معززین کے چہرون پر ڈاڑھیان ہوا کرتی تھین۔ لیکن ۱۷۰۰ء مین فلپ پنجم کی تخت نشینی کے ساتھ ڈاڑھیون کی قسمت بھی پلٹ گئی۔ انکی بدنصیبی سے فلپ مذکور خوسا تھا یعنی قدرت ہی نے اُسے ڈاڑھی کے زیور سے محروم رکھا تھا۔ ڈاڑھی والون کی سوسائٹی مین اپنے اس پیدائشی نقصان کو وہ برداشت نہ کرسکا۔ اور اپنی خفت مٹانے کے لیے حکم دیدیا کہ تمام امرائے دربار ڈاڑھی منڈا ڈالین۔ اور گو شاہی اثر نے ڈاڑھی منڈانے کو اسپین کا فیشن بنا دیا۔ مگر پھر بھی بہت سے لوگ ڈاڑھی کو حسرت سے یاد کرتے اور ایک آہ کے ساتھ کہتے تھے "ہماری ڈاڑھیون کے ساتھ ہماری جانین بھی چلی گئین"

پرتگیزون مین اس سے پیشتر ڈاڑھی کی بڑی قدر تھی۔ اور وہ بھی عربون کی سنت پر چل رہے تھے۔ مگر جب زمانے کی ہوا بگڑی تو وہ بھی یورپ کے عام فیشن کے گرویدہ ہوے۔ اور اس قوم نے بھی ڈاڑھیون کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا

فرانس مین غالباً یورپ کے دیگر مقامات سے پہلے ہی ڈاڑھیان منڈ گئی تھین۔ مگر مغرب ہی مین "روسکو لنی کی" نام ایک مسیحی مبتدع فرقہ نے دعویٰ کیا

کہ خدا کی "ربانی مودت ڈاڑھی مین ہے" تاہم پوپ صاحب کا مُنڈ انے کا فتویٰ سب پر غالب تھا۔ لیکن وہاں ڈاڑھیاں مُنڈنے ہی منڈتے ایک ایسا زمانہ آگیا کہ یکایک ڈاڑھی کا نصیبہ چند روز کے لیے از سر نو جاگ اُٹھا۔ فرنسینس اول جو فرانس کے رائل کالج اور رائل لائبریری کا بانی ہے ۱۵۱۵ء مین تخت پر بیٹھا۔ اُسکی ٹھوڑی پر ایک زخم کا داغ تھا جو نہایت ہی بدنما معلوم ہوتا تھا۔ اس عیب کے چھپانے کے لیے اُس نے ڈاڑھی رکھ لی۔ چند روز مین سارے دربار کا یہی فیشن ہوگیا۔ اور جسے دیکھیے اُسکے چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ مگر فرنسینس کے بعد پھر وہان زمانے نے ڈاڑھی کے ساتھ سرد مہری کی۔

چند روز پیشتر آخری شہنشاہ فرانس نپولین نے ایک نئی وضع کی ڈاڑھی رکھی یعنی دونوں طرف کلّے مُنڈے ہوے اور ٹھوڑی پر داڑھی۔ کچھ دنون کے لیے فرانس کی یہی وضع رہی۔ جس کا اثر اب بھی کسی قدر باقی ہے۔ اس کے بالکل برعکس جرمن کے بوڑھے شہنشاہ اور نیز روس و آسٹریا کے شہنشاہون نے دونوں جبڑون پر ٹھیکے رکھوائے اور درمیان مین ٹھڈّی منڈا ڈالی۔ یہ وضع یورپ کے بعض فوجی افسرون کو زیادہ پسند آئی۔ اور غالباً اُنھین کی دیکھا دیکھی ہندوستان کے بعض اُمرانے بھی ٹھیکے رکھوالیے۔ جس وضع کا زیادہ مشہور نمونہ فی الحال حضور نظام حیدر آباد میر محبوب علی خان بہادر کی ڈاڑھی ہے۔

فی الحال یورپ مین ہر جگہ ڈاڑھی مُنڈ انے کا عام رواج ہے۔ اور جو ڈاڑھی رکھے اُسکی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ اُسکے مزاج مین صفائی نہین ہے۔ آج کل یورپ مین سب جگہ سے زیادہ ڈاڑھیاں جرمنی مین نظر آتی ہین۔ اور اسکا کچھ رواج باقی بھی ہے تو اُس قوم مین جو اکثر موقعون پر سلطان کی طرفداری کرتی ہے۔

ابھی چند روز ہوے جرمنی نقاش (مصوّر) "جوہان ٹایو" کی ڈاڑھی دُنیا بھر مین سب سے بڑی ڈاڑھی تصور کی جاتی تھی۔ اور واقعی اتنی بڑی داڑھی الف لیلہ کی پری بانو کے قصے کے سوا اور کہین نہین نظر آسکتی۔ اُسکی ڈاڑھی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اتنی لمبی تھی کہ کھڑے ہونے مین بھی زمین پر

لوٹا کرتی - اور اکثر مجبور ہو کے وہ اُسے کمر مین لپیٹ لیا کرتا -

لیکن ہمارے موجودہ فرمان روا قیصر ہند حضور ایڈورڈ ہفتم نے اپنے زمانہ ولیعہدی ہی سے ایک نئی وضع کی چھوٹی اور نوکیلی ڈاڑھی ایجاد کی جو مسلمانون کے شرعی حدود کے اندر آجاتی ہے - اور اگر قوم مین من تشبہ بقوم فہو منہم کے مرض تفرق انفصال کا اندیشہ نہ پیدا ہو اور اس حدیث کا علم صرف امور دینی تک محدود رکھا جائے تو یقین ہے کہ اس دور کی فیشن ایبل ڈاڑھیان خلاف شرع نہ سمجھی جائینگی - یہ ڈاڑھی اب یورپ مین بھی رواج پاتی ہے اور ہندوستان مین بھی یہان تک کہ شہنشاہ روس نے بھی اپنے آبا و اجداد کی وضع کے خلاف اس وضع کی ڈاڑھی رکھ لی - اکثر شاہزادگان یورپ کے چہرون پر اس ڈاڑھی کا جلوہ نظر آرہا ہے - ابھی چند روز ہوے ہمارے ولیعہد سلطنت پرنس آف ویلز بہادر ہم مین اور ہمارے مالک مین تھے - اور اُن کا خوبصورت چہرہ بھی اسی ڈاڑھی کی خوشنمائی کا ثبوت دے رہا تھا -

ہم تو سمجھتے ہین کہ اسلام کو ہمارے شہنشاہ کا شکر گذار ہونا چاہیے - کیونکہ اسلام ڈاڑھی کا سب سے زبردست حامی ہے اور یورپ کی موجودہ دست برد سے امید نہ تھی کہ کسی شخص کی بھی ڈاڑھی بچنے پاتی - ہمارے شہنشاہ کی توجہ سے یہ غریب اُنکے زیر حمایت آگئی - ورنہ دوسری قومیں درکنار مسلمانون کے چہرون پر بھی شاید اتنی ڈاڑھیاں نہ ہوتین جتنی کہ اب نظر آتی ہین - سلیم اور اکبر کا ڈاڑھی منڈانا تو مسلمانون پر کچھ اثر نہین ڈال سکا تھا مگر مغربی تہذیب کے عروج اور یوروپین اقوام کے میل جول سے اکثر ترقی یافتہ ممالک کے مسلمان اپنے قومی کیرکٹر اور اپنے پُرانے حلیوں کو بھول گئے - سب نے ایک سرے سے ڈاڑھی کو خیر باد کہدی - اُدھر ترکون نے بے تکلف ڈاڑھیان منڈانی شروع کر دین - ادھر ایرانیون نے - اور چونکہ یہ دونون ملک فی الحال مسلمانون کی سوسائٹی کے مرکز خیال کیے جاتے ہین لہذا دیگر ممالک کے مسلمان بھی انکو دیکھ کے اور نیز مغربی حکام کی وضع و قطع پسند کر کے عمداً ڈاڑھیان منڈانے لگے -

ہندوستان کے مسلمانون مین سنیون کے مقابل شیعون نے ڈاڑھیون کی

کی طرف سے پہلے بے پروائی کی۔ اُنکے مقتدایان دین نے بھی فتویٰ دیدیا کہ وہی لمبی ڈاڑھی رکھنے پر مجبور نہین بلکہ قصر بھی جائز ہے۔ بس اتنی داڑھی ہونی چاہئے کہ دُور سے کوئی دیکھے تو یہ نہ سمجھے کہ مُنڈی ہوئی ہے۔ مگر اُنکے پیرو اس حد سے گذر گئے۔ بے تکلف مُنڈانے لگے۔ اور لکھنؤ کا فیشن ہوگیا کہ ڈاڑھی نذارد اور موچھین بڑی۔ تقریباً کچھ کم ایک صدی سے ہندوستان مین یہ امتیاز چلا آتا تھا۔ کہ شیعونکی ڈاڑھی منڈی ہوئی اور سنیون کے مُنہ پر ڈاڑھیاں۔ یہان تک کہ انگریزی تعلیم اور علی گڑھ کالج کے جدید فیشن نے یہ امتیاز بھی اُٹھا دیا۔ اور اب سنی و شیعہ سب ایک وضع کے ہیں۔

ختنہ

یہ رسم قدیم الایام سے بعض پُرانی قومون مین چلی آتی ہے۔ اور اس کے سب سے بڑے حامی یہود اور مسلمان ہین۔ مسیحی اگر سچے پیرو مسیح ہوتے تو اُن مین بھی ضرور اس کا رواج ہوتا۔ مگر انھون نے غیر مختون یونانیون اور رومیون کے اثر سے جہان سُور کو جائز کیا۔ ہیکل سلیمانی یعنی مسجد اقصیٰ کی تعظیم ترک کی وہاں ختنے سے بھی آزاد ہوگئے۔

دنیا کی مختلف اقوام کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو نظر آتا ہے کہ اگلے زمانے کی بہت سی اور قومین بھی بغیر اسکے کہ مذکورہ ختنہ کرنے والی قومون سے متأثر ہوئی ہون ختنہ کرتی تھین۔ قدیم اہل مصر فراعنہ کے دَور مین ختنہ کراتے تھے۔ مصر مین قرناق کی ہیکل جنسو کے کھنڈروں مین ایک دیوار پر تصویر بنی ہے کہ دو لڑکون کا (جو بہ ظاہر اسباب فرعون رئیمس دوم کے بیٹے معلوم ہوتے ہین) ختنہ کیا جا رہا ہے۔ ان لڑکوں کی عمرین چھ سال اور دس سال کے درمیان ہیں اور ختنہ کرنے والا مقتدائے اعظم ہے۔ وسط امریکہ کی بعض شایستہ و متمدن پرانی قوموں مین بھی ختنہ کا رواج تھا۔ دریائے آمیزن کے علاقے مین ٹیکا اور ٹناؤ قوموں مین یہ طریقہ آج بھی مروج ہے۔ اس قدیم دُنیا کے جنوبی جزائر مین بھی بہت سی مختون قومین آباد ہین۔ آسٹریلیا کے اکثر اقوام بھی ختنہ کراتے ہین

پاپون لوگون نیو کلیڈ ونیا والون اور نیو ہیبریڈس کے رہنے والون مین بھی ختنہ مروج ہے۔

براعظم افریقہ پر اگرچہ فتوحات عرب کا بے انتہا اثر پڑا اگر وہان بھی بعض ایسی وحشی اور غیر اثر پذیر قومون مین ختنہ کیا جاتا ہے کہ اُسے عربی اثر کا نتیجہ بتانا ذرا دشوار ہے یہان یہ کافر لوگون مین مروج ہے۔ بچوانا قوم مین یہ حالت ہے کہ مختون لڑکے اپنی صحبت الگ قایم کرتے ہین اور غیر مختونون کو اُس مین شریک نہین ہونے دیتے۔ بعض مورخین سمجھتے ہیں۔ کہ ختنہ دراصل قوم عرب کا شعار تھا یہودیون نے اُن سے سیکھا۔ اور بعض سمجھتے ہین کہ یہود سے یہ طریقہ عربون میں آیا۔ غرض یہ بہت پرانا رسم ہے جس کی نسبت یہ پتہ لگانا کہ کس سے نکلا اور کس سے کس مین پہونچا نہایت دشوار بلکہ غیر ممکن ہے۔

یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہے کہ دنیا مین اس عجیب رسم کا رواج کس غرض سے ہوا۔ مصر والون اور نیز شام کے فینقیین مین یہ مشرکانہ مقولہ پھیلا ہوا تھا کہ "را (سورج) دیوتا جب اپنے عضو کے کاٹنے کی خواہش کرتا تو اُس سے خون بہنے لگتا"۔ علیٰ ہذا القیاس یہ دیومالا بھی اس سے تعلق رکھتی ہے کہ "ایل نے اپنے باپ اُرانوس کا یا خود اپنا ختنہ کیا۔ اور خون چشمون اور ندیون مین بہنے لگا"۔ مگر ختنہ کو بت پرستی کے ان افسانون سے متعلق کرنا غلطی ہے۔ یونان کا پرانا مورخ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ "مصر والون میں ختنہ کا رواج صفائی کے خیال سے تھا"۔ یون تو حفظ صحت کے اصول سے بھی ختنہ کو تعلق ہے مگر سچ یہ ہے کہ اس رسم کی بنیاد دُنیوی مصالح کے مقابل دینداری پر زیادہ ہے۔ اصل مین یہ ایک قسم کی قربانی تھی۔ جس سے مقصود یہ تھا کہ اپنی خواہشِ نفسانی کا خون کرکے خدا کی حکومت اپنے اوپر تسلیم کی جائے۔ یا ایک حصہ جسم فدیہ مین دے کے باقی جسم کے محفوظ رکھنے کی اُمید رکھی جائے۔

مورخین ان باتون کی چھان بین مین جہان چاہے اور جس قدر بھٹکتے پھرین مگر اس مین شک نہین کہ مذہبی روایات نے قطعی طور پر فیصلہ کر دیا کہ ختنہ کا آغاز حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے خدا کے ایک عہد کیطرف سے ہوا۔ توراۃ

کی کتاب تخلیق کے ۱۷ باب میں آیات ذیل اس مضمون کو صاف طور پر بتا رہی ہیں
"(۹) پھر خدا نے ابرہام (ابراہیم) سے کہا کہ تو اور تیرے بعد تیری نسل پشت
در پشت میرے عہد کو نگاہ رکھیں۔ (۱۰) اور میرا عہد جو میرے اور تمھارے درمیان
اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر
ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔ (۱۲) تمھاری پشت در پشت ہر لڑکے کا
جب وہ آٹھ روز کا ہو ختنہ کیا جائے گا۔ کیا گھر کا پیدا کیا پڑوسی سے خریدا ہو۔
(۱۴) اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہیں ہوا وہی شخص اپنے لوگوں میں سے
کٹ جائے کہ اُس نے میرا عہد توڑا"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم سے یہ خدا کا ایک عہد تھا جس کی پابندی
پوری نسل ابراہیم نے کی اور آج تک ہو رہی ہے۔ ایک طرف بنی اسرائیل سختی سے
پابند تھے حتیٰ کہ خود جناب مسیح کا بھی ختنہ ہوا۔ اور دوسری طرف بنی اسمٰعیل میں اسکا
پورا رواج تھا۔ جن کی کوشش سے چند ہی روز میں ایسا زمانہ آگیا کہ کوئی خطۂ زمین
نہیں جہاں مختون خدا پرست نہ موجود ہوں۔

توراۃ سے پتہ چلتا ہے کہ خدا اس رسم کو اپنے پوجنے والوں اور اپنے خاص
بندوں کے لیے نہایت اہم جانتا تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ جب بی بی بچوں کو لے کے
مصر کی طرف واپس چلے تو راستے میں اُنھیں خدا ملا۔ اور چاہا کہ موسیٰ کو ہلاک
کر ڈالے (اس کا سبب سیاق عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے
بیٹے کا ختنہ نہیں کیا تھا) تب آپ کی بی بی صفورہ نے ایک تیز پتھر سے بیٹے کا ختنہ
کر کے کٹی ہوئی کھال خدا کے قدموں پر پھینکی اور کہا "تو بیشک خون کے سبب سے
میرے سسرے کی جگہ ہوا۔ تب اُس نے (خدا نے) اُسے (موسیٰ کو) چھوڑ دیا"

ع۵ یہ واقعہ مسلمانوں کے عقائد کی رو سے نہایت لغو اور موحدین کی جگہ مشرکین کے مذاق کا
ہے۔ اور یقیناً ترجمے نے یہ خرابیاں پیدا کر دیں۔ عبرانی زبان کے محاورات پر حکومت رکھنے والا
ہی سمجھ سکتا ہے کہ اصل الفاظ کا مفہوم کیا تھا۔ محاورات کا لفظی ترجمہ ہمیشہ ایسی خرابیاں پیدا
کر دیا کرتا ہے۔ عربی میں "بَینَ یَدَیہ" کے لفظی معنی ہیں اُسکے دونوں ہاتھوں کے درمیان۔ مگر اسکا
علی العموم مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اُسکے سامنے۔ اب فرض کیجیے کہ خدا نے کسی جگہ فرمایا ہو بین یدیّ

حضرت مسیحؑ کے زمانے زمانے مین پولوس نے مسیحیون کی گنتی بڑھانے کی بے نکان دُھن مین جب ہر قسم کے مشرکانہ رواج کو گوارا کر لیا تو ختنہ کی ضرورت بھی اُٹھا دی۔ جس کے باعث یروشلیم کے اصلی مسیحی اور خاص حضرت مسیح کے صحبت یافتہ لوگ اُسکے دشمن اور خون کے پیاسے ہوگئے۔ لیکن مغرب کی آزاد مسیحیت بڑھتی گئی اور اصلی مسیحیت جو ارض مقدس مین تھی کمزور ہوکے فنا ہوتی رہی۔ یہان تک کہ سچا مسیحی فرقہ جو "ناصری" کہلاتا تھا دُنیا سے ناپید ہوگیا۔ اور حضرت رسول آخرالزمان علیہ السلام کو مبعوث ہوکے پکار دینا پڑا کہ اصلی مسیحیت نہین باقی رہی۔

اب مسیحیت یہود کے ساتھ مختونیت کا بھی استیصال کر رہی تھی، اور قریب تھا کہ رومی بت پرستی جو مسیحیت کے جامے مین نمودار تھی اس ابراہیمی عہد کو خدا کے بندون سے تڑوا دے کہ حضرت سرورکائنات کی بعثت سے عرب کا دور شروع ہوا۔ اور بنی اسماعیل جو اب سنتِ ابراہیمی کے سچے حامی تھے توحید کی صدا بلند کرتے ہوے دنیا مین پھیلے۔ اور چند ہی روز مین یہ معجزہ دکھا دیا کہ خدا کا یہ عہد صرف ارض فلسطین مین نہین بلکہ ہر جگہ پورا ہو رہا تھا۔

گر یہود کے اور اسلام کے ختنے مین تھوڑا فرق ہے۔ یہود لازمی طور پر ہر بچے کا ختنہ اُسکی ولادت کے آٹھوین دن کیا کرتے تھے۔ اور مسلمانون مین اسکی پابندی نہیں۔ وہ ولادت سے بلوغ تک جب چاہین ختنہ کرا سکتے ہین۔ بلکہ قدیم زمانے مین عربون کے ختنے کا زیادہ تر رواج بالغ ہونے کے وقت تھا۔

لیکن تعجب یہ ہے کہ بعض قومون مین عورتون کا ختنہ بھی مروج تھا۔ اُنکی شرمگاہ سے گوشت کا کچھ زائد حصہ کاٹ لیا جاتا تھا۔ اور بعض خاص عورتین تھین جن کے ہاتھ سے اس رسم کی تکمیل ہوتی تھی۔ قدیم اسٹرابو کے زمانے مین یعنی اسلام سے بہت پہلے مصر اور عرب کی عورتون مین عموماً ختنہ ہوا کرتا تھا۔ مسٹر لین تصدیق کرتے ہین کہ خلیج فارس کے دونون جانب یعنی بحرین عمان۔ عراق اور فارس مین یہ عموماً

۴ سمجھ والے اُس کا مطلب یہی سمجھین گے کہ میرے سامنے۔ مگر محتاط لفظی ترجمہ کرنے والا کہے گا۔ "میرے دونون ہاتھون کے بیچ مین"۔ ایسی خرابیان توراۃ مین کثرت سے پیدا ہوگئی ہیں۔ اور چونکہ عبرانی زبان مردہ ہوگئی اس لیے اصلی راز کا کھلنا میرے نزدیک امکان سے باہر ہوگیا۔

مروج ہے۔ افریقہ کے بعض مغربی اضلاع میں بھی عورتیں مختون کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ڈھومی قوم بھی اس کی پوری طرح پابند ہے۔

مسلمانوں اور عیسائیوں میں امتیاز لباس

عام مسلمانوں میں یہ بے بنیاد واقعہ کثرت سے مشہور ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا کہ نصارٰی چھوٹے دامنوں کے کپڑے پہنیں اور گھوڑوں کی دُمیں کٹوا ڈالیں۔ حالانکہ جہاں تک کتب تواریخ کا تتبع کیا جائے خلافت راشدہ کے پُرامن و عدل عہد میں کسی ایسی تفریق کا ہرگز پتہ نہیں لگتا۔ گھوڑوں کی دُمیں کاٹنے کا ایک عجیب واقعہ صحابہ ہی کے آخر دور میں ہندوستان کی سرحد پر پیش آیا جسے علامہ بلاذری نے فتوح البلدان میں بیان کیا ہے۔ یعنی حملہ آور عربوں نے حریف کے چند سواروں کے گھوڑوں کی دُمیں کٹی ہوئی دیکھیں۔ روشن خیالی اور وسیع النظری اُن دنوں مسلمانوں میں اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اس وضع کو عربوں نے پسند کیا اور کہا "ہم لوگ ان لوگوں سے زیادہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اپنے گھوڑوں کی دُمیں کاٹ دیں"۔ یا تو اُنھیں مسلمانوں کا یہ مذاق تھا کہ دشمنوں اور مخالفوں کی ہر اچھی اور مفید بات کے اخذ کرنے کو تیار رہتے۔ اور یا یہ زمانہ ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ معاشرتی امور پر "من تشبہ بقوم فھو منھم" کا اصول پیش کر کے کفر و الحاد کا فتوے دے دیا جاتا ہے۔

رہا لباس کا فرق۔ اس بارے میں قرون اولیٰ کی کوئی ایسی شہادت ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس سے یہود و نصارٰی اور مسلمانوں کے وضع و لباس کی تفریق کے متعلق اسلامی حکومت کا کوئی خاص حکم ثابت کیا جا سکے۔ ہاں مصر کے خلفائے بنی فاطمہ میں سے جنھیں اکثر مورخین "عبیدیین" کے لفظ سے یاد کر کے بدنام کرتے ہیں" حاکم بامر اللہ" نے ایک مرتبہ یہ بھی حکم جاری کر دیا تھا کہ حمام کے اندر بھی اور باہر سڑکوں پر بھی عیسائیوں کا لباس مسلمانوں کے لباس سے جدا ہوا کرے۔ مگر حاکم بامر اللہ کے احکام و افعال کا ذمہ دار نہ اسلام ہے اور نہ مسلمان ہیں۔ وہ ایک مجنون سا خلیفہ تھا اور روز ایک نیا اور انوکھا حکم جاری کیا کرتا تھا۔ اگر

اُس کی حالت اور اُسکے احکام کو دیکھیے تو بڑی حیرت معلوم ہوتی ہے۔

۳۹۵ھ مین اُس نے حکم جاری کیا کہ شہر مصر کے گلی کوچون مین اور کل عالیشان مسجدون اور مکانون کے درو دیوار پر صحابۂ کرام کے نامون کے ساتھ (معاذاللہ) گالیان لکھی جائین - اسی قدر نہین - ساری مملکت اور قلمرو مین یہ حکم جاری کرد کہ علانیہ صحابہ کے نامون کی توہین کی جایا کرے - اسکے بعد ۳۹۶ہجری مین کچھ ایسی مت پلٹی کہ یکایک فرمان خلافت جاری ہوا کہ جو کوئی صحابۂ کرام کے محترم نامون کے ساتھ کوئی سخت لفظ استعمال کرے یا اُنکے نامون کی توہین کرے اُس کا فوراً سر اُڑا دیا جائے اور سخت سزا دی جائے - ایک مرتبہ بیٹھے بیٹھے یہ فرمان واجب الاذعان نافذ ہوگیا کہ تمام کُتّے مارڈالے جائین - گلی کوچون مین جو کُتّا ملا فوراً مارڈالا گیا اور یہ حالت ہوگئی کہ سارے شہر مین کہین کتّون کا نام ونشان بھی نہ تھا - ایک بار حکم ہوا کہ کھیرے ککڑیان ہرگز نہ بکنے پائین - پھر یہ فرمان جاری ہوا کہ کشمش ہرگز نہ بکنے پائے - جو کوئی کشمش تھوڑی ہو یا بہت ہو بیچتا نظر آئے واجب التعذیر ہے - یہ مالیخولیا اس قدر بڑھا کہ پانچ سو دینار صرف کرکے جتنی کشمش ملی خرید کے جلادی گئی - اسکے بعد یہ حکم قضا شیم جاری ہوا کہ انگور ہرگز نہ بکنے پائے -

اُنہین احکام کے ذیل مین ایک یہ حکم بھی تھا کہ یہود و نصاریٰ مسلمانون کا سا لباس نہ پہنین - نہ حمام کے اندر اور نہ حمام کے باہر سڑکون اور راستون مین - پھر اُسکا جوش زیادہ بڑھا تو ایک حمام یہود کے لیے، ایک نصرانیون کے لیے، اور ایک مسلمانون کے لیے الگ الگ تعمیر کردیا گیا - مگر معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیون کے ساتھ اُسکا تعصب روز بروز بڑھتا ہی گیا - لباس کی تفرقی کے بعد یہ حکم ہوا کہ آراستہ و پیراستہ زین پر یہود و نصاریٰ نہ سوار ہوا کرین - اُنکے گھوڑون کی زین لکڑی کی ہوا کرے کسی مسلمان کو وہ خدمتگاری پر نوکر بھی نہ رکھین - مسلمان گدھے والے کے گدھے پر کرایہ دے کے سوار بھی نہ ہون - جس کشتی کے ملّاح مسلمان ہون اُس پر بھی سوار نہ ہوا

ان احکام سے مین یہ جانتا ہون کہ امتیاز و تفاخر تو بعد کی چیزین ہین شہر کے مسلمانون، گدھے والون، اور کشتیبانون کا نقصان پہلے ہوا ہوگا - اسکے بعد ش

مین اُس نے حکم دیا کہ بلاد مصر مین عیسائیون کے جتنے کنیسے ہین سب منہدم کرڈالے جائین اور اُن کا مال و اسباب مسلمانون کو دیدیا جائے۔ اور چونکہ بیت المقدس بھی اُس کی قلمرو مین شامل تھا اس لیے حکم دیا کہ وہان کا عظیم الشان کنیسہ القمامہ ڈھادیا جائے۔ پھر حکم ہوا کہ خبردار کوئی شخص علم نجوم سے تعلق نہ رکھے۔ اور جتنے نجومی ہون سب اُس کی قلمرو سے نکال دیے جائین۔ پھر حکم ہوا کہ جتنے کُبیے ہین سب خارج البلد کردیے جائین۔ اسکے بعد مصداق نزلہ برعضو ضعیف می ریزد حکم ہوا کہ خبردار عورتین چاہے دن ہو یا رات اپنے گھرون کی دہلیز سے باہر قدم نہ نکالین۔ اور جس قسم کی جوتیان ہین کہ عورتین آمد رفت کیا کرتی تھین اُنکے بنانے کی موچیون کو قطعی ممانعت کردی گئی۔ عورتین مصر مین اور تمام ممالک اسلامیہ مین ہمیشہ سے باہر آمد و رفت کرتی ہین اور اپنے دوستون اور عزیزون کے گھرون مین عموماً پیدل جایا کرتی ہین۔ مگر اس حکم کی بدولت سات برس تک وہ اپنے گھرون مین قید رہین اور کسی عورت کی مجال نہ تھی کہ گھر سے باہر نکلے۔ یہان تک کہ سات برس بعد اُس کے جانشین الظاہر نے اُنھین اُنکی پرانی آزادی دی۔ پھر اسکے بعد یکایک عیسائیون کے حال پر مہربانی ہوئی اور حکم جاری ہوا کہ اُنکے جتنے معبد اور کنیسے کھودے گئے تھے سرکاری روپیہ سے پھر تعمیر کرا دیے جائین۔ اور اُن کا جو مال لوٹا گیا تھا وہ لوگون سے چھین کے پھر اُنکے حوالے کیا جائے۔

غرض یہ تھے وہ احکام جن کے سلسلے مین ایک بار تفریق لباس کا حکم بھی جاری ہوگیا تھا۔ لیکن اس کو اسلام کا کوئی فعل خیال کرنا اگر مسلمانون کی بیوقوفی ہے جو اسے اپنا فخر و ناز سمجھ کے بیان کیا کرتے ہین تو اُن لوگون کی بھی بڑی بیوقوفی ہے جو اس کی بنیاد پر خلافتِ اسلامیہ کو تعصب کا الزام دیتے ہین۔

اس الحاکم کی موت کا واقعہ بھی حیرت انگیز ہے۔ اُس کا ایک عمدہ سفید گدھا تھا جس کا نام "قمر" رکھا گیا تھا۔ ۱۷۔ شوال ۴۱۱ھ ہجری کو دوشنبے کی رات تھی کہ وہ اُس گدھے پر سوار ہو کے سیر کو نکلا۔ اور چونکہ تنہائی پسند کرتا تھا اس لیے ہمراہیون کو ساتھ آنے سے منع کیا۔ مصر کی آبادی کے باہر رات بھر پھرتا رہا صبح کو حلوان کا رُخ کیا جو دار السلطنت سے ۵ میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا شہر تھا جسکی نزہت گاہین نہایت ہی

دلکش و روح افزا تھین - اسوقت دو سوار ہمراہ رکاب تھے - ایک ایک کرکے اُن دونون کو بھی رخصت کردیا اور آگے کی راہ لی - بس اُسوقت سے اُس کا پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا اور کہان گیا - زمین کھا گئی یا آسمان؟ ماہ شوال کی ۳۰ - تک لوگ روز جلوس کا سامان اور سواری کے گھوڑے لے کے شہر کے باہر نکلتے اور شام کو ناکام واپس آتے - آخر ۲ - ذیقعدہ کو اُسکے غلامون اور ترک سپاہیون کا ایک گروہ اُسکی جستجو مین نکلا - جب ڈھونڈھتے ہوے پہاڑون کے درون مین گھُسے تو اُسکی سواری کا گدھا قمر ملا - مگر اس حالت مین کہ اُسکے چارون پاؤن تلوار سے کٹے ہوے تھے - مگر زین و چارجامہ بدستور اُس کی پیٹھ پر تھا - اس سے آگے بڑھے تو ایک گدھے کے اور اُسکے آگے پیچھے دو پیدل آدمیون کے نقش قدم نظر آئے - اُنکو دیکھتے ہوے وہ سب ایک تالاب پر پہونچے جو حلوان کے مشرق جانب تھا - تجسس کرنیوالون مین سے دو شخص پانی کے اندر اُترے تو اُس کا پورا شاہی لباس بھی مل گیا جس مین سات جُبے تھے اور پائجامہ بھی اس وضع مین ملا کہ گویا کھول کے اُتارا نہین گیا تھا - مگر چھُریون کی ضرب سے کپڑے کٹے نظر آئے - بہرتقدیر اُسکے کپڑے محل مین لائے گئے - اور سب کو یقین ہو گیا کہ وہ دشمنون کے ہاتھ سے مارڈالا گیا - اور بعض لوگون کا خیال تھا کہ یہ خود اُسکی بہن کی سازش کا نتیجہ تھا - لیکن بہت سے ایسے بے قوف ایسے بھی پیدا ہو گئے جو حلف اُٹھاتے تھے کہ الحاکم مرا نہین صرف غائب ہو گیا ہے اور اس غیبت کے بعد عنقریب ظاہر ہو گا -

انہار بحر

قدرت نے دنیا مین عجیب و غریب چیزین پیدا کی ہین - موجودہ زمانے کی سائینس کی ترقیان اور بڑے بڑے شاندار تجربات ہر چیز کے وجوہ اور اسباب دریافت کرتے جاتے ہین مگر اب بھی بہت سی چیزین ایسی ہین جن مین عقل انسانی حیران ہے - انھین مین سے ایک انہار بحر ہین جنکے متعلق کوئی قطعی طور پر نہین کہہ سکتا کہ کیون جاری ہین - قرآن مجید مین خداوند جل و علا فرماتا ہے "مرج البحرین یلتقیان بینہما برزخ لا یبغیان" - اس کی پوری اور سچی تفسیر سچ پوچھیے تو ان انہار بحر کا پتہ لگنے سے پہلے

دنیا میں کسی کو نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ لیکن اب موجودہ تحقیقوں اور جستجوؤں کے بعد دیکھتے ہیں کہ سمندر ہی کے اندر کس طرح نہریں جاری ہیں اور کیونکر بغیر کسی حجاب و برزخ کے ایک پانی خاموش و متحرک رہتا ہے اور دوسرا زور و شور سے جاری ہے۔

انہار بحر سمندر کے دریا ہیں۔ ہمارے بہت سے ناظرین حیران ہونگے کہ سمندر میں دریا کیسے؟ مگر خدا کی قدرت ایسے ہی معجزات دکھاتی رہتی ہے۔ جس طرح خشکی پر ہزاروں ندیاں بہ رہی ہیں بالکل اُسی طرح سمندر میں بھی ہیں۔ اس بارے میں کہ یہ سمندر میں کیونکر جاری ہیں بہت سی رائیں قائم کی گئی ہیں۔ مگر اُن میں سے کوئی توجیہ ایسی نہیں جو دل میں جم کے بیٹھ جائے۔ پہلی وجہ تو یہ بتائی جاتی ہے کہ آفتاب کی تمازت سے خط استوا اور اُس کے آس پاس کا پانی گرم ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ عام قاعدہ ہے کہ گرم چیز پھیلتی ہے اس لیے یہ گرم پانی بھی پھیلتا، اپنی سطح سے کسی قدر اونچا ہوکے بہتا، اور قطبین کی طرف چلتا ہے۔ جہاں کا پانی ٹھنڈا اور خط استوا کے پانی کی سطح سے کسی قدر نیچا ہے۔ اس طریقے سے پانی کا ایک بہاؤ قائم ہو جاتا ہے اور گرمی کے اُبھارے جو جوف پیدا ہوتا ہے اُس کی جگہ بھرنے کے لیے قطبین کے پاس سے سرد پانی نیچے ہی نیچے بہ کر خط استوا کی طرف آتا رہتا ہے۔ یہی سمندر کی بالائی اور اندرونی نہریں ہیں۔ قطبین کی طرف سے جو نہریں خط استوا کی طرف آتی ہیں وہ اکثر سطح آب کے نیچے ہوتی ہیں اور دکھائی نہیں دیتیں۔ مگر بعض سطح آب کے اوپر بھی ہوتی ہیں۔ اگر سطح زمین پر ہر جگہ ایک ہموار گہرائی کا سمندر ہوتا تو اُس کے دَور کی وجہ سے سب جگہ کے پانی کی حرارت ایک ہی درجے پر رہتی۔ مگر سمندر کی گہرائی کہیں کم ہے کہیں زیادہ۔ کہیں اُسکی سطح کے اوپر زمین بھی نکل آئی ہے۔ لہذا اس پانی کی رفتار کے خاص خاص راستے مقرر ہو گئے ہیں جو عظیم الشان نہروں کی طرح سمندر ہی میں بہتے بہتے قطبین کی طرف جاتے ہیں اور وہاں سے سطح آب کے اندر ہی اندر خط استوا تک آتے ہیں۔

اس پانی کے دَور کے خاص راستے مقرر ہو جانے کے مختلف وجوہ میں ایک تو یہ وجہ پیش کی جاتی ہے کہ جس طرف سطح آب پر ہوا چلتی رہتی ہے اُسی طرف ان نہروں کا بھی رُخ ہو جاتا ہے۔ اور بعض زمانۂ حال کے جغرافیہ دان اسی کو

ان انہار کے جاری ہو جانے کا اصلی سبب بتاتے ہیں کہ اور اصل بھی یہی ہے کہ ہوا سمندر کی سطح پر بہت بڑا اثر کرتی ہے۔ اور بہت سی سمندر کی چھوٹی چھوٹی نہریں محض ہوا کی رفتار سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ بحر ہند میں چونکہ ہوا کا رخ موسم کے ساتھ بدلتا رہتا ہے لہذا جس طرف کی ہوا ہوتی ہے اسی طرف ان نہروں کا بھی رُخ ہو جاتا ہے لیکن سمندر کی اندرونی یعنی سطح آب کے نیچے کی نہروں کے لیے یہ وجہ نہیں ہو سکتی۔ سمندروں کے بعض حصوں میں ہوا ہمیشہ شمال و مغرب کی طرف چلا کرتی ہے اور بعض مقامات پر جنوب و مغرب کی طرف۔ بس ان حصوں میں سب سے بڑی بڑی نہریں ہمیشہ مغرب ہی کی جانب بہتی ہیں۔ بعض مقامات پر نہریں مشرق کی جانب بھی جاری ہیں۔ مگر وہاں ہوا کا رخ بھی مشرق ہی کی طرف ہوتا ہے۔

عام قاعدہ ہے کہ زمین کی گردش کی وجہ سے کوئی چیز اگر کرۂ زمین پر حرکت کرتی ہو تو اگر وہ خط استوا سے شمال میں ہو تو داہنی جانب اور اگر جنوب میں ہو تو بائیں جانب کسی قدر ہٹ جائے گی۔ اسی وجہ سے یہ سمندر کی نہریں بھی جو مغرب کی جانب بہتی ہیں کسی قدر اپنے داہنے یا بائیں جانب مُڑ جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی زمین کا حصہ ملتا ہے جو روک کے اُن کا رُخ بالکل پلٹ دیتا ہے۔ اور وہ بجائے مغرب کی طرف جانے کے بالکل مشرق کی طرف منہ کر کے بہنے لگتی ہیں۔ بحر اٹلانٹک کی بڑی نہر مغرب کی طرف چلتی ہے۔ یہ اتنی بڑی ہے کہ چوڑائی میں خط استوا کے شمال اور جنوب دونوں جانب ہوتی ہے جو خط استوا کے شمال میں ہے وہ کسی قدر اپنے داہنے جانب ہٹ جاتی ہے۔ اور وہ بھی ساحل امریکہ سے ٹکرا کے اور دوسری طرف سے مُڑ کے مشرق کی طرف واپس ہوتی ہے۔

اگر کرۂ زمین پر تمام سمندر ہی سمندر ہوتا تو غالبًا ان سب نہروں کا رخ قریب قریب مغرب ہی کی جانب ہوتا۔ لیکن خشکی کے بڑے بڑے حصے سمندر کی سطح کے اوپر نکلے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے یہ نہریں شمال اور جنوب کی طرف مڑ جاتی ہیں کی طرح سے ایک دَور قائم رہتا ہے تاکہ قطبین کا سرد پانی خط استوا کے قریب آ کر یہاں کے پانی کی حرارت کو کم کرتا رہے اور خط استوا کے پاس کا گرم پانی وہاں جا کے کسی قدر حرارت پیدا کر دے۔

بحر اٹلانٹک کی شمالی نہر جب ساحل امریکہ سے ٹکرا کے اور خلیج میکسکو مین سے گھوم کے نکلتی ہے تو انگریزی جغرافیہ دان اسکو گلف اسٹریم یعنی خلیج کی نہر کہتے ہین یہی نہر بہتے بہتے برطانیہ کے جزائر اور شمالی یورپ کے ساحلون سے گذرتی ہوئی بحر منجمد شمالی مین پہونچ کے غائب ہو جاتی ہے۔ ملک ناروے کے بندرگاہ اسی کی وجہ سے سال بھر جہازون کی آمد و رفت کے لیے کھلے رہتے ہین۔ اگر اس کا گرم پانی وہان سے نہ گذرتا تو یقیناً سال کے زیادہ حصے مین وہان برف ہی برف ہوتی۔ کیونکہ بحیرۂ بالٹک کا دہانہ جو اس سے ۵۰۰ میل خط استوا کی طرف ہٹا ہوا ہے سال کے زیادہ حصے مین برف برف سے بند رہتا ہے اور بحیرۂ اسود جو اس سے بھی زیادہ خط استوا کی طرف ہٹا ہوا ہے وہ بھی جاڑون مین اکثر جم جاتا ہے۔ مگر ناروے کے بندرگاہ ہمیشہ کھلے رہتے ہین اور اُن کا سمندر کبھی نہین جمتا۔

اچھا اب اُس نہر کو دیکھو جو بحر منجمد شمال کی طرف سے بہتی ہوئی ملک لیبرڈر کے ساحل کے پاس سے گذرتی ہے۔ لیبرڈر اور انگلستان قریب قریب ایک ہی خط مین واقع ہوے ہین۔ یعنی خط استوا سے دونون کا فاصلہ قریب قریب برابر ہے اور اس لحاظ سے دونون جگہ سردی اور گرمی برابر ہونی چاہیے تھی۔ مگر انگلستان کے سواحل ہمیشہ برف سے صاف رہتے ہین اور لیبرڈر کے ساحل سال مین ۹ مہینے سے زیادہ برف کی وجہ سے بند رہتے ہین۔

بعض جگہ سمندر مین ٹھنڈی اور گرم نہرین مل جاتی ہین یہان اکثر کہرا پڑا کرتا ہے اور وہان کے پانی مین تلاطم بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔

عام سمندر کے پانی مین اور ان نہرون کے پانی مین اکثر اختلاف بھی ہوتا ہے۔ اگر نہر خط استوا کی طرف سے آتی ہے تو اُس کا پانی سمندر کے پانی سے زیادہ گرم ہوگا اور رنگ مین بھی کسی قدر زیادہ سیاہی مائل ہوگا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جہاز کے ایک طرف تو سمندر کا پانی ہے اور دوسری جانب نہر کا پانی۔ ایک طرف ڈول ڈال کے پانی نکالا جائے تو ٹھنڈا نکلے گا اور دوسری جانب اُس سے زیادہ گرم اور زیادہ سیاہی مائل۔ مگر ایسے مقامات سے جہاز کو بہت جلد نکال لے جاتے ہین کیونکہ وہان جہاز مین غیر معمولی حرکت ہونے لگتی ہے۔

یہ سمندر کی نہریں جن ملکوں میں ہو کے گذرتی ہیں وہاں کی آب و ہوا پر بھی بہت بڑا اثر ڈالتی ہیں۔ مثلاً انگلستان کے موسم میں اسی گلف اسٹریم کی بدولت ایک خوشگواری پیدا ہو گئی ہے ورنہ وہاں سردی بہت زیادہ ہوتی۔ تجارت کو بھی ان نہروں سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ بہت سے مقامات کی بندرگاہیں محض انھیں کے اثر سے جہازوں کی آمد و رفت کے لیے سال بھر کھلی رہتی ہیں ورنہ برف سے بند رہتیں۔ بعض مقامات پہ جہاز کو اپنی رفتار میں ان سے مدد ملتی ہے۔ مثلاً جو جہاز افریقہ کے جنوبی راس امید کے پاس سے ہو کر گذرتے ہیں اگر وہ انگلستان سے آسٹریلیا کی طرف جاتے ہوتے تو وہ ساحل سے بہت دُور ہٹ کے نکل جاتے ہیں تاکہ اُن کو اُس نہر میں ہو کے چڑھاؤ نہ کاٹنا پڑے جو وہاں ساحل کے قریب جاری ہے۔ اور جو جہاز انگلستان کی طرف جاتے ہیں وہ ساحل سے قریب قریب جاتے ہیں تاکہ اُنکو اپنی رفتار میں اُس کے بہاؤ سے مدد ملے

یہ نہریں خشکی کی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ بہت لمبی چوڑی ہوتی ہیں۔ گلف اسٹریم کی چوڑائی تقریباً ۴۰ میل ہے اور ۳۰۰۰ فٹ سے زیادہ گہری ہے بعض جگہ اس کی چوڑائی اس سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ پانی کے رنگ میں بھی ایک بہت ہی نمایاں اختلاف ہے کیونکہ اس کا پانی گہرے نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔

جاپان کے قریب سے جو نہر بہتی ہے اُس کا رنگ سیاہ ہے اور اسی وجہ سے وہاں کے لوگ اُسے "کوروسیوا" یعنی کالی ندی کہتے ہیں۔ یہ نہر بھی جاپان کو وہی سب فائدے پہونچاتی ہے جو گلف اسٹریم انگلستان اور ناروے کے موسم اور سواحل کو پہونچاتی ہے۔

غرضیکہ تمام دنیا کے سمندروں میں اسی طرح کی ہزاروں نہریں جاری ہیں جو ہمیشہ بہتی رہتی ہیں اور تمام جہان پہ اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

دنیا کا سب سے بڑا اسٹیمر ٹائٹانک جو سال ڈیڑھ سال قبل تباہ ہو گیا تھا محض انھیں انہار بحر میں سے ایک کی بدولت تباہ ہوا جو برف کا ایک بہت بڑا پہاڑ جو بیس بائیس میل لمبا چوڑا تھا اسکو گلف اسٹریم قطب شمالی سے بہا کر بحر اٹلانٹک میں لے اور جہاز مذکور اُس سے ٹکرا کر تباہ و برباد ہو گیا۔

الغرض یہ سمندر کی نہریں عجائباتِ قدرت میں سے ہیں جن سے دنیا بے انتہا فائدہ اٹھا رہی ہے۔

کہانت

کہانت کے لغوی معنی فال گوئی کے ہیں۔ اور اسی لیے اُس شخص کو جو غیب کی باتیں بتائے اور اپنے آپ کو مخفی اسرار سے واقف ظاہر کرے "کاہن" کہتے ہیں۔ اسلام سے پہلے تمام مذاہب کے حالات پر غور کیجیے تو صاف نظر آتا ہے کہ دینی پیشوائی اور مقتدائی کے لیے کہانت لازمی تھی۔

مصریوں کے مقتداؤں نے اپنے آپ کو نامعلوم اسرار و رموز کا خزانہ بنا رکھا تھا قوم بتوں، مگرمچھوں، بیوں، پرواؤں وغیرہ کی پرستش کرتی تھی۔ لیکن الٰہیات کے مسائل رموز باطنی کی طرح صرف مقتداؤں تک محدود تھے جو آداب مذہبی کی تعلیم کے ساتھ غیب کی باتیں بھی بتا دیا کرتے۔ بابل والوں نے رمل اور نجوم کے فن کو ہندوؤں کی طرح جزو دین بنا لیا تھا جس کی مدد سے وہ ہر امر من آیندہ کی بابت حکم لگایا کرتے۔ اُن کی اسی دینی جستجو نے علم ہیئت کو مدوّن کیا۔ کواکب کے اثرات اور اُنکے افعال و خواص مقرر کیے۔ اجرام فلکی کے نام رکھے۔ انکی حرکتوں کا پتہ لگایا اور باور کرا دیا کہ نجوم کے ذریعے سے جو الٰہیات سے وابستہ تھا انسان غیب کی باتوں کو بتا دیا کرتا ہے۔ ہندوؤں اور بابلیوں کے قدیم مسائل بہت ملتے جلتے ہیں۔ اور نجوم و الٰہیات کے لحاظ سے ضرور ماننا پڑتا ہے کہ یا تو نجوم و ہیأت کو بابلیوں نے ہندوؤں سے لیا یا ہندوؤں نے بابلیوں سے حاصل کیا لیکن چونکہ یہ امر تاریخ کا ایک طے شدہ مسئلہ ہو گیا ہے کہ آریہ لوگوں نے سمٹک لوگوں (بنی سام) کے بعد ترقی کی اس لیے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ بابل والوں کے علوم ہیأت و نجوم بعد کے زمانے میں پورے پورے ہندوؤں میں منتقل ہو آئے۔ اور اسی وجہ سے دونوں کی کہانت بھی ایک ہی قسم کی ہے۔ ہندو پنڈت پتّرہ دیکھ کے اور زائچہ کھینچ کے جس طرح بعد والی باتیں بیان کیا کرتے ہیں اسی طرح بابل کے پوجاری اور

مرتاض لوگ بھی بتایا کرتے تھے۔ آتش پرستوں میں بھی کہانت تھی۔ اور غالباً اُسی قسم کی ہوگی جیسی کہ اہل بابل میں تھی۔ اگرچہ اُن کی کہانت کے زیادہ مشرح حالات ہمیں نہیں معلوم ہو سکے۔

یونانیوں میں بھی کہانت تھی مگر بابل والوں کی کہانت سے بہت ادنی درجے کی۔ اگرچہ انھوں نے بھی ہیأت و نجوم کو حاصل کر لیا تھا مگر جہاں تک پتہ لگایا جاتا ہے یہ فنون اُن کے دین کے اصلی عنصر نہیں بننے پائے تھے۔ اُن کے کاہن بڑے بڑے مندروں کے پوجاری تھے۔ اور اُن کی کاہنہ عورتیں وہ کنواری لڑکیاں تھیں جن کی زندگی بتخانوں اور مندروں کی نذر ہو جاتی۔ اپالو کے مندر میں جو قدیم یونانیوں کا سب سے بڑا مندر تھا لوہے کی ایک تپائی پر یہ لڑکیاں برہنہ کر کے بٹھائی جاتیں اور نیچے کچھ بخور سلگا دیے جاتے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس لڑکی کے دماغ پر کچھ ایسا اثر پڑتا کہ حواس مختل ہونے لگتے۔ اور بیہوشی کے عالم میں وہ بکنا شروع کرتی۔ اُس کے الفاظ پر مجذوبوں کی بڑ کی طرح غور کیا جاتا اُن میں طرح طرح کے معنی پہنائے جاتے۔ اور اُنھیں سے اپنی آرزوؤں اور مرادوں کے موافق یا مخالف جواب حاصل کر لیا جاتا۔ یہی یونانیوں کی وہ فالیں تھیں جنکا اگلے دنوں بڑا شہرہ تھا۔ اور جنکے سچ ثابت ہونے اور پورے اُترنے پر اکثر قدیم مورخین عقیدتمندانہ حیرت ظاہر کرتے ہیں۔

رومی چونکہ علوم و فنون کی طرح مذہب میں بھی یونانیوں کے پیرو تھے اور اپنے دیوتاؤں کی کہانیوں۔ اُنکے حالات و خیالات اور واقعات کو یونانی دیوتاؤں کے موافق ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے اس لیے اُن کی کہانت بھی یونانیوں کی کہانت سے ملتی ہوئی تھی۔ یہ بات لطف سے خالی نہیں ہے کہ مشرق و مغرب کی کہانت میں ایک نمایاں فرق تھا۔ مشرق میں بابل والوں ایرانیوں اور ہندوؤں سب میں کہانت کا دارومدار ایک باضابطہ فن نجوم پر تھا۔ اور کسی برکت و نعمت کے حاصل کرنے یا کسی مصیبت و آفت کے دُور کرنے کی تدبیریں بھی یہ مشرقی لوگ انھیں فنون کے اصول کی پابندی میں کیا کرتے تھے۔ بخلاف اسکے یونانیوں اور رومیوں کی کہانت کو مجذوب پرستی سے زیادہ وقعت نہیں حاصل تھی۔

بنی اسرائیل میں بھی کہانت تھی۔ مگر اُنکی کہانت بالکل جداگانہ تھی۔ اُن میں حضرت ابراہیمؑ اور جناب موسیٰؑ کی تعلیمات نے نبوت کی ایک خاص شان پیدا کردی تھی۔ حضرت موسیٰ کے بعد سے اُن میں نبیوں کے پیدا ہونے کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا تھا۔ جو عابد وزاہد نیک نفس و پاک باطن لوگ ہوتے اور ریاضت و اتقا کے ذریعے سے تزکیۂ نفس کیا کرتے۔ ان لوگوں کو مراقبے میں مکاشفہ ہوتا۔ اور جو باتیں اُن سے پوچھی جاتیں اُن کا جواب گویا وہ خدا سے پوچھ کے دیا کرتے۔ اور اپنے آپ کو اسرار باطن اور رموز ربانی سے واقف ظاہر کرتے۔ انھیں انبیا کا طریقہ اُن کے کاہنوں نے بھی اختیار کیا۔ اور جب انبیا نہ ہوتے یا بعد کے ایام میں جب نبیوں کے مبعوث ہونے کا سلسلہ موقوف ہوگیا تو ہر جگہ اور ہر زمانے میں اُن کے مرتاض و نفس کش مقتدا آنکھیں بند کرکے عالم ملکوت کی سیر کرتے۔ اور قوم کو اُس کے خیالات وعقائد کے مطابق عجیب قسم کے تحکمانہ لہجے اور انوکھے دلچسپ الفاظ میں بتا دیا کرتے کہ اس معاملے میں یہ ہوگا۔ اور یہ بات یوں ہونے والی ہے۔

اس قسم کی کہانت دوسری قدیم قوموں میں بھی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ساری مشرقی و مغربی قوموں میں اسی قسم کے غیب دان اور اسرار باطنی کے جاننے والے کاہن ریاضت و مجاہدۂ نفس کے ذریعے سے پیدا ہوا کرتے تھے۔ ادھر بابلیوں اور ہندوؤں میں بھی جہاں نجومیوں اور اجرام فلکی کے اثر جاننے والے پنڈتوں کا زور تھا وہاں ایسے مرتاض اور تارک الدنیا اشخاص بھی موجود تھے جن کے لہجے اور طرز گفتگو سے ظاہر ہوتا کہ مبدأ فیاض کی طرف سے غیب کی باتیں اور مشکل سے مشکل مسائل کے حل اُن کے دلوں پر القا ہوجاتے ہیں اور الہام کے ذریعے سے انکو معلوم ہوجایا کرتا ہے کہ آیندہ یہ ہونے والا ہے۔ اور فلاں شخص کی قسمت میں یہ لکھا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یونانیوں اور رومیوں میں بھی مندروں کے معمولی پوجاریوں کے علاوہ اس قسم کے رموزِ باطن جاننے والے راہبوں اور عزلت گزینوں کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس قسم کی کہانت کا آغاز تاریخی طور پہ بنی اسرائیل کے انبیا اور کاہنوں ہی سے

شروع ہوا - اگرچہ آخر مین یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابل کے صابئی لوگون کی کہانت
بنی اسرائیل پر غالب آگئی تھی - اسی کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ سحر بابل کی ساری دُنیا
مین شہرت ہوگئی اور عیسائی حضرت مسیح کی پیدایش سے پیشتر ہی اُنکی آمد کا منتظر
اور اُنھین ایک ستارے کے ذریعے سے پہچان کے ایمان لانے والا چند بابلی کاہنون
ہی کو بتاتے ہین جیسا کہ اناجیل مین مذکور ہے -

یہ کہنا کہ یہ زاہد و مرتاض لوگون کی کہانت کس قوم سے شروع ہوئی اور
کس ملک نے کس سے لیا فضول ہے - اس لیے کہ یہ ایک فطرتی چیز تھی - انسان
کی فطری کرشمہ پرستی اُسے ہر جگہ پیدا کر لیتی تھی - یہ پُرانا خیال ہے کہ روح چونکہ
لطیف اور مخفی شے ہے اس لیے وہ ہر مخفی راز کا پتہ لگا سکتی اور اسرار سرمدی
کے ہر حرم مین پہونچ سکتی ہے بشرطیکہ اُس کا تزکیہ کیا جائے جسمانی تقاضون
سے مبرا کر لی جائے اور اُس مین خلوص پیدا ہو جائے - اسکے ساتھ انسان
کی فطرت ہے کہ وہ جس جگہ اپنی تدبیرون مین عاجز آتا ہے نامعلوم ذرائع ڈھونڈھنے
لگتا ہے - اور بڑی بے صبری کے ساتھ جویا ہوتا ہے کہ کوئی اس مشکل کا دفعیہ
بتا دے - لہذا ہر وحشی سے وحشی قوم مین نوع انسان کے اس فطری تقاضے نے
کہانت کو کسی نہ کسی عنوان سے ضرور پیدا کرا دیا -

عرب کے بت پرستون سے جاہل کون ہوگا جنکی بت پرستی نہایت ہی
مزخرف اور بے اصول طریقے کی تھی - مگر اُن مین بھی ہر جگہ کاہن موجود تھے - پھر
اُس کے بعد جزیرہ نماے عرب مین بیرونی مذاہب کا ہجوم روز بروز بڑھتا گیا
پارسی بھی تھے، یہودی بھی تھے، عیسائی بھی تھے - اور تو اور بابل کے مہذب بت
پرست جو اپنے آپ کو سب سے بڑا موحد خیال کرتے ساری دنیا مین فنا کر دیے
گئے تھے اور عراق مین اُن کا نام و نشان بھی نہین باقی رہا تھا مگر ارض حجاز مین
وہ بھی موجود تھے - اور اُن سب کے کاہن عرب مین ہر جگہ موجود تھے اور
کہانت کا کام اختیار کرتے ہی وہ مذہب کی طرف سے کچھ ایسے غیر متعصب ہو
جاتے کہ سب قومین عام اس سے کہ کسی مذہب سے وابستہ ہون بلا لحاظ مذہب
اپنی مشکلین لے کے اُنکے سامنے آتین اور وہ اُنکو ایسے جواب دیتے کہ اُنکی تسلی

وتشفی ہو جاتی - اور اپنے نزدیک کامیاب اور بامراد ہو کے اپنے گھروں کو واپس جاتیں - اُن دنوں عرب کی اصلی حکومت اگر سچ پوچھیے تو اُنھیں کاہنوں کے ہاتھ میں تھی - جنکے سامنے نہ کسی سردار قبیلہ کی چلتی اور نہ کسی تاجدار و فرمانروا کی -

جاہلیت عرب کے کاہنوں کے احکام والفاظ اگر ایک جگہ جمع کر دیے جائیں تو ایک عجیب قسم کا پُر لطف لٹریچر بن جائے گا - جن کے الفاظ میں غیر معمولی لطافت معنی خیزی - فصاحت وبلاغت - قافیہ بندی - اور پیغمبرانہ حکومت ہوتی - اور ایسا معلوم ہوتا کہ جس شخص کی زبان سے وہ الفاظ سنے جاتے ہیں وہ نہیں بول رہا ہے بلکہ اُس کے جسم کے اندر سے کوئی فرشتہ باتیں کر رہا ہے - اس قسم کے صدہا کاہن اور صدہا کاہنہ عورتیں ارض عرب کے مشہور مقامات میں پھیلی ہوئی تھیں جن کے پاس دور دور سے بڑے بڑے قافلے اپنی آرزوئیں اور تمنائیں لے کر آیا کرتے اور شادکام و مطمئن واپس جاتے - جس طرح یونانی مندروں کی فالوں کی نسبت بتایا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ پوری اُترتیں اُس سے زیادہ حیرت سے ہم دیکھتے ہیں کہ عرب کے کاہنوں اور کاہناؤں کے احکام پورے اُترا کرتے تھے - اور بعض موقعوں پر تو اُنھوں نے ایسے سچے حکم لگائے اور اس طرح غیب کی باتیں بیان کر دیں کہ اگر ان واقعات کو سچ تسلیم کر لیا جائے تو اُن غیب کی باتیں بتانے والوں کی غیب دانی کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی -

اگلی دنیا چونکہ اُن تمام واقعات کو باور کرتی تھی لہذا ادنیٰ و اعلیٰ - جاہل و عالم سب نے تسلیم کر لیا کہ انسان کسی ذریعے یا کسی ریاضت سے ایسا کمال حاصل کر لیا کرتا ہے کہ غیب کی باتیں بتا دے - اور جب یہ مان لیا گیا تو ہر شخص اپنے مذاق و خیالات کے مطابق اس کی توجیہیں بھی کرنے لگا -

چنانچہ یونانیوں اور رومیوں نے باوجود فلسفہ و منطق میں اعلیٰ نمود حاصل کرنے کے اس امر کو قبول کر لیا کہ انسان غیب کی باتیں بتا سکتا ہے - بعض نے اسکی یہ توجیہ کی کہ نفوس انسانی تصفیۂ باطن کے ذریعے سے اسرار فطرت سے واقف و آگاہ ہو جاتے ہیں - اور جیسا وہ چاہتے ہیں ویسا ہی ہو جایا کرتا ہے - اس لیے کہ اُن کے خیال میں تمام اشیا کی صورتیں مثل افلاطون کی رو سے عالم کلی میں موجود تھیں

جہان تک بار پانے کے بعد انسان اُن پر تصرف بھی کر سکتا تھا۔ یہ تو اعلیٰ درجے کے نازک خیال علمائے روحانی کا خیال تھا۔ مگر بعض نے کہدیا کہ روحین جو جسمون کے قفس سے آزاد ہین اور نیز اجنہ اُن کے بس مین ہو کے اُن کے مؤکل بن جاتے ہین اور وہی اُنھین رموز غیب سے آگاہ کردیتے ہین۔

عیسائیون نے جو قرون وسطی مین کہانت کے تماشے اور ولایت کے کرشمے سب سے زیادہ دکھایا کرتے تھے اپنے کاہنون کی غیب دانی اور اُنکے تصرفات باطنی کا یہ اصول قرار دیا کہ حضرت مسیح خدا ہونے کی وجہ سے غیب کی باتین جانتے تھے۔ لہذا اُن کا نفس ربانی جس پر اثر کرے وہ بھی اُن رموز باطنی سے واقف ہو جاتا ہے۔ قطع نظر اسکے مسیحیون مین علم کا دیوتا یا خدا روح القدس ہے۔ اور جسے کچھ بھی معلوم ہو یا کسی قسم کا علم حاصل ہو اُس کی نسبت سمجھا جاتا ہے کہ اُسپر روح القدس نے آکے اپنا کمال دکھایا ہے۔ اور اگلے دنون چند روز تک سچے اور خالص العقیدہ مسیحیون پر روح القدس کے آنے کی بھی شان رہی جو شان کسی کے سر پر کسی جن یا پریت کے آنے کی ہوتی ہے۔ اس لیے غیب کی باتین بھی مسیحیون کے خیال کے مطابق روح القدس آکے مقدس لوگون کی زبان سے ظاہر و آشکارا کردیا کرتا تھا۔

صابئی لوگون مین غیب دانی وکہانت کی یہ تھیوری تھی کہ ازریاسیس اور آداس اول و دوم جن سے مراد ہرمس اور اغاثیمون ہین اصلی دانایان غیب تھے۔ اُنکو صابئی لوگ اپنے مذہب کے پیغمبر بتاتے تھے۔ انھین کی توجہ و برکت سے اولوگ بھی غیب کی باتین جانتے ہین۔ خلاصہ یہ کہ یہی لوگ اُنکے روح القدس تھے جنکا فیض بعد والون کو بھی غیب دان بنادیا کرتا۔ اس سے اُن کو تعلق اُنکا رہا کہ اجنہ یا مؤکل ندروحین آکے انسان کو غیب کی باتین بتاتی ہین۔ بلکہ اُن کا خیال تھا کہ مذکورہ پیغمبرون کو مجاہدہ و تزکیۂ باطن کے ذریعے سے ایسی صفائے قلب حاصل ہوگئی تھی کہ اسرار غیب سے مطلع ہو گئے تھے۔

کہانت کا سکہ قدیم الایام مین اس قدر بیٹھا ہوا تھا کہ اس عہد کے فلسفی اور علمائے طبیعی بھی کاہنون کی غیب دانی کے قائل تھے۔ اور اس کی توجیہ

یہ کرتے کہ کہانت ایک لطیف جذبۂ نفسانی ہے جو صفائی قلب اور نفسانی قوت اور حس کی لطافت سے انسان مین پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض نے اُسے علم نجوم اور آثار فلکی سے وابستہ کرکے کہا جو بچہ ایسے طالع مین پیدا ہو کہ عطارد محل شرف پر ہو۔ اور باقی سیارات ستہ بھی اچھے عقد مین ہون اور عمدگی سے ایک دوسرے کی طرف ناظر اور متواضع واقع ہون وہ لڑکا ان ستارون کے اثر سے لازمی طور پر کاہن اور غیب دان ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ اسکے طرفدار اور ماننے والے علماے روحانیین تھے۔ جن کا بیان تھا کہ نفس ناطقۂ انسانی جب قوی اور زبردست ہوتا ہے تو وہ طبیعت کو مغلوب کرکے دبا دیتا ہے۔ اور انسان پر لطیف راز کو آشکارا کرکے ہر رمز معنوی سے واقف کر دیتا ہے۔ یہ کہتے ہین کہ انسان مین دو چیزین ہین روح اور جسم۔ جسم بغیر روح کے کوئی چیز نہین۔ جب روح نہ ہو تو اُس مین نہ قوت ہوتی ہے اور نہ عقل و فہم۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حس و حرکت اور ادراک و فہم سب چیزین روح مین ہین۔ اور روحون کی مختلف حالت ہے۔ بعض مین حس زیادہ ہوتی ہے۔ بعض مین دانائی زیادہ ہوتی ہے بعض مین جلاء اور روشن ضمیری بڑھی ہوئی ہے۔ لہذا جس روح مین روشن ضمیری زیادہ ہو اُس پر عجیب عجیب انکشافات ہوتے ہین۔ اور اسرار غیب کو وہ معلوم کر لیتی ہے۔

بہر حال دُنیا انھیں اختلافات مین پڑی ہوئی تھی۔ اور اُس کے ساتھ طرح طرح کے خرافات بڑھتے اور پھیلتے چلے جاتے تھے جن کو انسانی عقل کی کمزوری اور بڑھا رہی تھی۔ اور بجاے اسکے کہ تحقیق و تنقید سے کام لے کے کوئی نتیجہ حاصل کیا جائے لوگ اُس کی توجیہین کرتے اور طرح طرح کے معنی پہنا کے کہانت کو اور چمکاتے جاتے تھے۔

یہان تک کہ دنیا مین نور اسلام چمکا۔ اور خدا نے ہر چیز کو ایک نئی روشنی مین دکھا کے تمام اگلی غلط خیالیون کو دُور کر دیا۔ اسلام نے صاف کہدیا کہ غیب کو سوا خدا کے کوئی نہین جانتا۔ اور غیب دانی کے جو کچھ دعوے کیے جاتے ہین سب لغو۔ مہمل اور بے سروپا ہین۔ اس طریقے سے اسلام نے اپنے ظہور کے

ساتھ ہی نجوم و کہانت کا چراغ گُل کر دیا۔ اور اس قسم کے مدعیان غیب دانی کا زور کلیۃً توڑ دیا گیا۔ یہ اصلاح سچ یہ ہے کہ اسلام کے اوّلیات میں سے ہے یعنی ایسے وقت میں جبکہ سارے عالم پر کہانت کی حکومت تھی اور دینی پیشوائی کا لازمی جوہر غیب دانی تھا اور دنیا میں کسی کی نظر اُسکے ابطال کی طرف نہیں گئی تھی۔ یک بہ یک اسلام کی طرف سے اس بات کا ڈھنڈھورا پٹ گیا کہ عالم الغیوب سوا خدا کے کوئی نہیں اور جو کوئی اس کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔

بے شک خود جناب سرور کائنات صلعم نے چند غیب کی باتیں یا بعض پیشین گوئیاں فرمائیں لیکن اُن کی نسبت صاف طور پر بتا دیا گیا کہ خدا نے فرشتے کو بھیج کر اپنے پیغمبر کو اُن سے آگاہ کر دیا۔ دراصل وہ خدا کی غیب دانی کا جلوہ تھا اُسے حضرت رسالتؐ کی غیب دانی ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ اور جب آنحضرتؐ کی وفات کے بعد جبرئیلؑ کے آنے کا سدباب اور سلسلۂ نبوت کا اختتام ہو گیا تو پھر کوئی وجہ ہی نہیں باقی رہی کہ دنیا میں کوئی شخص اسرار غیب سے واقف ہونے اور آیندہ کی باتیں بتانے کا دعوے کر سکے۔

بہرحال اسلام نے نجوم و کہانت کو بیخ و بنیاد سے اُکھاڑ کے پھینک دیا۔ مگر افسوس چند روز بعد اسلام کے زہاد و عباد نے اسلامی مذاق کے سادے بے ریا اور غیر مضر زہد و تقویٰ کو چھوڑ کے قدیم مذاق کے متصوفانہ زہد و عبادت کو اختیار کر لیا۔ ولی اللہ کا عام لفظ جو ہر دیندار کے لیے تھا عباد و زہاد کے ایک خاص گروہ کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ اور اُن میں نیک نفسی و اتقا اور اعمال و افعال کے بدلے کرامات اور غیب دانی کے کرشمے ڈھونڈھے جانے لگے۔ اور مجذوبوں کے الفاظ میں معنی پہنائے جانے لگے تو وہی کہانت جس کے استیصال کے لیے اسلام آیا تھا خود اسلام میں پیدا ہو گئی۔ اور جاہل تو جاہل اکثر پڑھے لکھے مسلمان بھی صوفی سالکوں اور مجذوبوں کے پاس اُنھیں مقاصد و اغراض کو دل میں لے کے جانے لگے جن کے واسطے اگلی قومیں اپنے کاہنوں۔ نجومیوں۔ اور بتخانوں کے پجاریوں کے پاس جایا کرتی تھیں۔

اصل یہ ہے کہ بعد کی آمیزشوں نے نہ اسلام ہی کو وہ اسلام باقی رکھا

جسے حضرت رسالت (روحی فداہ) لائے تھے۔ اور نہ اُسکے مقتداؤن ہی کو ویسا رہنے دیا جیسے مقتدا کہ اسلام کے لیے ہونے چاہیے تھے۔ افسوس۔

معراج

مسلمانون مین سرور کائنات صلعم کی معراج کا تسلیم کرنا نہایت ہی اہم عقیدۂ دینیہ مین ہے۔ جس مین آنحضرت صلعم کو خدا کے فرشتے جبرئیل نے مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک کی اور پھر وہان سے آسمانون کی۔ سارے ملاء اعلیٰ کی اور جنت و دوزخ کی سیر کرائی تھی۔ آپ نے جنت کی نعمتین اور دوزخ کے عذاب اپنی آنکھون سے دیکھے تھے۔ اور آسمانون پر انبیاے سلف۔ فرشتون اور حورون سے ملے تھے۔ اس معراج کے مفصل و مشرح حالات احادیث مین موجود ہین (صحابہ کے زمانے مین بہت سے مستند و معتبر لوگون کے نزدیک یہ معراج روحانی تھی۔ یعنی آپ کا جسد انور اسی دُنیا مین رہا اور روح اطہر ملاء اعلیٰ کی سیر کو گئی تھی۔ مگر بعد کے زمانے مین معراج کے روحانی ہونے کا خیال کم ہوتا گیا اور عام اہل اسلام معراج جسمانی کے قائل و معتقد ہوتے گئے۔ یہان تک کہ آخری صدیون مین یہ حال ہوگیا کہ جو مسلمان معراج کو روحانی بتائے وہ ملحد و بے دین ہے۔ چنانچہ سر سید نے جب بعض اکابر صحابہ کی پیروی مین معراج کے روحانی ہونے کا مسئلہ چھیڑا تو ہر طرف سے اُن کے کافر و بے دین ہونے کی صدائین بلند ہوئین۔ مگر معراج روحانی ہو یا جسمانی اس مین شک نہین کہ اُس نے دنیا مین بڑا کام کیا۔ اور آنحضرتؐ کے ذریعے سے گویا سارے مسلمانون کو عالم بالا اور واقعات مابعد الموت کا مشاہدہ ہوگیا)

ہم اس موقع پر معراج کی تفصیل اور اُس کی شرعی حیثیت سے بحث کرنا نہین چاہتے۔ ہمین اس وقت اس بات پر غور کرنا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے معراج کا خیال کسی اور قوم مین بھی تھا یا نہین۔ یا آنحضرت صلعم کے بعد کون لوگ معراج کے مدعی ہوے ہین۔ اسلام کی زیادہ باتین اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے ملتی جلتی ہین۔ جسکی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کسی نئے دین کے لانے کے مدعی

نہ تھے۔ بلکہ آپ کا دعوے یہ تھا کہ دین حق جس کی تبلیغ آدمؑ و نوحؑ اور ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دیگر پیمبران سلف کرتے آئے تھے وہی دین اسلام ہے۔ اصل دین مین کسی قسم کی ترمیم نہین کی گئی بلکہ بعد والون نے دین مین جو رد و بدل کر دیا تھا اور جو بدعات بعد کو رواج پا گئے تھے اُن کا استیصال کیا گیا۔ الغرض اس مین شک نہین کہ شریعت اسرائیلی کی زیادہ باتین اسلام مین موجود ہین۔ مگر توراۃ و انجیل مین جہان تک ہمارا خیال ہے اور کسی پیغمبر کو معراج ہونے کا ذکر نہین ہے۔

دیگر مذاہب سلف کی کتابون مین بھی اس قسم کی کسی آسمانی سیر کا تذکرہ نہین۔ روم و یونان کے بت پرستون کو سچ یہ ہے کہ معراج کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لیے کہ اُن کے عہد اولین کے دیوتا (وہ انسان جو دیوتا بنا دیے گئے) ایسی زبردست روحانی قوت رکھتے تھے کہ جب جی چاہتا بام فلک پر چڑھ جاتے اور سروشتان والون سے مل آتے۔ مصر اور بابل و اسیریا والون مین ہمین اس قسم کی کوئی معراج نہین ملتی۔ ممکن ہے کہ اُن مین کسی کو معراج ہوئی ہو مگر افسوس کہ ہم کو اُنکے مذہب و عقائد اور اُن کی قومی روایات کا بہت ہی محدود حصہ معلوم ہے۔ لیکن اس مین شک نہین کہ معراج کا خیال پہلے پہل اسی سرزمین مین سنا گیا۔

زرتشت کی نسبت اکثر کہا جاتا ہے کہ اُسے معراج ہوئی تھی۔ مگر معراجِ زرتشت کا واقعہ اس قدر مختصر بتایا گیا ہے کہ اُسکی تفصیل کے متعلق کوئی رائے نہین قائم کی جا سکتی + مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانے مین آتش پرستون کے مذہب مین اس خیال کو بہت اہمیت دی گئی۔ یہان تک کہ سکندر کے بعد مملکت عجم مین جو طوائف الملوکی قائم ہو گئی تھی اُسے جب اردشیر بابکان نے دفع کر کے سارے ملک کو اپنے زیرنگین کیا اور اصلی مذہب زرتشتی کا پتہ لگانا چاہا تو اُسے بھی معراج ہی کی زبان لگا کے عالم بالا کے حالات معلوم کرنا پڑے۔

طوائف الملوکی کے زمانے مین دینِ زرتشتی غارت ہو گیا تھا۔ سلطنت کے ساتھ مذہبی اتحاد بھی مٹ گیا تھا۔ ہر شہر اور ہر گروہ کا نیا مذہب تھا۔ اور سب اپنے عقائد کو زرتشت کا اصلی مذہب خیال کرتے تھے۔ چونکہ مباحثہ اور استدلال

کے ذریعے سے سب مین اتحاد پیدا کرنا دشوار تھا اس لیے اردشیر بابکان نے یہ نیا طریقہ ایجاد کیا کہ اپنی ساری قلمرو کے شہرون اور اضلاع مین حکم جاری کیا کہ ہر ضلع اپنے کسی ایسے شخص کو منتخب کر کے اُس کے دربار مین بھیجے جو سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہو۔ اس طریقے سے ملک کے ایک سو منتخب اور مسلم الثبوت عابد و زاہد اُس کے دربار مین جمع ہوے۔ تب اُس نے کہا کہ تم سب اپنے مین سے ایسے دس آدمی منتخب کر دو جن کو اپنے گروہ مین سب سے زیادہ پاک اور عبادت گزار جانتے ہو۔ اور جب یون دس عابد چُن لیے گئے تو اُن دسون سے کہا کہ اب تم اپنے مین سے کسی شخص کو چُنو جو سب سے اعلیٰ و افضل اور سب سے بڑا خدا شناس و خدا پرست ہو۔ اس طریقے سے ایک ایسا شخص منتخب ہو گیا جو اردشیر بابکان کے خیال کی ساری دنیا سے زیادہ افضل اور زہد و تقویٰ مین بے مثل و بے نظیر تھا۔ اس شخص کا نام ویراف تھا۔

اس انتخاب کے بعد اردشیر نے ویراف سے کہا "مین چاہتا ہون کہ تمھین اُس دوسرے عالم مین بھیج کے وہان کے سچے حالات اور سچا دین الٰہی معلوم کرون۔" ویراف نے طالب حق بادشاہ کی خواہش قبول کی۔ اور اُس کے روحانی سفر کی تیاریان ہونے لگین۔ ایک بڑے حلقے مین آگ روشن کی گئی۔ اُس کے درمیان مین ایک تختہ بچھایا گیا۔ اور اُس تختے پر ویراف بھنگ یا اور نشئی دوا کھلا کے لٹا دیا گیا اور وہ سوؤن عابد جو سارے ملک سے منتخب ہو کے آئے تھے اور نیز ویراف کی پارسا بہنین گرد بیٹھ کے خدا سے دعا کرنے لگین کہ ویراف کے ذریعے سے دنیا کو عالم آخرت اور سروشستان کا حال معلوم ہو جائے۔ یہ سب لوگ تین شبانہ روز تک یونہین دعا و عبادت مین مشغول رہے۔ اور ویراف آگ کے درمیان مین غافل و مدہوش پڑا رہا۔ آخر تیسرے چوتھے دن اُس نے بیدار ہو کے سر اُٹھایا۔ سب نے دوڑ کے اُسے آگ کے حلقے سے باہر نکالا اور بے صبری کے ساتھ پوچھنے لگے کہ "آپ نے کیا دیکھا؟" اُس نے کہا کہ "پہلے مجھے کھانا کھلا دو پھر بیان کرون گا۔ اس لیے کہ بھوک کی شدت سے مین بے دم ہو رہا ہون۔ فوراً کھانا سامنے لا کے رکھ دیا گیا۔ اور جب وہ کھا پی کے بیٹھا اور اُسکے حواس ذرا

ٹھکانے ہوے تو اردشیر کی طرف مخاطب ہو کے کہنے لگا "اے بادشاہ میری آنکھ بند ہوتے ہی عالم بالا کا ایک سروش (فرشتہ) آیا اور مجھے ہاتھ پکڑ کے اوپر لے گیا۔ جہان اُس نے دوزخ و جنت کی سیر کرائی۔ اور دکھایا کہ نیکوکارون کو اعمال نیک کے ثواب مین کس طرح اور کیسی کیسی نعمتین اور لذتین حاصل ہو رہی ہین اور بدکارون کو بدکاری کی پاداش مین کس کس طرح اور کیسی کیسی سخت ایذائین اور تکلیفین پہونچ رہی ہین۔ اسی سلسلے مین اُس نے مذہب زرتشتی کی صحت اور اُس کے باعثِ نجات اخروی ہونے کے ثبوت دیے ہین۔ ساری نیکیون کے ثواب اور جزا کی صورتین اور اُسکے مقابل ساری بدکاریون کی سزائین بتائی ہین۔ الغرض مذہب زرتشتی کی تمام چیزین جو عالم آخرت سے تعلق رکھتی ہین سب بہ تفصیل ظاہر کر دی ہین۔

ویراف کا یہ روحانی سفرنامہ بڑی تفصیل کے ساتھ پہلوی زبان کی ایک کتاب مین درج ہے جو "ویراف نامہ" کہلاتی ہے وہ اصلی پہلوی خط مین مع انگریزی کے ساتھ لندن مین چھپی ہے۔ اور پارسیون مین بہت مقبول ہے۔ یہ کتاب اگر صحیح روایات سے اور سند کے ساتھ اسلام سے پیشتر کی ثابت ہو جائے تو اس بات کے کہنے کی گنجایش ہے کہ اسلام مین حضرت سرور کائنات صلعم کی معراج اسی ویراف نامے سے ماخوذ یا آپ کی سیر عالم بالا ویراف کے سفر افلاک کی نقل ہے۔ لیکن ویراف نامہ ایک ایسی کتاب ہے جو آج سے چھ سات صدیون پیشتر بالکل مجہول اور نامعلوم تھی۔ پہلے پہل اُس کا ایک نسخہ ہندوستان کے شہر نوساری مین جسے پارسیون نے اپنا مرکز قرار دے لیا تھا کسی پارسی موبد کے پاس ملا۔ اُس سے پیشتر نہ کسی کو اس کا نام معلوم تھا اور نہ کبھی قدیم الایام مین کسی کی زبان سے اسکا تذکرہ سُنا گیا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اُن کی کتاب دساتیر کو بعد والے پارسیون نے تصنیف کر کے اپنی پرانی آسمانی کتاب بتا دیا اُسی طرح اُس کتاب کو بھی کسی شخص نے تصنیف کر لیا۔ لہذا بجاے اسکے کہ آنحضرت کی معراج اُس سے ماخوذ ہو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ہمارے پیغمبر عربی کی معراج سے حاصل کی گئی ہے۔

لیکن بڑے لطف کی یہ بات ہے کہ تیرہوین صدی عیسوی یعنی ساتوین یا آٹھوین

صدی ہجری مین ایطالیہ کے ایک رومی شاعر ڈینٹ نے الیگری میں اپنی معراج کا واقعہ منظوم کیا ہے جس مین معراج سرور کائنات سے فائدہ اُٹھاکے شاعرانہ طبع آزمائی کی اور خیال آرائی کی گئی ہے - اور اُس سے دین مسیحی کو فائدہ پہونچایا گیا ہے - یورپ مین اس نظم کی بہت تعریف کی جاتی ہے - اور اُسے لوگ اعلیٰ ترین طباعی وخیال فریبی کا نمونہ بتاتے ہین -

اس نظم مین ڈینٹ کہتا ہے کہ انسانی دانائی (ورجل شاعر) کی صورت مین آکے میری رہبر ہوئی - جسے آسمانی دانائی (بیٹرس دیوی) نے میری مدد پر آمادہ کیا در نور بخشنے والی حور (لوشیا) کے ذریعے سے ورجل کے پاس یہ حکم بھیجا - اور لوشیا کو (رحمتِ الٰہی) نام ایک دیوی نے بیٹرس کے پاس اسی غرض کے لیے بھیجا تھا -

الغرض ڈینٹ کو ایک روحانی خواب مین ورجل اس عالم سے باہر نکال لیگیا۔ بہت دور تک ادھر اُدھر پھرنے کے بعد وہ ایک تیرہ و تار جنگل مین جا پھنسا جہان کی ہر چیز سے وحشت ہوتی تھی اور مہیب درندون اور وحشی جانورون کو دیکھ دیکھ کے وہ انپ رہا تھا - اب اُسے دوزخ کی حالت دکھائی گئی جسے اُس نے اپنے خیال مین دامن کوہ صیہون مین ایک بڑے بھاری غار کی صورت مین دیکھا - اسکے کنارے چکنے اور آسانی سے گذرنے کے قابل نہین ہین بلکہ چارون طرف زینون کے حلقے پھیلتے چلے گئے ہین جو جس قدر نیچے ہوتے جاتے ہین اُسی قدر تنگ بھی ہوتے جاتے ہین - زینون کا ہر حلقہ اس قدر وسیع اور دوسرے سے الگ ہے کہ بجاے خود ایک طبقۂ جہنم ہے - اور انھین اسباب سے اس غار میں اُترنا یا اُس سے نکلنا بغیر اسکے کہ تائید ایزدی رفیق حال ہو غیر ممکن ہے -

پہلا حلقہ "لمبو" کہلاتا ہے - اس مین وہ تمام لوگ ہین جنکو بپتسمہ نہین نصیب ہوا اور جو حضرت مسیح سے پیشتر تھے - باقی تمام حلقے گنہگارون کے عذابون کے نمونے پیش کر رہے ہین - جس گنہگار کا جتنا بڑا گناہ ہے وہ اُتنے ہی زیادہ گہراؤ اور زینے کے نشیبی حلقے مین ہے - اور جس قدر زینے تنگ اور گہرے ہوتے جاتے ہیں اُسی قدر عذاب بڑھتا جاتا ہے - ان مبتلاے عذاب گنہگارون مین ڈینٹ نے بہت سے

پُرانے تاریخی مجرموں کو دیکھا جو طرح طرح کے عذاب بُھگتے نظر آئے۔

اس دوزخ میں اُس نے خون کی ندّیاں دیکھیں۔ خوفناک عفونتوں کو برداشت کیا۔ قیر کی ایک جھیل دیکھی۔ مبتلائے عذاب روحوں کے غول دیکھے جن میں سے بعض ہوا میں معلق ہیں۔ بعض برف میں دفن ہیں۔ بعض درختوں میں مقید ہیں۔ ناامیدی کی آہیں۔ اور درد و تکلیف کی چیخیں کانوں میں گونج رہی ہیں۔ بہت سے مجرم مختصر الفاظ میں اپنی دہشت ناک سزائیں اور اپنے گناہوں کی سرگذشتیں بیان کر رہے ہیں۔ اور عجیب عجیب قسم کی حسرتناک داستانیں اور خدا کی عظمت و کبریائی کی باتیں سننے میں آرہی ہیں۔

اس غار کے انتہائی نشیب میں شیطان ہے۔ جو ایک خونخوار موذی ہے اُسکے تین سر ہیں۔ اور ہر منہ سے کسی گنہگار آدمی کی ہڈیاں چبا رہا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ یہوداسخریوطی (وہ حواری جس نے دغا بازی کر کے حضرت مسیح کو دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار کرا دیا تھا) اُنھیں دوزخیوں میں سے جنھیں شیطان چبا رہا ہے۔ مگر اس پر البتہ تعجب ہوتا ہے کہ رومی بروطوس اور قاسیوس زقائلین جولیس قیصر) بھی اُسے اُنھیں لوگوں میں نظر آئے۔

اب ڈینٹ اور ورجل دونوں شیطان کے جسم پر چڑھ گئے اور بڑھتے چڑھتے کوہ صیہون کے دوسرے پہلو پر جا اُترے جہاں کوہ مذکور ایک مخروطی شکل میں نمایاں ہے۔ جنوبی سمندر کے ایک جزیرے میں قائم ہے اور عالم برزخ کا پہاڑ کہلاتا ہے۔ اس پہاڑ کے گرداگرد نیچے سے اوپر تک زینے بنتے چلے گئے ہیں جو مندرجۂ ذیل سات فانی گناہوں کے مجرموں کی جائے قرار ہیں۔ غرور۔ حسد۔ غصہ۔ کاہلی حرص۔ جوع البقر اور شہوت۔

اس پہاڑ کی چوٹی پر پہونچ کے شاعر سے بیٹرس دیوی سے ملاقات ہوئی جو اُسے اپنے ساتھ لے کے آسمان پر چڑھ گئی۔ اور یکے بعد دیگرے اُسے چاند اور دیگر سیاروں مریخ۔ زہرہ۔ آفتاب۔ مشتری۔ عطارد اور زحل سے ملایا۔ یہاں سے چڑھ کے وہ بیٹرس کے ہمراہ اُس عالم بالا میں پہونچا جو ثوابت کا مرکز ہے۔ اور آخر کار اصلی فردوس بریں میں پہونچ گیا۔ جہاں اُسے عیسیٰ مسیح اور مریم عذراء کے

جلوے نظر آئے اور آخر ایک جھلک دیدار الٰہی کی بھی نصیب ہو گئی۔

اسی دیدار الٰہی پر ڈینٹ کی معراج اور اسکے ساتھ اُس کی مثنوی ختم ہو گئی ہے۔ لیکن اس روحانی سیر کے سلسلے مین اُس نے جیسے تاریخی واقعات پیش کر کے اپنی تاریخ دانی کا اعلیٰ ثبوت دیا ہے اور اُنکے اظہار مین جیسی کامل درجے کی قادر الکلامی ظاہر کی ہے اہل یورپ کی نظر مین بہت ہی قابل تعریف ہے۔ اگرچہ اسکی شاعری کی ہم بھی تعریف کرین گے مگر یہ کہے بغیر نہین رہ سکتے کہ مضمون سرقہ کا ہے۔ اور سوا اسکے کہ اُسے مسیحی خیالات کا جامہ پہنا دیا گیا ہو اُس مین کوئی جدت نہین ہے۔ اُس سے بہت زیادہ جدت آفرینی ملٹن نے اپنی پیراڈائز لاسٹ (فردوس گم شدہ) مین کی ہے۔ اگرچہ وہ بھی ایک مذہبی نظم ہے اور حضرت آدمؑ و حوا کے جنت سے نکالے جانے کے واقعے سے ماخوذ ہے لیکن اس مین شاعر نے اپنے عقائد کی نگہداشت کے ساتھ بہت ہی انوکھی اور پُر لطف باتین پیدا کی ہین۔

توحید

اس موقع پر نہ ہم نے اپنے کرم فرما مولانا حسن نظامی کے اخبار توحید پر ریویو لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے اور نہ وحدت باری تعالیٰ کی تعلیم و تلقین کے لیے۔ بلکہ ہم اس وقت مسئلۂ توحید کی تاریخ کے متعلق اپنے چند خیالات ظاہر کرنا چاہتے ہین۔

خدا کے ایک جاننے اور ایک ہی خدا ماننے کو توحید کہتے ہین۔ ظاہر مین دیکھیے تو کس قدر سادی اور کتنی سیدھی بات ہے کہ ہمارا اور سارے عالم کا پیدا کرنے والا ایک ہی خدا ہے۔ اُس کا کوئی شریک و ہمتا نہین۔ کل موجودات اُسی کے بنائے ہوے اور اُسی کے تابع فرمان ہین۔ مگر پھر بھی اس سیدھے سادے مسئلے مین انسانی جہالت نے (جسے وہ حماقت سے عقل آرائی خیال کرتا ہے) ایسے اُلجھاؤ ڈال دیے ہین کہ اگر مذاہب اور مقتدایان مذاہب کے دعوؤن کو دیکھیے تو ایک بھی موحد نہین نظر آتا۔

اس مین شک نہین کہ توحید کوئی ایسی اچھی چیز ہے کہ جی سب کا یہی چاہتا ہے کہ ہم موحد ہون اور ہمارا خدا ایک ہو۔ فطرت انسانی کی کمزوریون نے سیکڑون

ہزارون باطنی قوی اور روحانی پہلوان تسلیم کر لیے - انسان جس سے مغلوب ہوا۔ جس سے دبا - جس سے ڈرا۔ یا جس کا معترف ہوا اُس کے آگے سر جھکا کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سنسان بیابانون - خاموش جنگلون - سراپا عظمت پہاڑون - خوفناک گھاٹیون - ناپیداکنار سمندرون اور ہمیشہ بہنے والی ندیون مین مرعوبیت کی آنکھون سے دیو اور دیوتا دیکھے - پریان اور دیویان دیکھین - جسمانی عالم مین اپنے خیال کی مدد سے اُن کے تشخصات پیدا کر لیے - اور اُنکے آگے سجدے کرنے لگا - یہ سب ہے لیکن زبان سے یہی کہے جاتا ہے کہ "ہم موحد ہین" اور "ہمارا خالق ایک ہی ہے"۔

یا وجود ان مشرکانہ حرکات کے وہ مانتا ہے کہ خدا کو ایسا ہونا چاہیے کہ کوئی چیز اور کوئی طاقت اُس کی حکومت و قوت سے باہر نہ ہو - کوئی طاقت اُس کی مزاحم نہ ہو سکے - اور جب ایسا خدا ہوگا تو لازم ہے کہ کوئی دوسرا خدا نہ ہو - کیونکہ دوسرا ہوا تو اگر وہ پہلے کی قدرت و حکومت سے باہر ہوا تو پہلے خدا کی خدائی مین فرق آ جائے گا اور وہ پورا خدا ہی نہ باقی رہے گا - اور اگر وہ پہلے خدا کا تابع فرمان اور مخلوق ہوگا تو وہ دوسرا خدا خدا نہ باقی رہے گا - کہنے کو تو کہہ دیا جا سکتا ہے کہ دونون کی قلمرو جدا ہوگی - انکے حدود و اختیارات مقرر و معین ہون گے - اور اپنی اپنی قلمرو پر دونون پوری قوت کے ساتھ قابض و متصرف ہون گے - لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ اس طرح دونون خدا خدا باقی نہ رہین گے - اس لیے کہ پہلے خدا کی حکومت سے دوسرے کی قلمرو باہر ہوگی - اور دوسرے کی حکومت سے پہلے کی قلمرو - اور جس حکومت سے کوئی چیز باہر ہو وہ خدا نہین -

اسی ضرورت اور اسی شبہے کی وجہ سے دنیا مین شاذ و نادر ہی کوئی ایسا شخص ملے گا جو دو خداؤن کو اپنی زبان سے تسلیم کرتا ہو - ایسے لوگ مل جائینگے جو خدا کے منکر ہون اور بخت و اتفاق کو اپنا خالق بنا کے کسی قادر و توانا خدا کے ماننے ہی سے انکار کر دین - لیکن ایسے لوگ چراغ لے کے ڈھونڈھیے تو بھی نہ ملینگے جو دو برابر کے خدا مانتے ہون - یا توحید کے ماننے مین تردد اور پس و پیش کرتے ہون - تاریخ پر نظر ڈالیے تو ہر قوم اپنے آغاز مین بت پرست نظر آئے گی - لیکن ا[illegible]

دونون کے حالات اس قدر کم معلوم ہین کہ ہم ہر پُرانی قوم کے اصلی عقائد سے واقف نہین - اس بات کو ہم مانتے ہین کہ انسان نے جب حیوانیت چھوڑ کے انسانیت کا جامہ پہنا تو اپنی عقل کی کمزوری سے ہر اُس چیز کو جو مہیب یا باعظمت نظر آئی اس کے آگے سر جھکانے اور اُس کی پرستش کرنے کو تیار ہوگیا - لیکن اُسکی اس ضعیف الاعتقادی سے ہم یہ نتیجہ نہین نکال سکتے کہ کبھی وہ ایک سے زیادہ خداؤن کا بھی قائل تھا -

اگلی دنیا کے بعض بادشاہون نے بھی خدا بننے کی کوشش کی - جیسا کہ نمرود و فرعون کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے - لیکن سچ یہ ہے کہ وہ پولیٹیکل خدا تھے - دل مین اپنی مجبوریون اور کمزوریون کے معترف تھے مگر اپنی رعایا کے مطیع فرمان رکھنے کے لیے چاہتے تھے کہ خدا ہی نہین بلکہ ہم اپنی قوم کے معبود بن جائین - تاریخ ہی بتا رہی ہے کہ ایسے دنیوی خدا جہان خدائی کا دعویٰ کرتے تھے وہان بتخانون مین جا کے بتون کی پرستش بھی کیا کرتے تھے

تاریخ کی جستجو میں اگر قرائن سے بدلی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے پہلے اُن چیزون کی پرستش کی جن سے خائف و مرعوب ہوا - پھر اُن لوگون کی جو قوت مین سب سے غالب تھے - اور اسی سلسلے مین اپنے بزرگون مورثون اور معزز نامور لوگون کو پوجنے لگا - لہذا جیسے معبود وہ بزرگ اور نامور لوگ تھے ویسے ہی معبود بادشاہ بھی بن جایا کرتے تھے - مگر اس معبودیت کے ساتھ قومی دیوتاؤن کے آگے بادشاہ اور رعایا - راجہ اور پرجا سب سجدے کیا کرتے تھے -

یہود کی تاریخ بہت پُرانی ہے - اُن کی تاریخ سے بابل و نینوا اور مصریین کی تاریخون پر بھی روشنی پڑتی ہے - وہ اپنے آپ کو موحد اور باقی تمام اقوام عالم کو بت پرست بتاتے ہین - مصر میں بڑے بڑے دیوتا تھے - بابل مین ہر جگہ بت تھے - یہود کے قریب ہی فنیقیون اور کنعانیون مین دیوتاؤن کی پرستش ہوتی تھی - اور اسرائیلی اُن سب کو بت پرست اور اپنے آپ کو موحد و حق پرست بتاتے تھے - لیکن جس طرح اُن قوموں کی بت پرستی کے پردے میں توحید تھی ویسے اسرائیلیون کی توحید بھی ہمین مغشوش نظر آتی ہے - اس لیے کہ اسرائیلیون کا خدا "یہوا" اُنکے بیان سے خدا نہین بلکہ اُن کا قومی دیوتا

نظر آتا ہے - جو اور قومون کا نہین صرف اُن کا خدا تھا - جو اورون کے خداون پر غالب تھا - اور اُن سے وعدہ کرتا تھا کہ مین تمھین سب قومون پر غالب اور سب سے برگزیدہ بنا دون گا -

اس کے بعد یونانیون اور رومیون کا زمانہ ہے - یونانی بھی توحید کے قائل تھے اگرچہ اُن کا خدا صرف علت تخلیق تھا اور جملہ صفات سے معرّا تھا - اور رومیون کا خدا بھی ایسا ہی تھا - دونون کے نزدیک عالم تخلیق مین دیوتاؤن اور دیویون کی حکومت تھی - نامور انسان - زبردست سپاہی اور بلند حوصلہ بادشاہ بھی دیوتا بن جاتے اور اپنے روحانی اقتدارات سے دنیا پر اپنے اپنے علاقون مین حکومت کرنے اور دنیا والون کو مدد دیتے -

مسیحیت نے دنیا مین آ کے ابتدائے بڑے زور شور سے توحید کا نعرہ بلند کیا اور تمام مروج و معاصر مذہبون کو شرک بتایا - مگر سچ یہ ہے کہ یونانی ہون یا رومی اُنکے افعال مشرکانہ تھے عقیدہ مشرکانہ نہ تھا - اس لیے کہ وحدت باری تعالٰی مین اُنھین ہرگز شک نہ تھا -

سب سے بڑا الزام شرک کا مجوس کو دیا گیا جن کا مذہب ہزار سال سے فارس اور خراسان وغیرہ مین جاری تھا - لیکن اس الزام دینے مین زیادہ دخل مسیحیون کی تحقیق کو نہین بلکہ تعصب کو تھا - مسلمانون مین بھی آتش پرستی کو "ثنوی المذہب" یا دو خداؤن کا ماننے والا مذہب کہا جاتا ہے - خود زرتشتی اپنے آپ کو اس الزام سے بری بتاتے ہین - اور اگر غور سے دیکھیے تو جیسا الزام اُن کو دیا گیا ہے حقیقت مین وہ ویسے ملزم نہین ہین - اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ دنیا مین نیکی و بدی دو متضاد چیزین ہین جن کو اُنھون نے نور و ظلمت سے تعبیر کیا - خدائے تعالٰی چونکہ صرف صفات حسنہ سے متصف ہے اس لیے نور کو اُنھون نے اُس کا جلوہ بتایا اور شیطان چونکہ ضلالت و بدی کا مجموعہ ہے - لہذا اُس کا مظہر ظلمت کو قرار دیا - یہ وہ مانتے ہین کہ خدا سب پر غالب ہے اور شیطان و ظلمت پر بھی وہ غالب آئے گا - فی الحال خدا کی مرضی کے خلاف ظلمت موجود ہے اور شیطان لوگون کو گمراہ کرتا رہتا ہے - ایسا نہین ہے کہ شیطان و ظلمت اُس کی حکومت و قدرت سے باہر ہوا

گمراہان نافرمان اور اُسکے علم سے باہر ضرور ہین - ایک دن آنے والا ہے جب شیطان پکڑکے مارا جائے گا اور ظلمت دُور ہوگی - اگر غور سے دیکھیے تو اس مسئلے مین حقیت کا دعوا کرنے والے دیگر مذاہب سے وہ اچھے ہی ہین لیکن اس کا کیا علاج کہ اُنکو الزام دے کے دو خداؤن کا ماننے والا اور مشرک بتا دیا گیا -

فرق اتنا ہے کہ عیسائیون اور مسلمانون مین شیطان کی تخلیق کا ایک واقعہ بیان کر دیا گیا ہے اور زرتشتیون مین کوئی ایسا قصہ نہین جس سے پتہ چلتا ہو کہ اہرمن (اُن کے شیطان) کو یزدان (اُن کے خدا) نے پیدا کیا تھا - اُن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے آہرمن اسی شان سے چلا آتا ہے ہان آخر مین البتہ مفتوح ہو کے مارا جائے گا - لیکن جب وہ اُسے فانی مان رہے ہین تو اُسکے آغاز کا پتہ نہ لگنے سے یہ لازم نہین آتا کہ اُنکے نزدیک وہ ازلی وابدی خدائے شر ہو -

اس مین شک نہین کیا جا سکتا کہ ابتدائے مسیحیت کی توحید غیر مغشوش اور مکمل تھی - لیکن چند ہی روز مین نظر آ گیا کہ بعوض اسکے کہ وہ اپنی توحید کا اثر دوسرون پر ڈالے خود ہی دوسرون کے شرک سے متاثر ہو کے مغشوش ہو گئی - ایک ہی صدی گذری تھی کہ اُس کی توحید مین تثلیث کا جوڑ لگ گیا - اور زرتشتیون کو یہ کہنے کا موقعہ مل گیا کہ خیر ہم تو ثنوی (دو خداؤن کے ماننے والے) تھے مگر تم تثلیث والے ہو - اب پھر ساری دنیا مین توحید برائے نام تھی - اور ظاہری صورت مین جسے دیکھیے مشرک تھا -

عرب کے جہلا علم و فضل سے محروم اور متمدن و مہذب قومون سے دور ہونے کے باعث اب تک پُرانے مذاق کی بت پرستی مین مبتلا تھے - اُن مین درخت، جانور اور بت سب ہی طرح کے معبود تھے - ظاہر مین معلوم ہوتا ہے کہ وہ پورے پورے مشرک ہون گے لیکن قرآن مجید جو اُن کے مذہب کے استیصال کے لیے آیا تھا وہی بتا رہا ہے کہ ایک سے زیادہ خداؤن کے وہ قائل نہ تھے - اور اگر اُن سے پوچھا جاتا کہ تمھارا خالق کون ہے تو جواب دیتے کہ "خدائے وحدہٗ لاشریک" - اسکے بعد جب الزام دیا جاتا کہ "پھر تم ان بتون کو کیون پوجتے ہو؟" تو کہتے "اس لیے کہ یہ بُت خدا کی درگاہ مین ہماری شفاعت کرین گے" -

اس بیان سے یہ تو ثابت ہوگیا کہ اسلام سے پیشتر کے تمام مذاہب بت پرست ہوں یا خدا پرست توحید کے سب قائل تھے۔ شرک صرف عبادت اور پرستش میں تھا عقائد میں نہیں۔ یہ بھی نظر آگیا کہ پرانے مذاہب حقہ بھی مشرکوں کے اثر سے متأثر ہوکے اپنی اصلی توحید کو بھول بیٹھے تھے۔ عقائد میں اگر شرک تھا بھی تو اُسے وہ ایک متشابہ عقیدہ خیال کرتے۔ مثلاً عیسائیوں نے تثلیث کو مانا بھی تو توحید کے لفظ کو نہ چھوڑا۔ اور تثلیث کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے رہے کہ ہم ایک خدا کو مانتے ہیں اور جب "تثلیث و توحید کے باہم متضاد ہونے کی نسبت سوال کیا گیا تو سینٹ آگسٹین نے کہد یا کہ: "یہ مسئلہ اس لیے ہے کہ دنیا میں مانا جائے اور آخرت میں جا کے سمجھا جائے"۔ اسی طرح زرتشتیوں کو ساری دنیا ثنوی المذہب کہتی تھی۔ وہ خود بھی اہرمن (شیطان) کو اتنی وقعت و عظمت دیتے اور اُس سے اس قدر ڈرتے تھے کہ اُن کے طرز عمل سے دھوکا ہوتا کہ شاید یہ اہرمن کو خدا ہی کے برابر کی قوت مانتے ہیں۔ لیکن اگر اُن سے پوچھا جاتا تو یہی جواب دیتے کہ ہمارا خدا ایک ہے۔ اور اہرمن تو ایک دشمن حق بُرائی ہے جو فانی ہے۔

الغرض عقیدۃً خدا کے ایک ماننے میں سب متحد ہیں۔ شرک کا جو کچھ اظہار ہوتا ہے عبادات اور طرز عمل سے۔ اس راز تک سب سے پہلے بنی اسرائیل پہونچے جو قدیم الایام میں بت پرستی کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ مگر سچ یہ ہے کہ توحید کی اس اصلی شان کو مکمل طریقے کو پہلے پہل اسلام نے سمجھا اور اُس نے بتایا کہ زبان اور عقیدے سے ہم چاہے کتنے ہی خدائے واحد کے قائل ہوں ہمارا طرز عمل ہمارا طریقۂ عبادت اور ہماری معاشرت مشرکانہ ہو تو توحید باطل ہو جاتی ہے اور ہم اس قابل نہیں رہتے کہ اپنے آپ کو موحد کہیں۔

اسلام نے کسی مافوق قوت یا کسی اپنے سے بالادست شخص کے ماننے میں حفظ مراتب کے درجے قائم کیے۔ اُس نے حکم دیا "اعبدوا الٰھکم واکرموا اخاکم (اپنے خدا کی عبادت کرو اور اپنے بھائی کی تعظیم کرو) پھر اسکے بعد عبادت و تعظیم کا فرق بتایا۔ نماز اور حج میں جن جن طریقوں سے خدا کی عظمت ماننے کا اظہار کیا جاتا ہے ان کو عبادت قرار دیا اور انکے سوا اور جتنے طریقے عظمت ماننے کے ہوں

ان کو تعظیم بتایا۔ ہم کسی بزرگ اور معزز شخص کو دیکھ کے کھڑے ہو جائیں تو یہ تعظیم ہے۔ لیکن اگر اُس کے آگے سجدہ یا رکوع کریں تو شرک ہے۔

ایک یہ پرانا خیال بھی تھا کہ خداوند جل وعلا چونکہ مجہول الکنہ بیچون و بیچگون اور ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ اس لیے اُسکی ذات تک ہمارا خیال نہیں پہونچ سکتا۔ مگر عبادت کے لیے اُس کا خیال کرنے اور اُس کا دھیان رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس دشواری کو قدیم مذاہب نے اپنے اپنے مذاق کے موافق حل کیا۔ اس کو تو سب نے تسلیم کر لیا کہ اُس کی طرف دھیان لے جانے کا ذریعہ اُس کی قدرت کاملہ کے کسی مکمل نمونے کو یا کسی ایسی چیز کو جو اُس کی کسی اعلیٰ صنعت کو ظاہر کرتی ہو قرار دے لیا جائے۔ لیکن انتخاب میں اختلاف پڑا۔ کسی نے کسی حسینہ کی تصویر کو کسی نے کسی قوی ہیکل انسان کی مورت کو۔ کسی نے کسی زبردست جانور کو۔ کسی نے کسی بڑے بھاری درخت کو۔ کسی نے نور و نار کو ترجمان حق قرار دے کے عبادت الٰہی کے واسطے قبلہ بنایا۔

اسلام نے ایسے تمام قبلوں کو قبلہ ہاے باطل بتایا۔ اس لیے کہ چند ہی روز میں لوگ خود اُن قبلوں میں کسی کرشمے یا کسی قدرت کو ماننے لگے۔ اور بجاے اسکے کہ وہ انسان کے خیال کو خدا کی طرف لے جائیں خود ہی معبود بن گئے۔ اُن کی تقدیس و تنزیہ کی جانے لگی۔ ان مشرکانہ نتائج سے بچانے کے لیے اسلام نے اُن تمام قبلوں کی تو تکذیب کر دی مگر اس اصول کو نہیں چھوڑا کہ خدا سے بیچون کی عبادت کے لیے کسی سمت اور قبلے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسلام نے ایک مکان کو قبلہ قرار دیا جو موحدوں کا سب سے پرانا عبادت خانہ تھا۔ اور اُسے بھی اس قید کے ساتھ کہ اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ میں اسے سجدہ کرتا ہوں یا نماز میں اُس کی طرف خطاب کرے تو وہ مشرک ہے۔ اس اصول کی سچائی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تمام دیگر مذاہب میں جو چیزیں سمت عبادت یا قبلہ بنائی گئی تھیں وہ چند ہی روز میں معبود بن گئیں اور اُنھیں کی پرستش ہونے لگی۔ بخلاف مسلمانوں کے قبلے خانۂ کعبہ کے جو گذشتہ تیرہ سو برس میں قبلے کی حد سے تجاوز کر کے معبود نہیں بن سکا۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی مرور ایام کے ساتھ شرک پیدا ہوا

اور مشرکانہ رسوم ترقی کرتے رہے - ہزارہا چیزیں پیچ گئیں - ہزاروں چلّوں - جھنڈوں قبروں اور فرضی تربتوں کے آگے سجدے ہونے لگے مگر خانۂ کعبہ کی جو حیثیت آنحضرت صلعم کے زمانے میں تھی آج تک قائم ہے اُس میں ذرہ بھی تغیر نہیں ہوا -

مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے جیسی خالص توحید بتائی کبھی نہیں بتائی گئی تھی - اور اگر اُسکے تعلیمات پر پورا پورا عمل کیا جاتا تو یقیناً دنیا میں ایک سچی موحد قوم موجود ہوتی - مگر افسوس کہ مسلمانوں میں بھی نماز روزے کے ساتھ مشرکانہ رسوم پیدا ہو گئے - اور اُن کا انجام بھی یہی ہوا کہ توحید کے مدعی تو سب ہیں مگر صحیح معنوں پر دیکھیے تو اُن میں بھی شاذونادر ہی کوئی موحد نظر آئے گا -

موسیقی

موسیقی اُن فنون لطیفہ میں سے ہے جن سے انسانی طبائع پر اثر ڈالنے کے لیے ہمیشہ اور ہر ملک میں کام لیا گیا ہے - اسکے موجد فطرت انسانی کے ایسے سلسلے کے جذبات ہیں کہ اسکے پہلے بانی کو کسی ترقی یافتہ ملک یا متمدن قوم میں ڈھونڈھنا نادانی ہے - سچ یہ ہے کہ اسکی موجد ہر قوم اور ہر سرزمین ہے جس نے آغاز ہی میں اسے ایجاد کر لیا - ہر وحشی سے وحشی قوم نے اپنا موسیقی آپ ایجاد کیا - مثل مشہور ہے کہ "گانا اور رونا سب کو آتا ہے" - جس روز کوئی پہلا وحشی انسان کسی بات پر خوش ہو کے اُچھلا کودا اور گایا تا چاہا، اور جس دن تخلیق عالم کے آغاز ہی میں کوئی جاہل عورت کسی عزیز کی موت پر بیتابی کے ساتھ سر پیٹ کے روئی اور بین کرنے لگی اُسی دن جانیے کہ موسیقی کا فن ایجاد ہو گیا - اور غالباً اسی کا اظہار قدیم مذاہب نے اس عنوان سے کیا ہے کہ اس فن لطیف کا موجد بجائے انسان کے دیوتاؤں کو بتا دیا جو تخلیق عالم کے آغاز میں انسانوں کے بڑے دوست تھے - اُن سے ملتے جلتے تھے اور کبھی کبھی اُنھیں اپنی صحبتوں میں شریک کر لیا کرتے تھے -

ہندو کہتے ہیں کہ موسیقی کے پہلے موجد نارد جی تھے جو سب دیوتاؤں سے

بڑے اور پھلے تھے۔ اور مختلف راگنیان اپنے حالات و جذبات کے مناسب شکل و شمائل اور وضع ، لباس مین اُن کی بیبیان بتائی جاتی ہین۔ مصر والے جو قدامت مین سب سے پہلے مشہور ہین۔ ان کا عقیدہ تھا کہ موسیقی اور آلات موسیقی یعنی مختلف باجون کو اُن کے اعلیٰ ترین دیوتاؤن۔ اُسائرس۔ آئی سس۔ اور ہرمس نے ایجاد کیا۔ یونانیون کا خیال تھا کہ اُنکے اعلیٰ درجے کے دیوتا زیوس کی نو بیٹیان جو "میوزس" کہلاتی تھین وہی تمام علوم و فنون کی بانی تھین اور اُنھیں سے موسیقی کا فن ایجاد ہوا۔ اُن نو میوزس (دیویون) کے نام یہ ہین (۱) کالیوپیہ۔ مثنویون اور افسانہ خوانی کی شاعری کی بانیہ (۲) کلیو۔ تاریخ کی موجدہ (۳) اِراتو۔ عاشقانہ شاعری کی بانیہ (۴) یوتیرپہ۔ نغمہ خوانی کی شاعری کی بانیہ (۵) ملپومنہ۔ مرثیہ خوانی اور جذبات غم کو اُبھارنے والی شاعری کی بانیہ۔ (۶) پولی ہم نیا۔ نغمہ خوانی اور فصاحت و بلاغت کی دیوی۔ (۷) ترپسی شورہ۔ ناچنے کی موجدہ (۸) تھالیہ۔ جذبات مسرت کو اُبھارنے والی شاعری کی بانیہ (۹) اُرانیہ۔ علم ہیأت کی موجدہ۔ اسی قسم کے خیالات فن موسیقی کی ایجاد کے متعلق چینیون، فارسیون۔ اور بابل والون میں بھی ہونگے لیکن افسوس کہ ہم اُن سے ناواقف ہین۔ مشرق کے متاخر محققون نے موسیقی کی ایجاد اور اُس کی وجہ تسمیہ کے بارے مین عجب عجب خیال آفرینیاں کی ہین مگر اب وہ زمانہ نہین۔ ہا کہ چڑیون مین نغمہ سنجی کا قدرتی جوہر دیکھ کے موسیقار نام ایک طائر ڈھونڈھ کے نکالا جائے۔ موسیقی کے ایجاد کی کلغی اُسکے سر مین لگائی جائے اور اُسی کی نسبت سے موسیقی کا نام موسیقی بتایا جائے۔ موسیقی کے نام کی اصلیت یہ ہے کہ یہ فن علوم کی یونانی دیویون میوز کی جانب منسوب ہے اور میوز کا تلفظ یونانی زبان مین یقیناً "موس" تھا۔ عربی و فارسی مین اور ہماری زبان مین جس طرح نسبت کے لیے آخر مین یائے معروف لگائی جاتی ہے اسی طرح لاطینی اور یونانی مین "ق" لگایا جاتا تھا۔ اسی قاعدے کے موافق وہ موسیقی کو "موسیق" (انگریزی مین میوزک) کہتے تھے۔ عربون کی یہ غلطی تھی کہ اس کا خیال نہ کیا کہ موسیق مین خود ہی حرف نسبت موجود ہے اور اُسپر اپنے یونان کی یائے نسبت

بھی اضافہ کر دی - اور اس فن کا نام ساری مشرقی دنیا مین بجاے "موسی" کے "موسیقی" ہو گیا -

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس فن کو کن کن قومون نے کہان تک ترقی دی - اور کس قوم کی موسیقی کس پایہ پر تھی - معلوم ہوتا ہے کہ قدماے یونان مین موسیقی کا مفہوم بمقابل آج کل کے زیادہ وسیع تھا - اُن لوگون مین گانا - ناچنا اور بجانا ہی نہین بلکہ شاعری بھی اُس مین شامل تھی - اصل یہ ہے کہ اُنکے خیال مین جتنے فنون "میوزس" دیویون کی تعلیم سے حاصل ہوے تھے سب اُن کی موسیقی مین شامل تھے -

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے موسیقی کو اہل مصر نے ترقی دی - اور معلوم ہوتا ہے کہ اُنکی موسیقی اعلیٰ درجۂ ترقی کو پہونچ گئی تھی - مگر اس عام تحقیق کے خلاف یونانی مورخ ڈیوڈوروس سقولوس یقینی طور پر بیان کرتا ہے کہ مصر مین قدیم الایام مین موسیقی کی تعلیم و تعلم اور اُس سے حظ اُٹھانے کی ممانعت تھی - اس لیے کہ اُسکے شوق مین مبتلا ہو کے آدمی عیش پرست ہو جاتے ہین - اور جہان انسان کو اس کا شوق ہوا بالکل گیا گذرا ہو جاتا ہے - مگر افلاطون اور ہیرودوطوس (جو یونانیون ہی کا نہین ساری دنیا کا سب سے پہلا مورخ ہے) دونون نے مصر کا سفر کیا تھا اور دونون یقین دلاتے ہین کہ بخلاف ممانعت اور روک کے مصر مین علم موسیقی کو ہر طرح سے ترقی تھی - سلطنت اُسے روز افزون ترقی دے رہی تھی - اور نوعمرون کو کمسنی ہی مین اس کی تعلیم دی جاتی تھی - خود ڈیوڈوروس جو مصر مین اس کے ممنوع ہونے کا راوی ہے دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ "موسیقی اور اُسکے تمام سازون کے موجد مصر کے دیوتا تھے" - اور یہ امر پوری طرح پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ اہل مصر کے پاس ایسے باجے اور آلات طرب موجود تھے جن سے ہر قسم کے جذبات مین تحریک پیدا کرنے والے مختلف نغمے ادا ہوتے تھے -

اہل بابل و نینوا مین بھی موسیقی کا بڑا رواج تھا - ان کے وقت کی بنی ہوئی تصویرین بتا رہی ہین کہ بادشاہون کے ساتھ ساتھ اور فتحیاب فوجون کے آگے آگے چنگ و رباب بجانے والے مغنی چلا کرتے تھے - یہ بھی ثابت ہے کہ اُن کے

وہان موسیقی عبادت مین داخل تھی۔ اور بڑے بڑے مندرون اور بتخانون مین ارباب نشاط اور مغنیون کی چوکیان مقرر تھین جن کے نغمے پر اکثر پوجاریون کو حال آیا کرتا۔ مگر چونکہ انکے پاس سوا پتھرون اور قصر و ایوان کی دیوارون پر کندہ کر دینے کے اور کوئی ذریعہ اپنے علوم و فنون کو بعد والون کے لیے محفوظ کر دینے کا نہ تھا اس لیے اُن کے جملہ علوم کی طرح اُن کی موسیقی بھی اُنھین کے ساتھ مٹ گئی۔ اگر یونانیون کی طرح پاپائرس وغیرہ کی قسم کا سامان تصنیف و تدوین اہل بابل و نینوا کے پاس بھی موجود ہوتا تو آج ہم اُن کے علوم سے اس قدر ناواقف نہ ہوتے۔ اور بخوبی معلوم ہوتا کہ انکی موسیقی کے کیا اصول تھے اور کیسی تھی۔

بنی اسرائیل کو بھی موسیقی کا کم شوق نہ تھا۔ توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے آلات طرب خصوصاً چنگ وارغنون کا موجد جوبل تھا جو حضرت آدمؑ کی نسل مین ساتوین پشت پر تھا۔ اُسکے ارغنون سے مراد غالباً وہ پرانے زمانے کا ساز ہے جس مین کئی بانسریان ایک مین جوڑ دی جاتی تھین۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ موسیقی کی ایجاد جوبل سے پہلے ہی ہو چکی ہوگی۔ اور اگر پہلے نہ بھی ہوئی ہو تو اُس کے زمانے مین تو شک ہی نہین کہ یہ فن موجود تھا جس کی تائید و تقویت کے لیے آلات طرب ایجاد کیے گئے۔ مگر بنی اسرائیل کی موسیقی کے اصلی عروج کا زمانہ حضرت داؤدؑ کا زمانہ ہے جنکے مزامیر مشہور رہیں۔ قدیم مورخ اسیبویس کا بیان ہے کہ حضرت داؤد جہان جاتے اپنا چنگ ضرور ساتھ لیجاتے۔ اُنھون نے مذہبی رسوم و عبادات کے لیے اہل موسیقی کی چوکیان اور باجون کے بینڈ مقرر کیے تھے۔ اور ثابت ہوتا ہے کہ عبادت کرتے وقت وہ خود خدائے واحد ذوالجلال کے سامنے گاتے بجاتے اور ناچتے تھے۔ جبکہ آلات طرب سے کام لینے والون کا طائفہ چنگ ورباب۔ طنبورہ۔ جھانجھ۔ قرنا اور تُرہیان بجاتا تھا۔ اور وہ اپنی مناجات کے نغمے کی صدا بلند کرتے۔ اِن چیزون کو اُنکے بعد حضرت سلیمانؑ نے اور زیادہ ترقی دی جبکہ مسجد الٰہی اور حرم ربانی مین بہت سے گانے بجانے والے مقرر تھے۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کی موسیقی کے شباب کا تھا۔ مگر اسیری بابل نے جو ۶۳ سال تک قائم رہی یہود کی موسیقی اور اُنکے آلات طرب دونون کو خاک مین

ملا دیا۔ اس لمبی قید سے چھوٹنے کے بعد وہ پنپنے نہین پائے تھے کہ ارض یہودا کا وہ پُرفتن زمانہ شروع ہوگیا جبکہ اُن پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے اور مصریون فارسیون اور رومیون سب نے یکے بعد دیگرے اُنھین مغلوب و مقہور کیا۔ اور کبھی اتنی مہلت نہ دی کہ اطمینان سے بیٹھ کے اپنے قدیم موسیقی کو تازہ اور پرانے آلات طرب کو پھر زندہ کرتے۔ ان تباہیون نے موسیقی کو اُن مین سے فنا کر دیا۔ او اب اُنکے عبادات اور رسوم مذہبی کو گانے بجانے اور آلات طرب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ساری دنیا کے معابد یہود سے موسیقی کا فن قطعًا علٰحدہ ہوگیا۔ اور جرمن کے یہود کا مدتون سے یہ عقیدہ ہے کہ مسیحا کے ظہور سے پہلے گانا بجانا اور خوشیان منانا غیر مناسب اور حرام ہے۔

مگر افسوس اہل مغرب نے ہندوستان کی موسیقی کی طرف کبھی توجہ نہین کی حالانکہ سب سے قدیم اور سب سے زیادہ مکمل اسی سرزمین کی موسیقی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اُس کی طرف ہم اُس وقت توجہ کرین گے جب مسلمانون کی موسیقی کا تذکرہ آئے گا۔

یونانیون مین بہت سی دیگر اقوام عالم کی بہ نسبت موسیقی کی زیادہ قدر و منزلت تھی۔ لیکن اس تاریخی بیان کے سوا اگر ہم اس بات کو معلوم کرنا چاہین کہ اُن کی موسیقی کیا تھی اور کیسی تھی تو کچھ بھی پتہ نہین چل سکتا۔ ہر قوم کی موسیقی اُن گیتون کے ذریعے سے جن مین اچھی اور دلکش دُھنین بندھ جاتی ہین بعد والی نسلون مین منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اور اُنھین کو سُن کے بعد والون کو اپنے متقدمین کی موسیقی کی نوعیت کسی نہ کسی حد تک ضرور معلوم ہو جایا کرتی ہے۔ بخلاف اسکے یونانیون کی موجودہ نسلون مین اپنے بزرگان سلف کی نہ زبان ہی باقی رہی اور نہ اُن کا نغمہ ہی باقی رہ گیا۔ پُرانے یونانیون کی موسیقی کا جو کچھ حصہ مل سکتا ہے وہ اُنکی چند منتشر تحریرین ہین جو کسی کی سمجھ مین نہین آسکتین۔

دنیا مین جس وقت خط ایجاد کیا گیا تو اسکی پوری کوشش کی گئی کہ انسان کی آوازین مخارج کے لحاظ سے مختلف حروف مین قلمبند کرلی جائین تاکہ جو لفظ جتنے مخارج کی آوازون سے مرکب ہے ویسے ہی حروف کے ذریعہ سے تحریر مین

لایا جائے - لیکن اس کی کبھی کوشش نہین کی گئی کہ آواز اپنی ترقی و تنزل - اپنے
زیر و بم - اور مینڈون اور زمزمون کے لحاظ سے تحریری نشانات مین دکھائی جائے
ء ایسی کمی تھی جس کے باعث کوئی قوم اپنے موسیقی کو چاہے وہ کیسے ہی کمال کے
درجے کو پہونچی ہوئی ہو دوسرون کے ذہن نشین کرنے کے لیے قلمبند نہ کرسکی -
یونان کے اکثر قدیم فلسفیون خصوصاً فیثاغورس - افلاطون - اور ارسطو کے
شاگردون نے موسیقی پر لکھا ہے - جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنون یونان مین
موسیقی کا سکھانا اعلیٰ طبقے کے رئیس زادون کی تعلیم کا جزو لازمی تھا - اور نیز یہ
کہ دلچسپی اور صحبتون مین لطف ہی پیدا کرنے کے لیے نہین بلکہ مذہبی رسوم اور عبادات
میں بھی موسیقی سے کام لیا جاتا تھا - وہ لوگ چونکہ ایشیاے کوچک سے جا جاکے
بسے تھے اور یہین کے علاقون کے نام کی نوآبادیان یونان مین قائم ہوگئی تھین
لہذا انھین نوآبادیون یا اُنکے اصلی ایشیائی علاقون کی جانب اُنکی دُھنین اور
اُنکے نغمے منسوب تھے - چنانچہ اپنے بعض نغمون کو لیڈیا سے ماخوذ بتاتے تھے
جہان پُرانا مغنی امفی اون اِس فن کی تعلیم دیتا تھا - بعض نغمون کو ارکاڈیا سے
حاصل کیا تھا جہان چرواہے بانسلی وغیرہ مین نہایت ہی دلکش تانین لگایا کرتے
تھے - اُن کے گانے کے ٹھاٹھ مقامات فریجیا - ڈوریا - ایولیا - اور ایونیا کی جانب
منسوب تھے -

خیال کیا جاتا ہے کہ یونانیون کی موسیقی صرف سُرون تک محدود تھی - اور
اُس مین لے نہ تھی - کیونکہ اُن کے نزدیک وزن کا تعلق صرف نظم سے تھا -
مگر غالباً یہ قیاس ویسا ہی ہو جیسے ہندوستان کے موسیقی دان اکثر اعتراض
کیا کرتے ہین کہ انگریزی موسیقی مین لے نہین ہے - یونانیون نے اپنے علمی مذاق
سے اس بات کی بھی کوشش کی تھی کہ موسیقی کی دُھنون کو تحریر مین لے آئین -
مگر اس کوشش مین کامیاب نہ ہو سکے - اس لیے کہ جو اُن کے گلے سے نہ سُن
چکا ہو وہ اُس تحریر کے ذریعے سے ہرگز نہین سمجھ سکتا کہ وہ نغمہ سُرون کی کس مناسب
ترتیب سے اور کس دُھن مین ادا ہوتا ہے - اُنھون نے موسیقی کی تحریر کی بنیاد
حروف تہجی پر رکھی تھی - سُرون کے لحاظ سے اُن حرفون کی صورتین بدلی اور

الوں نے اپنے آپ کو ایک بڑے علمی ذخیرے سے محروم و بے بہرہ کر رکھا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یورپ میں فی الحال ہر حیثیت سے موسیقی کو بڑی ترقی ہو رہی ہے۔ اور گلے بازی اور آلاتِ طرب دونوں چیزوں میں وہ ممالک ارض سے بڑھتے جاتے ہیں۔

ہمارے یہاں بھی اب موسیقی جاہل مغنیوں سے نکل کے پڑھے لکھے اور شائستہ لوگوں میں آنے لگی ہے۔ بعض علمانے اسکے جواز کے فتوے دیے ہیں۔ اور ہندوؤں نے بھی اپنے قدیم موسیقی کو نئے سرے سنبھالنا اور اس میں از سر نو جان ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ دیکھ کر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے موسیقی کے تحریر میں لانے کی اس وقت تک مطلقاً کوشش نہیں کی گئی۔ جبکہ اردو کا نیا "شارٹ ہینڈ" خط بھی ایجاد ہو گیا تو تعلیم یافتہ شائقین موسیقی کی کوشش و توجہ سے کسی مکمل خطِ موسیقی کا ایجاد ہونا ہماری موسیقی کی ترقی کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے احباب اس کمی کو جلد پورا کریں گے۔

ہندوؤں کے علوم (نومبر ۱۹۱۳ء)

دنیا اپنی نادانی سے چاہے قدر نہ کرے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ہندو مذہب اور اسکے ساتھ ہندوؤں کی قوم موجودہ دنیا کے آغوش میں ایک نامعلوم قدامت کی قابل قدر امانتیں ہیں۔ اور سلف کے جو ایام قدامت کے دھندلکے میں آ گئے انکے نہایت بیش بہا تبرکات ہندوؤں کی پرانی زبان سنسکرت اور انکے ہمیشہ زندہ رہنے والے علوم ہیں۔ زمانہ ہر چیز کو مٹاتا رہتا ہے۔ کسی میں چاہے کیسی ہی ابدی زندگی کی صلاحیت ہو زمانہ اس پر آہستہ آہستہ مرورِ ایام کی خاک ڈالتا ہی جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مدت دراز کے بعد وہی خاک اسکی قبر بن جاتی ہے۔ اور وہ بے مرے زندہ دفن ہو جاتا ہے۔ زمانے کے ان زندہ مدفونوں میں مصری۔ بابلی۔ اسرائیلی۔ یونانی اور رومی ہیں جو ایسے علوم و فنون اور ایسی تاریخی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں کہ قدامت کی خاک میں دب جانے

کے بعد بھی تہ خاک سے پکار پکار کے اپنا نام بتاتے اور اپنی زندگی کا ثبوت دیتے
رہتے ہین۔ مگر ہندوستان کی پُرانی آریہ قوم نے باوجودیکہ سب سے قدیم ہے زمانے
کی اُس خاک کو ہمیشہ جھٹک جھٹک کے ہٹا دیا۔ اور اُس پر مرور ایام کا زور نہ چلنا
تھا نہ چلا۔ اور زمانہ اورون کی طرح اُس کے زندہ دفن کرنے مین کسی طرح کامیاب
نہ ہوسکا۔ ہندو قوم نے زندگی کی مزاحمتون پر ہمیشہ فتح پائی۔ جو جو دشواریان پیش
آئین سب کو خاک کی طرح جھاڑ کے الگ پھینکدیا۔ اور حضرت مسیح سے ہزارہا سال
پیشتر کے اُن پسماندگانِ سلف کو آج بیسوین صدی مین ہم دیکھتے ہین کہ معجزنما زندگی
ابدی کا جامہ پہنے ہوے اپنے پُرانے علوم کو خود ہی دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہین
آغازِ ہستی کے دنگل کے پہلوانون مین سے آج کون باقی ہے؟ بابل والے۔ اسیر
والے۔ مصر والے۔ ایران والے۔ یونان والے۔ اور اُن کے زلہ خوار اہل روم
سب مٹ گئے۔ نہ اُن کا مذہب باقی ہے نہ اُن کی معاشرت باقی ہے۔ صرف
اُن کے چند علوم ہین جو غیرون کے ہاتھ کا کھلونا ہین۔ مگر ہندو آبِ حیات سے
سرشار ہندو۔ ابد کی ڈھائی چھونے لگے مشتاق ہندو آج پامردی کے ساتھ
خود ہی کھڑے ہوے اپنے مذہب۔ اپنی معاشرت۔ اپنے کارنامون اور اپنی تاریخ
کو دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہین۔ اور اگر کوئی غیر اُن کے علوم کے سمجھنے مین ذرا
بھی غلطی کرتا ہے تو فوراً جھڑک کے ٹوک دیتے ہین۔ اور اپنی تاریخ و قسمت کا
فیصلہ دوسرون کے ہاتھون مین نہین چھوڑتے۔

ہندوؤن کا نایاب علمی ذخیرہ کیا بلحاظ اُن کی مذہبی روایتون کے اور کیا
بلحاظ اُن کے رسم خط کے نہایت ہی قدیم ہے۔ اور جس قدر قدیم ہے اُسی قدر نادر
اس موقع پر ہم چاہتے ہین کہ اُن کے علمون کا ایک مختصر گوشوارہ اپنے احباب کے
سامنے پیش کر دین۔ اُن کے پُرانے تصانیف قریب قریب سب نظم مین ہین جو اس
کہ اُن کی قدامت کا زبردست ثبوت ہے۔ ظاہر مین لوگ سمجھتے ہین کہ نثر نظم
پر مقدم ہے۔ لیکن علمی دنیا مین یہ صحیح نہین۔ گفتگو مین بیشک نثر کو تقدم ہے۔ مگر
جذبات دلی کے ظاہر کرتے وقت انسان مین ایک ایسی متانت اور غیر معمولی کیفیت
پیدا ہو جاتی ہے کہ پتا چلتا ہے انھین کسی غیر معمولی وضع و عنوان سے ظاہر کیجے۔

شوق نے انسان کو اُس کے بچپن ہی میں نظم کی طرف متوجہ کر دیا - جذبات و خیالاتِ شاعرانہ کو نثر میں ادا کرنا شاعری کے بہت دنوں بعد شروع ہوا - لہذا ہندوؤں میں اُن کے تمام علوم کا نظم میں ادا کیا جانا ہی اُنکی قدامت کا ثبوت ہے -

ہندوؤں کے قریب قریب تمام علوم کو مذہب نے اپنے آغوش میں لے لیا ہے یا اپنا لباس پہنا کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے - اُن کے علوم میں سب سے مقدم چار وید ہیں جو انسان میں مذہبی روح پھونکنے کے مکمل ذرائع ہیں - اُن میں دعاؤں اور مناجاتوں کے ذریعہ سے فلسفۂ دین اور خدا شناسی کی بہت اعلیٰ تعلیم دی گئی ہے وہ چاروں وید حسب ذیل ہیں (اول) رگ وید - (دوسرا) یجر وید - (تیسرا) سام وید (چوتھا) اتھروید - ان چاروں ویدوں کے ماتحت چار اُپ وید ہیں - اور اُن کے نام یہ ہیں (پہلا) ایش (دوسرا) دھنش (تیسرا) گندھرب (چوتھا) ارتھ - ان چاروں اُپ ویدوں کے بعد اُپ انگ ہیں -

چار اُپ وید جن کا ذکر آ چکا ہندو مذہب میں دوسرے درجے کی مقدس و محترم کتابیں ہیں جن میں جراحی - طب - موسیقی - رقاصی - سپہگری - معماری اور دیگر فنونِ علمی کا بیان ہے - اور اُن کے دیکھنے سے انسان کو حیرت ہوتی ہے کہ اُس قدیم زمانے ہی میں ہندوؤں نے امور معاشرت اور ضروریات زندگی کے متعلقہ فنون میں کس قدر ترقی کر لی تھی -

چھ اُپ انگ ان فنون کے بیان میں ہیں جو خاص ویدوں کی تفہیم سے تعلق رکھتے ہیں - یوں کہنا چاہیے کہ ویدوں کے سیکھنے اور برتنے کے آلات ہیں - ان میں فن تجوید ہے جس کے ذریعہ سے ویدوں کی قرأت و تلاوت کے قاعدے معلوم ہوتے ہیں اُن میں الفاظ کے ادا کرنے کے لہجے - آوازوں کے مخارج اور دیگر خصوصیاتِ صوت مذکور ہیں جن کا ویدوں کے پڑھنے کے وقت لحاظ رکھنا ضروری و لازمی ہے اسی سلسلہ میں نحو و صرف کا فن - آوازوں کی ترتیب اور اُن کے باہمی تناسب کے قاعدے اور علوم نجوم و ہیئت بھی بصراحت بتائے گئے ہیں -

ان تمام علموں اور فنون کی نسبت ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ خداوند جل علا نے انھیں الہام کے ذریعہ سے نیک نفس و پاک برہمنوں کے دلوں

مین القا کر دیا تا کہ اُن کی مدد سے دنیا وید کی ربانی تعلیمون سے فائدہ نہ اُٹھا سکتی -

اُپ انگ کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وید انگون کے بعد اور اُن سے کم درجے کے ہین - لیکن اگر غور سے دیکھو تو وہ بہت ہی عظیم الشان اور اعلیٰ درجے کے علوم عقلی و روحانی پر حاوی ہین - اُن مین منطق ہے - اور الٰہیات ہین - یعنی وہ مسائل و رموز علم الٰہی جو ویدون کی تصریحات کی تشریح کے لیے بعد والون کے ذریعہ سے معلوم ہوے - احکام شریعت کا شمار بھی انھین مین ہے - اور اسی سلسلہ مین دیوتاؤن اور پرانے رشیون اور منیون کی کہانیان اور داستانین بھی ہین - ان سب ضروری کتابون کی مجموعی تعداد اٹھارہ ہے اور یہی کتابین پُران کہلاتی ہین جن کے ماننے سے آریہ سماج والے انکار کرتے ہین - لیکن چاہے اُن پر بھروسہ نہ کیا جائے مگر یہ غیر ممکن ہے کہ اُن سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے - اس لیے کہ یہ تمام علوم ویدون کے حرم مین داخل ہونے کی کنجیان ہین - جن کو چھوڑ دیا جائے تو نہ ویدون کے مضامین سے صحیح استدلال کیا جا سکے گا اور نہ اُنکے سمجھنے پر پورا وثوق ہو سکے گا -

مذکورہ علمی کتابون کے علاوہ ہندوون کے قدیم علمی خزانے کا زیور دو نہایت ہی مہتم بالشان منظوم کتابین ہین جو مقدس روایات مین شامل کر دی گئی ہین - یہ دونون رامائن اور مہا بھارت ہین - رامائن مین اجودھیا کے چندر بنسی جدا راجہ رام چندر جی کے حالات و واقعات عجیب موثر و معجز نما شاعری مین بیان کیے گئے ہین جو نہایت ہی دلچسپ و نتیجہ خیز ہین - اور تاریخی قصے کے عنوان سے دینی و روحانی برکتین ظاہر کرتے ہین - رام چندر جی - بشن جی کے ساتوین اوتار مانے جاتے ہین - اور اُنکی زندگی اعلیٰ ترین کمالات انسانی کا نمونہ ہے - مہا بھارت مین وہ عظیم الشان لڑائی مذکور ہے جو ہستناپور کے تخت کے لیے پانڈو اپنے بنی اعمام کورووُن سے لڑے تھے - اور جس کی نسبت ہندوون کا عقیدہ ہے کہ دنیا مین کبھی اس سے بڑی کوئی لڑائی نہین ہوئی تھی - ان کتابون کے مقابلے مین یونان کے پہلے شاعر ہومر کی مثنویان ایلیڈ اور اوڈسے پیش کی جاتی ہین - مگر کیا بلحاظ وسعت بیان اور کیا باعتبار شاعرانہ خوبیون کے یونان کی اُن دونون پرانی منظوم کتابون

کو ہندوستان کی رامائن و مہابھارت سے کوئی نسبت نہین - مہابھارت اٹھارہ کتابون یا بابون پر منقسم ہے اور اُس مین ایک لاکھ سے زیادہ بند ہین -

اب ہندوون کی اُن چند کتابون کا مختصر تذکرہ بھی ضروری ہے جو اُن کے مذکورہ قدیم لٹریچر سے ملحق اور اُنکے ضمیمے ہین - اول مگدھ بُدھ (یعنی حُسن علم) مصنفۂ گوسوامی جی - یہ اصل مین سنسکرت کی بہترین گرامر ہے - جس مین قواعد صرف و نحو نہایت صفائی و توضیح سے بتائے گئے ہین - فن لغت مین سنسکرت کی اٹھارہ کتابین مشہور ہین - مگر اُن سب سے بہتر اور مکمل "امر سنگھ" ہے -

سنسکرت کی نظمون سے عجب قسم کا سوز و گداز اور نہایت ہی شیرینی ظاہر ہوتی ہے جس کا آغاز اُن کے قدیم تر شاعر والمیکی جی سے ہوا ہے - انھون نے اپنی مشہور کتاب رامائن کے علاوہ ایک اور پُر درد واقعہ منظوم کیا ہے - وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک نوجوان اپنی تازہ آفرین معشوقہ کے ساتھ گھربار سے دُور ایک پُرفضا دشت مین سب سے الگ تھلگ رہتا تھا - جو مارڈالا گیا - اور اُس کی معشوقہ اُس جنگل مین اپنے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جانے والے عاشق کی لاش پر روتی پیٹتی اور آہ و زاری کرتی ہے - ظاہر ہے کہ والمیکی کے متبرک قلم نے جسے مبدأ فیاض سے الہامی مدد ملتی تھی اس حسرتناک داستان مین کیسا سوز و گداز اور کیسا دل کو تڑپا دینے والا اثر پیدا کر دیا ہوگا -

ڈراما کی ایجاد اگرچہ بہت پہلے ہو چکی تھی مگر کالی داس کی شہرت نے پُرانے سنسکرت ڈراما کو تقریباً فنا کر دیا - یورپ والے اب جو اسکے کمالات سے واقف ہوے ہین اسے مشرق کا شیکسپیر کہتے ہین - اس کا بہترین ڈراما "سکنتلا" ہے جس کا ترجمہ انگریزی مین سر ولیم جونس نے اور جرمنی زبان مین فارسٹر ہرڈر اور دیگر سنسکرت دان مصنفین جرمنی نے کیا ہے - ہرڈر کو یہ ڈراما اس قدر پسند آیا کہ کہتا ہے "اس عظیم الشان ڈراما کا ہر سین ایک چمن ہے - جس کی ہر ہر کیاری مین سے دلچسپ واقعات فطرتی طور پر خوبصورت پودھون کی طرح اُگ آتے ہین - اور اس مین کثرت سے وہ پُر اثر اور نازک خیالات ملتے ہین جن کا یونانی ڈراما مین کہین پتہ نہین - اسی کالی داس کی ایک اور نظم "میگھ دوت" ہے -

دلکنسن نے انگریزی مین اس کا ترجمہ کیا ہے اور شرق کے شاعرانہ کمالات پر شعرائے مغرب کو حیران کر دیا ہے۔

ہندو لٹریچر کی قدر یورپ خصوصاً جرمنی مین روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ مگر ہندو لوگ محض اس غرور مین کہ یہ علوم اُن کے اور اُنکے گھر کے ہین اُس قدر توجہ نہین کرتے جیسی کہ ہونی چاہیے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ہندوٗن کو سنسکرت دانی کا شوق ہو چلا ہے۔ اور جا بجا اُس کے مدارس اور کالج قائم ہو رہے ہین۔ خصوصاً بنارس تعلیم سنسکرت کی اعلیٰ یونیورسٹی قرار پا گیا ہے۔ لیکن جب تک سرکاری یونیورسٹیون کا یہی طرز عمل رہے گا اور جب تک یونیورسٹی کی ڈگریان ذریعۂ معیشت بنی رہین گی ابنائے وطن مین ہندو ہون یا مسلمان تحصیل علم کا سچا ذوق پیدا ہونا دشوار ہے۔ دعویٰ کیا جاتا ہے اور بظاہر صحیح بھی نظر آتا ہے کہ ان یونیورسٹیون اور تعلیم کے موجودہ انتظامات نے ہندستان مین علم کو بڑھا دیا ہے۔ لیکن اگر غور کرو تو علم بڑھا نہین بلکہ گھٹا اور گھٹتا جاتا ہے۔ جو قوم علم کو کاسۂ گدائی بنانا چاہتی ہو اُسے علم ہرگز نہین آ سکتا۔ اگلے زمانے کا ایک متبحر ویدانت یا شاستری اسی طرح مسلمانون مین ایک عالم و فاضل آج کل کے سیکڑون سند یافتہ گریجویٹون سے اچھا تھا۔ ویسے دو عالم اچھے اور ایسے دو ہزار زبردست علم فروش نہین اچھے۔ کاش ہندو مسلمان اپنی اپنی یونیورسٹیان قائم کرنے کے خبط کے عوض اس بات کی کوشش کرتے کہ سرکاری یونیورسٹیان علم کی سچی اکاڈیمیان بنا دی جائین۔ اور ملازمت و کسب معیشت سے انکو کوئی واسطہ نہ رہے جیسا کہ خود انگلستان مین ہے۔ مگر ابھی ہندوستانیون کو اسکی مصلحت سمجھنے کے قابل ہوش نہین آیا ہے۔ ابھی اس مسئلے کو چھیڑنا انگریزی تعلیم یافتون اور گریجویٹون کے حقوق مین دخل دینا ہے۔ وہ زمانہ بعد آئے گا جب ہندوستان کے تمام فرزندون کو معلوم ہوگا کہ اپنے وطن۔ اپنی قوم۔ اپنے علوم۔ اور اپنے قدیم کمالات کے حقوق چند گریجوایٹون کے حقوق سے مقدم ہین۔

چیچک کا ٹیکہ اور لیڈی ماٹیگو

کتنی بڑی حیرت کی بات ہے کہ چیچک کا ٹیکہ جو آج دنیا مین خدا کی ایک بڑی بھاری برکت ہے اور جس کے رواج دینے پر یورپ جسقدر فخر و ناز کرے بجا ہے دراصل ایک مشرقی علاج ہے۔ اور غالباً مسلمانون ہی سے لیا گیا ہے۔

ہم ہندوستان مین دیکھتے ہین کہ کامیابی کے اتنے تجربون کے بعد بھی اب تک یہ حال ہے کہ ٹیکہ لگائے جانے کے خوف سے مائین بچون کو چھپاتی پھرتی ہین۔ پُرانے مذاق کے باپ بھائی ننھے بچون کے لیے ٹیکہ لگانے والون سے کشتیان لڑنے یا اُنھین رشوتین دینے کو تیار ہو جاتے ہین۔ بڑے بڑے مہذب لوگون کا یہ حال ہے کہ دفع الوقتی کے لیے جھوٹ فقرے بناتے ہین اور بہت سے ملکی حکیم اور وید بھی باوجود عقل رکھنے کے اپنی طرف سے تصنیف کر کر کے ٹیکے کے رواج دینے پر مختلف اور طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہین۔ اور یہ نہین پسند کرتے کہ اس لاکھون دفعہ کے آزمائے ہوے علاج سے فائدہ اُٹھایا جائے اُن کی اِس نفرت و مخالفت کو دیکھ کے جب ہم اس کا خیال کرتے ہین کہ یہ طریقۂ علاج اُنھین کے یہان سے سیکھا گیا ہے تو بڑی حیرت معلوم ہوتی ہے۔ اور تعجب آتا آتا ہے کہ اپنی ہی چیز اگر غیرون کے ہاتھ سے ملے تو وہ کس قدر اجنبی اور مہیب بن جاتی ہے؟

ٹیکے کو سب سے پہلے انگلستان کی ایک تعلیم یافتہ شریف زادی اور ہنرمند و دانا خاتون نے رواج دیا جس کا نام لیڈی ماٹیگو میری ورٹلی تھا۔ وہ ۱۱۱۹ھ ہجری (۱۶۹۰ء) مین انگلستان کے علاقۂ نوٹنگھم شائر مین پیدا ہوئی تھی۔ اعلیٰ درجے کے امیر اور شریف گھرانے کی بیٹی تھی اس کے لیے اچھی صحبت مین نشو و نما ہوا۔ اُس کا باپ ڈیوک آف کنگسٹن روشن خیال امرائے انگلستان مین تھا جس نے بیٹی کو اچھی سے اچھی تعلیم دلائی۔ اور بیٹی کو بھی علم و فضل کا ایسا شوق تھا کہ لاطینی زبان مین بہت اچھا درخور حاصل کر لیا اور بڑی نمایان ترقی کی۔

بائیس برس کے سن کو پہونچی تو انگلستان کے ایک نامی گھرانے کے اقبالمند نوجوان ایڈورڈ ورٹلی مانٹگو کے ساتھ شادی ہوگئی۔ جو پہلے ارل آف سینڈوچ کا فرزند تھا۔ چند روز میں وہ بڑا قابل۔ آزاد اور روشن خیال ممبر ثابت ہوا۔ مشہور شاعر ایڈیسن سے اُس سے بڑی دوستی تھی۔ اور انگلستان کے اعلیٰ درجے کے مدبران سلطنت میں شمار کیا جاتا تھا۔

۱۱۴۵ھ محمدی (۱۷۱۶ء) میں مسٹر مانٹگو قسطنطنیہ کے سفیر مقرر ہوگئے دولت عثمانیہ کے دارالسلطنت کو روانہ ہوئے اور لیڈی میری مانٹگو نے بھی جن کی عمر اب ۲۶ برس کی تھی پیارے شوہر کے ساتھ استنبول کی راہ لی۔ جہاں دونوں میاں بیوی کو دو سال تک رہنا پڑا۔

قسطنطنیہ میں انگلستان کے بہت سے سفیر اس سے پہلے بھی آچکے ہونگے مگر مسٹر مانٹگو نے محض اپنی بیوی کی قابلیت سے جو ناموری و شہرت حاصل کی اس سے پہلے کسی کو نہیں نصیب ہوئی تھی۔ لیڈی میری یہاں ترکی امرا کے خاندانوں سے ملیں اُنکے حالات دریافت کیے۔ اور جو کچھ واقعات معلوم ہوتے اُنھیں لکھ لکھ کے لنڈن میں اپنے دوستوں کو بھیجا کرتیں۔ یہ خطوط اسقدر دلچسپ تھے کہ لوگوں نے شوق اور قدر سے جمع کیے۔ اور ہر طرف لوگوں میں اُنکے پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔

قیام قسطنطنیہ کے زمانے ہی میں لیڈی میری مانٹگو کو پتہ لگا کہ یہاں کے بعض گاؤں میں چیچک کے روکنے کے لیے بعض مائیں اپنے بچوں کے ٹیکہ لگایا کرتی ہیں۔ اس نئے اور عجیب علاج کو اُنھوں نے اُس گاؤں میں جاکے دریافت کیا۔ جو عورتیں اُس کا طریقہ جانتی تھیں اُن سے مل کے کیفیت معلوم کی۔ اُن لڑکوں کو دیکھا جن کے ٹیکہ لگایا گیا تھا۔ خوب اچھی طرح آزما لینے کے بعد خود اپنے فرزند کے ٹیکہ لگایا۔ اور دیکھا کہ وہ چیچک سے بالکل محفوظ رہا تب اُنھوں نے آزمایش کے لیے اور بہت سے لڑکوں کے ٹیکہ لگایا۔ اور پھر اُسے عام لوگوں میں پھیلانے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی یورپ میں اُن کی کوشش سے ٹیکے کا رواج ہوگیا۔ اور لوگ اس علمی علاج کی قدر کرنے لگے۔

سنہ ۱۱۴۷ محمدی (سنہ ۱۷۱۸ء) میں لیڈی میری اپنے شوہر کے ساتھ انگلستان واپس آئیں اور مقام ٹوئی کنہم میں بود و باش اختیار کی۔ اب یہاں اُن سے انگریزی کے مشہور شاعر پوپ سے بہت راہ و رسم ہوگیا تھا۔ اور گو کہ وہ اپنے دلچسپی کے اوقات پوپ کی صحبت میں بسر کرتی تھیں مگر یہاں بھی انھیں شب و روز ٹیکے کے رواج دینے کی فکر رہا کرتی تھی۔

اسکے بعد خدا جانے کیا بات ہوئی کہ پوپ سے بگڑ گئی۔ اور پوپ نے باوجود ایک بلند خیال اور روشن دماغ شاعر ہونے کے جذبے میں آکے لیڈی میری کی ہجو میں چند شعر کہہ ڈالے جن میں اُن کے اخلاق پر حملہ کیا۔ اور چاہا کہ لیڈی میری کی مسلمہ ناموری۔ قابلیت۔ پاکیزگی خیال اور نیک نفسی کی شہرت کو خاک میں ملا دیں۔ مگر چونکہ اخلاقی جرأت نہ تھی اور پوپ کے دل میں خود ہی چور تھا اس لیے اُن اشعار کو گمنام طور پر شایع کیا۔ اگر کسی نے پوچھا بھی کہ یہ آپ کے اشعار ہیں تو انکار کر دیا لیکن ایسی باتیں کہیں چھپائے چھپی ہیں؟ ہر جگہ شہرت ہوگئی کہ یہ شعر اصل میں پوپ صاحب کے ہیں۔ مگر چونکہ بے اصل و حقیقت ہیں اس لیے وہ اپنی طرف منسوب کرتے ڈرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے اسکے کہ لیڈی میری کے نام پر کسی قسم کا حرف آئے خود پوپ کو سخت بدنامی نصیب ہوئی۔ عام لوگوں نے اُنکی اس حرکت کو ناپسند کیا اور اُلٹے اُنھیں کو ذلیل و کمینہ سمجھنے لگے۔

اب سنہ ۱۱۶۸ محمدی (سنہ ۱۷۳۹ء) شروع ہوا۔ اور لیڈی میری کا سن ۴۹ سال کا تھا۔ طبیعت ناساز رہنے لگی۔ اور معلوم ہوا کہ انگلستان کی آب و ہوا موافق نہیں ہے۔ تبدیل آب و ہوا کے لیے اٹالیہ کا سفر کیا۔ وہاں شہر وینس میں جاکے اقامت گزیں ہوئیں۔ اور صحبت برقرار رکھنے کے لئے اس طرح پاؤں توڑ کے بیٹھیں کہ ۲۲ سال وہیں گذر گئے۔ سنہ ۱۱۶۸ محمدی میں گئی تھیں اور سنہ ۱۱۹۰ محمدی (سنہ ۱۷۶۱ء) میں ۷۱ برس کی بوڑھی اور واجب التعظیم خاتون بن کے پھر انگلستان میں آئیں۔ اس لیے کہ اُنکی صاحبزادی لیڈی ہیوٹ نے تاکید سے بلایا تھا۔ مگر عمر پوری ہو چکی تھی۔ تندرستی نے جواب دے دیا۔ اور وطن میں آکے

شاید پورے ایک برس بھی نہ رہی ہون گی کہ سنہ ۱۱۹۱ محمدی (سنہ ۱۷۶۲ء) مین دنیا سے رخصت ہو گئین۔ اور ناموری و نیکوکاری کے رجسٹر مین اپنا نام لکھوا کے دوسرے عالم باقی مین جا پہونچین۔

مگر دنیا مین اُن کی دو نہایت ہی قابل قدر یادگارین ہمیشہ باقی رہین گی۔ جن مین سے ایک بھی کسی کو حاصل ہو تو اُس کی ناموری و برکت کے زندہ رکھنے کو کافی ہے۔ ایک تو چیچک کا ٹیکہ جس سے اب ساری دنیا نفع اُٹھا رہی ہے۔ اور ہندوستان ہی نہین دنیا کے ہر ایک مین شہرون اور گانؤن کے اندر لیڈی میری کی یہ یادگار اپنی برکتون سے نوعِ انسانی کو نفع پہونچا رہی ہے۔

اور دوسری یادگار اُن کے وہ خطوط ہین جو اُنھون نے قسطنطنیہ سے اپنے احباب کو لکھے تھے۔ انگلستان کے لوگون مین اُن کے مطالعہ کا شوق اس قدر بڑھا کہ اُن کی وفات کے دوسرے ہی سال یعنی سنہ ۱۱۹۲ محمدی مین وہ تین جلدون مین مرتب ومدون ہو کے چھپے اور شایع ہوے۔ چند روز بعد لوگون کو کچھ اور خطوط ملے اور چوتھی جلد بھی مرتب ہو کے شایع ہو گئی۔ ان خطوط کی زبان ایسی دلکش اور شیرین تھی کہ بہت ہی پسند کیے گئے خصوصًا اسلیے کہ ترکون کے قومی خصائص معلوم ہونے کا یورپ مین جس قدر شوق تھا اُسی قدر حالات سے لاعلمی تھی۔ لیڈی میری سے پہلے کسی نے ایسی تفصیل وتحقیق سے آلِ عثمان کے حالات نہین بتائے تھے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ترکون کے حالات مین جو پہلی کتاب انگلستان مین شایع ہوئی یہی تھی۔

لوگون نے اس کتاب کے لیے اس کثرت سے شوق کے ہاتھ پھیلائے کہ پہلا ایڈیشن چند ہی روز مین ختم ہو گیا۔ دوبارہ چھپی اور تھوڑے زمانے مین فروخت ہو گئی۔ غرض برابر ایڈیشن پر ایڈیشن شایع ہوتے چلے جاتے تھے۔ یہان تک کہ سنہ ۱۲۳۲ محمدی (سنہ ۱۸۳۰ء) مین یعنی لیڈی میری کی وفات کے ۶۸ برس بعد اُن کے صاحبزادے نے از سر نو درست اور مرتب کر کے اُن خطوط کی چارون جلدون اور اپنی ماں کی دیگر قابل قدر تصانیف کا ایک نیا اعلیٰ درجے کا ایڈیشن شایع کیا۔

لیڈی میری کے صاحبزادے ایڈورڈ ورٹلی مانٹیگو کی نسبت کہتے ہیں کہ دماغ بگڑا ہوا تھا۔ امارت اور گھر کی فارغ البالی پسند نہ تھی۔ جب دل میں آتی گھر سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ اور کسی ایسے کام کو اختیار کر لیتے جو اُن کی حالت و حیثیت سے بہت ہی گرا ہوا ہوتا۔ دوسرا کمال اُن میں یہ تھا کہ سچ سے نفرت تھی۔ غلط اور بے بنیاد واقعات کو اس طرح شوکتِ الفاظ سے بیان کرتے اور ایسے لقلقے باندھ دیتے کہ سننے والے کو سچ کا یقین آ جاتا۔ اس میں اس قدر بلکہ بڑھا ہوا تھا کہ فی البدیہہ قصے پر قصے دل سے بٹ کے بیان کرتے چلے جاتے اور کیا مجال کہ سلسلہ ٹوٹ جائے۔ مگر بھاگنا قیامت تھا۔

پہلی بار بھاگے تو گھر والوں کو ملنے سے یاس ہو گئی۔ چند روز بعد پتہ لگا کہ آپ ایک چمنی سوئپ کے نوکر ہیں۔ انگلستان کے ہر مکان بلکہ ہر کمرے میں آتش خانہ بنا ہوتا ہے۔ اُس میں سے دھواں نکلنے کے لیے جو نل دیوار کے اندر ہی اندر اوپر تک چلا جاتا ہے اُسے چمنی کہتے ہیں۔ اس چمنی میں دو چار مہینے میں اتنا کاجل جمع ہو جاتا ہے کہ نہ نکالا جائے تو راستہ بند ہو جائے۔ اس لیے وہاں بہت سے لوگ چمنی سوئپری یعنی چمنیوں میں سے کاجل جھاڑنے کا کام کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے کپڑوں میں چونکہ ہمیشہ کاجل بھرا رہتا ہے اس لیے حد سے زیادہ میلے کچیلے رہتے ہیں۔ اور انگلستان میں جو شخص جتنا زیادہ میلا ہو اُسی قدر زیادہ ذلیل و حقیر تصور کیا جاتا ہے۔ غرض چمنی سوئپروں سے زیادہ ذلیل اُس سرزمین میں کوئی نہیں ہوتا۔ مگر آپ کو جوشِ خاکساری میں یہی پیشہ سب سے زیادہ پسند آیا۔

لوگوں کو معلوم ہوا تو سمجھا بجھا کے گھر میں لے آئے۔ لیکن چند روز بعد پھر رفوچکر ہو گئے۔ ابکی خبر لگی کہ ایک مچھلی والے کے شاگرد ہیں۔ اور اُس کے ساتھ کشتی میں بیٹھے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ لوگ گھیر گھار کے پھر لائے۔ مگر تھوڑے زمانہ کے بعد پھر چمپت ہو گئے۔ ابکی شاید ماں کے مطبوعہ خطوط کا اثر تھا کہ قسطنطنیہ میں آ کے ترکوں کی طرح رہنے لگے۔ اُنھیں کی وضع اختیار کرلی۔ اُنھیں کے سے کپڑے علانیہ پہننا شروع کیے۔ اُنھیں کی سی ٹوپی اور بھاری دستار سر پر تھی۔ اور چونکہ آخری

پوری پوری معاشرت اختیار کرلی تھی اس لیے ہمیں امید ہے کہ تثلیث سے توبہ کر کے مسلمان بھی ہو گئے ہوں گے - لہذا ہم اُن کے حق میں دعاے مغفرت کر کے سلسلہ بیان کو ختم کرتے ہیں -

عربی رسم خط

۶ نومبر سنہ ۱۹۱۴ء کے ہمدرد میں بیت المقدس سے خواجہ کمال الدین صاحب کا ایک خط شایع ہوا ہے جس میں جناب موصوف خط نسخ کی تاریخ کے متعلق مسلمانوں کی تحقیق معلوم کرنا چاہتے ہیں - میں نے اس مسئلے پر کسی حد تک غور کیا ہے اور جابجا کچھ لکھا بھی ہے - اگرچہ اس وقت میرے پاس کافی کتبخانہ نہیں موجود ہے - تاہم جس نتیجے کو میں پہونچا ہوں اُسے بکمال ادب خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کیے دیتا ہوں -

ہمارے پیغمبر علیہ السلام ہی اُمّی نہ تھے بلکہ ساری قوم عرب اُمّی تھی جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے "بعث فی الاُمّیین رسولاً" قدیم الایام میں ارض یمن میں ایک خط مروج تھا جو جدا جدا حرفوں میں لکھا جاتا - اور سواے اُمرا و شرفاے قوم کے کسی عامی کو نہ بتایا جاتا - اس علمی بخل کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب نیّر اسلام چمکا ہے اُس خط کا جاننے والا دنیا میں کوئی نہ تھا -

ولادت سرور کائنات علیہ السلام کے قریب ہی ابو سفیان کے والد حرب بن اُمیّہ ارض حیرہ سے ایک خط سیکھ آئے اور دو چار دوستوں اور عزیزوں کو بھی سکھا دیا - خود حرب کا بیان تھا کہ میں نے اس خط کو حیرہ کے ایک شخص اسلم بن سدرہ سے سیکھا - اور وہ علاقۂ انبار کے ایک شخص مرامر بن مرہ کا شاگرد تھا اور چونکہ مرامر کا کوئی اُستاد نہیں معلوم تھا اس لیے قریش میں خیال پھیل گیا کہ اس خط کا پہلا موجد مرامر ہے - اور ارض انبار اُس کا مولد ہے (ملاحظہ ہو ابن خلکان - حالات علی بن ہلال المعروف بہ ابن بواب کاتب)

غرض یہی عربی کی پہلی تحریر اور ہمارے موجودہ خط نسخ کا نقش اولین ہے - اسی میں قرآن مجید لکھا گیا - اسی میں آن حضرت صلعم کے خطوط و معاہدات لکھے گئے

اور اسی مین صحابہ مراسلت کرتے تھے مگر اپنی ابتدائی حالت مین یہ خط اس قدر ناقص تھا کہ جس قدر رواج پاتا تھا اُسی قدر زیادہ اُس مین اصلاحون اور ترمیمون کی ضرورت محسوس ہوتی جاتی تھی۔ اور یقیناً بہت سی اصلاحین ہوئی ہونگی جن کی ہمین خبر نہین ہے۔

اس عہد کے نمونے ہمارے ہاتھ مین بہت ہی کم ہین جن سے کچھ اندازہ کیا جائے۔ آنحضرت نے جو خطوط لکھوا کے بھیجے تھے اُن مین سے دو خط اہل یورپ نے خدا جانے کیونکر اور کہان سے برآمد کرکے پیش کیے ہین اور دعوے کیا جاتا ہے کہ وہ اصلی خط ہین۔ ان دونون کے فوٹو مین نے دیکھے ہین۔ ایک مسیلمہ کذاب کے نام ہے ۱۸۹۶ء مین لندن کے پکچر میگزین نام ایک رسالہ مین چھپا تھا۔ مین نے اُس کا ورق نکال کے اُس کی پلیٹ بنوائی ہے جو میرے پاس احتیاط سے رکھی ہے گو ابھی تک چھپوانے کی نوبت نہین آئی۔ دوسرا خط فرمان روائے مصر مقوقس کے نام ہے جس کا فوٹو ہیروز آف دی نیشن سیریز کی کتاب "محمدؐ" مصنفہ ڈی۔ اس۔ مارگولیوتھ مین مصر کے رسالہ الہلال سے لے کے درج کیا گیا ہے۔

ان دونون خطوط کی تحریر ایک ہی زمانے۔ ایک ہی وضع۔ اور ایک ہی شان کی ہے۔ اور دونون کے نیچے آپ کی مُہر ہے۔ خطوط کی عبارت کے الفاظ بھی وہی ہین جو احادیث مین صحیح روایات سے مروی ہین۔ بہرحال انکو دیکھ کے یقین ہوتا ہے کہ اصلی تحریرین ہین۔ اور یہی میرا خیال ہے۔ چنانچہ مین ان خطوط کے فوٹوون کو تمام اگلے تبرکات سے زیادہ واجب التعظیم اور حرز جان بنانے کے قابل خیال کرتا ہون۔ اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ہم ان مبارک نامہ ہائے رسالت کا جن پر آپ کی مُہر مبارک ثبت ہے اور اُنکی تاریخ کا پتہ لگاتے کہ کیونکر محفوظ رہے۔ کہان سے کہان پہونچے۔ کس سے کس کو ملے۔ اور آخر مین کیونکر اہل یورپ کے ہاتھ آئے؟

ان خطوط کے بعد کی تحریر کا نمونہ حضرت عثمان ذی النورینؓ کے عہد کے قرآن پاک ہو سکتے ہین۔ جن کا کوئی نسخہ اسوقت تک کسی ہندوستانی مسلمان کی نظر سے

نہین گذرا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن مین کا ایک قرآن قسطنطنیہ مین موجود ہے۔ اگر خواجہ صاحب کسی تدبیر سے اُس کی زیارت سے شرفیاب ہو کے اُسکے کسی صفحے کا فوٹو حاصل کرین اور اُسے شایع کر دین تو مسلمانون پر بڑا احسان کرین۔

مذکورہ بالا دونون خطوط رسالت کی تحریر کی شان یہ ہے کہ نہ نقطے ہین نہ اعراب ہین نہ علامات اوقاف ہین۔ الف سیدھی لکیر نہین بلکہ نیچے کا سرا پیچھے مڑا ہوا ہے جس سے اُسکی قطع "ا" کی سی ہے۔ عظیم کا لفظ یون لکھا ہے "عطىم" القبط کی صورت یہ ہے "ما لعىط"۔ سلام کی وضع تحریر یہ ہے "سلم" الھدی کی صورت یہ ہے "ما لھـدى"۔ من کی صورت "مں" اور بعضنا بعضا کو "بعصا بعصا"۔ معلوم ہوتا ہے کہ نصب کے ساتھ تنوین مین ایک الف جو موجودہ رسم خط مین بڑھا دیا جاتا ہے یہ اُسی زمانے کا ہے۔ اشھدوا کی صورت "اسھدوا" ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جمع کے آخر کا الف بھی اُسی زمانے کا ہے۔ اس کی پابندی نہین ہے کہ لفظ سطر مین ختم ہی ہو جائے۔ "ورسولہ" مین سے "ور" ایک سطر کے آخر مین ہے اور "سولہ" دوسری سطر کے شروع مین۔ "تولوا" مین سے "ت" ایک سطر مین ہے اور "ولوا" دوسری سطر مین۔ "مسلمون" مین سے "مس" ایک سطر کے آخر مین ہے اور "لمون" دوسری سطر کے شروع مین۔

خلفائے راشدین کے عہد مین اس خط مین کسی نمایان تغیر کا پتہ نہین چلتا۔ سب سے پہلے اس تحریر کے نقصان پر ابوالاسود دوئلی کی نظر پڑی جن کا حال مین نے مئی اور جون ۱۹۱۳ء کے دلگداز مین لکھا ہے۔ انھین نے رسم خط کی اصلاح کی اور انھین نے ابتدائی قواعد نحو عرب کو بھی مدون کیا۔

زیاد نے حکومت بصرہ کے زمانے مین اُن سے خواہش کی تھی کہ قرآن کے رسم خط کی اصلاح کیجیے مگر اُنھون نے غالبًا قرآن کے متعلق سنت قدیم مین دخل دینا بدعت خیال کر کے انکار کر دیا۔ لیکن ایک دن ایک قاری قرآن کو اِنَّ اللّٰہَ بَرِیٌٔ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ مین رَسُوْلُہٗ کو "رَسُوْلِہٖ" پڑھتے سُن کے ایسے گھبرائے کہ زیاد کے پاس دوڑے گئے۔ اور کہا "اب مین آپ

کی خواہش پوری کرنے کو موجود ہوں۔ پھر اُس سے ایک کاتب لیا۔ اور اُسے پاس بٹھلا کے ہدایت کی کہ میں قرآن کو لکھواتا ہوں۔ جس حرف کے ادا کرنے میں میں اپنا منہ کھول دیا کروں اُس کے اوپر تم ایک نقطہ لگا دیا کرو۔ جس حرف کو میں منہ کو گول کر کے ادا کیا کروں تم اُس کے آگے ایک نقطہ لگا دیا کرو۔ جس حرف کے ادا کرنے میں آواز کا رخ نیچے کی طرف ہو تم اُسکے نیچے نقطہ دیا کرو۔ غرض قرآن میں پہلے پہل یہ اعراب لگائے گئے۔ جن کی صورت ابتدائی ایجاد میں بجائے ترچھی لکیروں کے نقطوں کی سی تھی۔ اور پیش بجائے حرف کے اوپر کے سامنے لگایا جاتا تھا۔ آج کل جو نقطے ب ت اور ث میں یا ج۔ ح۔ خ کا امتیاز بنایا کرتے ہیں اُن کا اُسوقت تک مطلقاً پتہ نہ تھا۔ اور نہ شاید اُن کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔

ابو الاسود دوئلی نے ۶۹ھ میں انتقال کیا۔ اُنکے بعد کہتے ہیں کہ میمون بن اقرن نے پھر عنبسہ بن معدان فہری نے پھر عبداللہ بن ابی اسحٰق حضرمی نے۔ پھر ابو عمرو بن علاء المتوفی ۱۵۴ھ نے اس خط میں اور اصلاحیں کیں۔ مگر ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا اصلاحیں تھیں۔ یہاں تک کہ خلیل بن احمد ازدی المتوفی ۱۷۰ھ اور علی بن حمزہ کسائی المتوفی ۱۸۲ھ کا زمانہ آیا جبکہ کوفے اور بصرے میں نحو و صرف اور علم زبان کا شباب تھا۔ کہتے ہیں کہ خلیل نے ترقی خط کی طرف بہت توجہ کی اور اس درجے کو پہونچا دیا کہ کسائی نے جو مامون رشید کا اُستاد اور علمی ترقیوں کا بیحد شایق تھا خط عربی میں ایک نئی شان پیدا کی جسکو اہل کوفہ نے بے انتہا پسند کیا۔ اور وہی خط "خط کوفی" کے نام سے مشہور ہوا (ملاحظہ ہوں کتاب الفہرس ابن الندیم۔ ابن خلکان حالات ابن مقلہ کاتب۔ وابن البواب کاتب۔ اور آغانی جلد ۱۱ صفحہ ۱۰۶ حالات ابو الاسود دوئلی) اس کو میں نہ مانوں گا کہ کسائی نے یک بیک پرانے خط کو بدل کے خط کوفی کر دیا۔ دراصل مسلسل تغیروں اور ترمیموں نے رفتہ رفتہ خود ہی اس خط کی یہ صورت بنا دی تھی۔ کسائی نے قواعد نقاشی و خوشنویسی کو کام میں لا کے قوم کی تحریر کی ایک خاص شان پیدا کر دی۔ جسے لوگوں نے عموماً پسند کیا اور اُسی

اُسی کی پیروی کرنے لگے۔

تاہم اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ خط کوفی کی ایجاد ۱۸۲ھ کے قریب ہوئی ہے۔ اس سے پہلے جو خط مروج تھا کوفی نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک کوفے کو کوئی علمی حیثیت ہی نہین حاصل ہوئی تھی۔ حضرت علیؓ نے کوفے کی سکونت اختیار کی۔ اور اسی وجہ سے اکثر عوام مین مشہور ہے کہ حضرت علیؓ کے ہاتھ کے لکھے ہوے قرآن خط کوفی مین تھے۔ مگر انھین اس کی خبر نہین کہ اُن دنون کوفہ تو بیشک تھا اور کوفہ مین حضرت علیؓ بھی تھے۔ مگر خط کوفی نہ تھا جس کا کاتب حضرت علیؓ کو فرض کر لیا گیا ہے۔ خط کوفی کا دَور دوسری صدی ہجری کے آخر سے شروع ہوا ہے۔ جبکہ ہارون رشید کا زمانہ تھا۔

مامون کے زمانے کی ایک فرد حساب کا فوٹو مین نے مدت ہوئی مولانا شبلی کے پاس دیکھا تھا۔ جس کی اصل یورپ کے کسی کتب خانے مین موجود ہے۔ گو اسوقت پوری تفصیل سے اُسکے حرفون کی شکلین یاد نہین ہین۔ مگر اجمالی نظر ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نہایت ہی پختہ اور پاکیزہ خط ہے۔ اور خط کوفی کی گھسیٹ ہے۔

اب مجھے یہ بتانا ہے کہ خط کوفی مین اور پُرانے خطون مین کیا فرق تھا۔ مین نے خط کوفی کا کوئی مکمل قرآن نہین دیکھا ہے۔ لیکن ہیروز آف دی نیشن سیریز کی کتاب "محمدؐ" مصنفہ ڈی۔ اِس۔ مارگولیوتھ مین خط کوفی کے ایک قرآن کے ایک صفحے کا فوٹو موجود ہے۔ اصل نسخہ بوڈلین لائبریری کا ہے اور معلوم نہین کہ کس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس مین الف کی قطع "ا" د کی قطع "د" ن کی قطع "ا" ہے۔ اس مین شک نہین کہ خط خوبصورت اور زیادہ واضح و روشن ہو گیا ہے مگر اُسی پُرانے خط سے ملتا ہوا ہے۔ صرف پختگی اور ایک مصورانہ مناسبت و ہم وضعی پیدا ہو گئی ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ اس کوفی خط کے قرآن مین اعراب کا کہین پتہ نہین۔ نہ نقطے ہی ہین اور نہ ترچھی لکیرین ہین معلوم ہوتا ہے کہ ابوالاسود کی ایجاد کا عام طور پر رواج نہین ہو اتھا خاص ہی خاص نسخہ ہاے قرآن مین اُن کے رسم خط کی پابندی کی جاتی ہو گی مگر عام کاتب

اُن کا لحاظ نہ کرتے تھے۔

اس خط کوفی میں سب سے بڑی مفید ترقی یہ ہوئی ہے کہ موجودہ نقطوں کی بنا پڑ گئی۔ جن سے اُن تمام مختلف الصوت حرفوں میں امتیاز کر لیا جا سکتا ہے جو ہمشکل ہیں۔ مگر خط کوفی کے نقطے ہمارے موجودہ خط نسخ کے نقطے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کی جگہ نیچے اوپر باریک ترچھی لکیریں زیر زبر کی سی اختیار کی گئی ہیں۔ مثلاً یا ایھا المزمل قم اللیل کو "یاٮھا ما لمرمل ٯم اللیل" کی وضع میں لکھا ہے۔ اس سے بیشک یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب ب ت ث اور اسی طرح کے دیگر حروف میں امتیاز کی ضرورت محسوس ہوئی تو بجائے نقطوں کے ترچھی باریک لکیریں اختیار کی گئیں۔ اور نقطوں سے جو ابو الاسود نے ابتداءً اعراب و حرکات بنانے کا کام لیا تھا وہ خاص خاص قرآنوں میں تھے۔ عام تحریروں اور کتابوں میں انکی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔

اب اس وقت سے کچھ کم ڈیڑھ سو برس تک خط کوفی کا زمانہ رہا۔ مگر زمانہ جو جو گذرتا جاتا تھا اس خط میں بھی کچھ نہ کچھ تغیر اور ردو بدل کرتا جاتا تھا۔ خط کوفی جیسا کہ ہمیں نظر آتا ہے زود نویسی کے لیے موزون نہ تھا۔ چنانچہ سنہ ۲۷۲ھ میں زمانے نے ابو علی محمد بن علی بن حسین کاتب کو جو "ابن مقلہ" کے لقب سے مشہور ہے پیدا کیا۔ یہ بہت بڑا شخص تھا۔ اور اگرچہ اس کی زندگی اسقدر پر آشوب تھی کہ ترقی کی تو خلافت بغداد کا وزیر اعظم بن گیا۔ اور اقبال نے ساتھ چھوڑا تو ہاتھ کاٹا گیا۔ زبان کاٹی گئی۔ قید ہوا۔ اور خدا جانے کیسی کیسی مصیبتیں جھیل کے ۳۲۸ھ میں چھپن برس کی عمر میں قید خانے ہی کے اندر مرا۔ لیکن ناقدردان دشمن اُس کی جان لے سکتے تھے اُس کے کمالات کا مٹانا غیر ممکن تھا۔

دیگر کمالات کے علاوہ ابن مقلہ خوشنویسی اور خط نسخ کی اصلاح میں بھی کمال رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے مروجہ خط کوفی کو تقویم پارینہ کرکے موجودہ خط نسخ ایجاد کیا۔ (ملاحظہ ہو ابن خلکان حالات ابن مقلہ کاتب) اس نے خط میں اعراب و حرکات کے اظہار کے واسطے ابو الاسود دوئلی کے نقطوں کو موقوف کرکے زیر۔ زبر کے لیے حرف کے اوپر اور نیچے ترچھی لکیریں اور پیش۔ جزم۔ تشدید

دو زبر اور دو زیر کی موجودہ تشکلیں اختیار کی گئیں۔ متشابہ حرفون کے باہمی امتیاز کے لیے خط کوفی کی باریک ترچھی لکیرون کو چھوڑ کے نقطے قائم کیے گئے۔ اور تمام حرفون کی صورتون مین مقبول عام خوشنمائی، سادگی اور آسانی پیدا ہو گئی۔
خلاصہ یہ کہ ہمارا موجودہ خط نسخ ابن مقلہ کا ایجاد ہے۔ ابن مقلہ کے اس خط کی یہ شان اس قدر پسندیدہ ثابت ہوئی کہ ساری کتابت اسی مین ہونے لگی۔ اور بیچارہ خط کوفی ایسا مٹا کہ آج اُس کا لکھنا درکنار دنیاے اسلام مین اُس کا کوئی پڑھنے والا بھی نہین ہے۔
ابن مقلہ کے کچھ کم ایک صدی بعد ابن بوّاب کاتب پیدا ہوا جس نے اپنی مشہور عام خوشنویسی سے خط نسخ کو انتہاے کمال کے درجے کو پہونچا دیا۔ ابن بوّاب کا نام ابو الحسن علی بن ہلال تھا۔ مگر چونکہ ایک دربان کا بیٹا تھا اس لیے ابن البوّاب کے لقب سے مشہور رہا۔ علامہ خلکان اُس کی نسبت لکھتے ہین "اگلون پچھلون مین سے کوئی شخص اُس کے مثل کتابت نہین کر سکا۔ خط کوفی سے بدل کے موجودہ خط کو ایجاد تو ابو علی بن مقلہ نے کیا تھا لیکن ابن بوّاب نے اس کی شان کتابت شایستہ، مہذب اور خوشنما بنا دی۔ اور تمام لوگون کو اتفاق ہے کہ اس بارۂ خاص مین وہ منفرد اور بے نظیر تھا۔" ابن بوّاب نے سنہ ۴۱۳ھ یا ۴۲۳ھ مین انتقال کیا۔ اور خط نسخ مین ایسی شان پیدا کر کے چھوڑ گیا جس کی لوگ آج تک پیروی کر رہے ہین۔
اس مسئلے پر اس قدر تحقیق کرنے کے بعد اب مین خواجہ صاحب کے سوالات کا جواب دیتا ہون۔
(۱) ۸ نومبر کے زمیندار میں ایک واقف کار صاحب نے بتا دیا ہے کہ مولوی خدا بخش خان کے کتب خانۂ بانکی پور مین حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے ہاتھ کے لکھے ہوے قرآن مجید موجود ہین۔ مجھے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہان حضرت عثمان کے ہاتھ کا تو کوئی قرآن نہین ہے ہاں حضرت علی کے ہاتھ کے چند پارے بتائے جاتے ہین۔ مگر جب تک کوئی خط عرب کی تاریخ جاننے والا اُن پر تنقیدی نظر ڈال کے نہ بتائے اعتبار نہین کیا جا سکتا تاہم اس عہد کا

کوئی قرآن مل جائے تو ہم کو اس مسئلہ میں صحیح نتیجے تک پہونچنے میں بہت کامیابی ہو سکتی ہے۔

(۲) آپ کی تحقیق کے اس حصے سے مجھے اتفاق نہیں کہ سیدنا عثمانؓ کا مصحف خط کوفی میں تھا۔ اس لیے کہ خط کوفی اُس زمانے کے تقریباً ڈیڑھ صدی بعد ایجاد ہوا ہے۔ لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اُس میں حرکات و سکنات نہ تھے۔

(۳) اس دفعہ کے مضمون (الف) کے متعلق عرض ہے کہ خط نسخ کی تاریخ میں نے اوپر تفصیل سے بتادی ہے جس سے تمام استفسارات کا جواب مل سکتا ہے۔ مگر اتنا اور عرض کرتا ہے کہ میں نے کبھی کوئی قرآن خط نسخ اور خط کوفی میں ملا جُلا نہیں دیکھا۔ لیکن ابن مقلہ کے ظہور سے چند روز پیشتر جو قرآن لکھے گئے ہوں گے وہ یقیناً ایسے ہی خط میں ہوں گے جن کی شان خط کوفی اور موجودہ نسخ سے ملی جُلی ہوگی۔

ضمن (ب) کے متعلق عرض ہے کہ نقطوں کا آغاز خط کوفی میں باریک ترچھے خطوط کی وضع میں ہوا جو خطوط ابن مقلہ کے زمانے میں نقطے بن گئے۔ اس سے پیشتر بادی النظر میں حروف منقوط و غیر منقوط یا ایک اور دو اور تین نقطوں والے حرفوں میں مابہ الامتیاز کوئی علامت نہ تھی۔ اور صرف قیاس اور معانی کی مناسبت سے اُن کا امتیاز کیا جاتا تھا جس طرح کہ اردو میں ہم حرکات کا امتیاز بغیر کسی علامت کے کرلیا کرتے ہیں۔ "ب" اور "ت" کا امتیاز خط کوفی سے پہلے کے پُرانے خط میں نہ مفرد میں تھا نہ مرکب میں۔ مگر کوفی میں جیسا کہ میں اوپر بیان کرآیا ہوں نیچے اوپر باریک خطوط کا امتیاز پیدا ہوگیا تھا۔ ت کی شکل "ٮ" اور "ب" کی "ٮ" تھی۔

ضمن (ج) بعض کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ نقطوں سے پہلے حرکات و سکنات کا استعمال شروع ہوا۔ اور وہ بذریعۂ نقط تھا۔ دو نقطے اولاً حرکات و سکنات کے لیے استعمال ہوئے۔ موجد حرکات ابوالاسود دوئلی نے زیر۔ زبر۔ پیش کے اظہار کے لیے اپنے کاتب کو اوپر نیچے اور سامنے نقطہ ہی لگانے کی ہدایت کی تھی۔ جو باعتبار روایت ہر طرح قابل تسلیم ہے۔ امتیاز حروف کے لیے

نقطون سے اور حرکات کے سمجھنے کے لیے ترچھے خطون وغیرہ سے کام لینے کا آغاز ابن مقلہ کے زمانے سے ثابت ہوتا ہے۔ مگر مین خیال کرتا ہون کہ اس سے پیشتر ہی کاتبون کا رجحان اس ترمیم وتہذیب کی طرف ہونے لگا ہوگا۔ ابن مقلہ نے اُسے اختیار کرکے اس قدر رواج دیدیا کہ سب نے یہی طرز تحریر اختیار کرلیا۔

ضمن (د) بے شک قدیم کتابت مین "ذٰلاث" اور "جنّت" کے ایسے ایسے لفظون مین الف نہین لکھا جاتا تھا۔ اور نہ اُس کے امتیاز کے لیے کوئی علامت تھی۔ مذکورہ صحف رسالت مین الفاظ "رحمان" اور "یا اہل" بغیر الف کے صرف کھڑے زبر سے یعنی "رحمٰن" اور "یاھل" کی صورت مین لکھے گئے ہین اُن دونون "حرث" اور "حارث" کے نامون مین امتیاز دشوار تھا۔ اس لیے کہ دونون نام "حرث" کی صورت مین لکھے جاتے تھے۔ اب بھی اکثر حارث کا لفظ "حرث" لکھا جاتا ہے۔

اسی طرح دیگر سوالات کا جواب بھی اس مضمون کے ابتدائی مباحث سے حاصل کرلیا جا سکتا ہے۔

رقص

یہ دلچسپ ودلفریب فن بھی انسان کے اُن فطری جذبات مین سے ہے جو بلا ارادہ اور بغیر کسی کوشش کے خود ہی ایجاد ہوگئے۔ ناچ کی نسبت نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ کیون، کب، اور کیونکر ایجاد ہوا۔ اور نہ اُس کے ابتدائی ظہور کے متعلق کوئی روایت یا قصہ بنی آدم مین مشہور ہے۔ مگر باوجود اس کے انکار نہین کیا جا سکتا کہ دنیا کی اگلی پچھلی تمام اعلیٰ وادنیٰ شایستہ سے شایستہ اور وحشی سے وحشی قومون مین ناچ کسی نہ کسی شان سے ضرور موجود ہے۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ناچ ایک فطری چیز ہے۔ اُسکی ابتدا اس سے ہے کہ انسان جسمانی اوضاع وحرکات کو الفاظ وجذبات کے موافق بنائے۔ اکثر لوگ بات کرتے مین "موشن" یعنی جسمانی حرکات کو زیادہ دخل دیا کرتے ہین انکی نسبت سمجھنا چاہیے کہ ان مین ناچ کا مادہ فطرۃً زیادہ رکھا گیا ہے۔ اسکے بعد جب موسیقی مین آواز کے نشیب وفراز کی ترتیب نے ایک دلکش لے

پیدا کی تو رقص نے اُس مین اور لطف پیدا کر دیا - اور اسی کی مناسبت سے رقص نے پہلے پہل ایک باقاعدہ فن کی حیثیت حاصل کر لی -

تاریخ عالم مین سب سے پُرانی تاریخ بنی اسرائیل کی ہے - اور انھین کے معاصر بلکہ اُن سے بھی ترقی مین سبقت رکھنے والے مصری اور بابلی ہین - ان تینون پُرانی متمدن قومون مین ناچنا عبادات مین داخل تھا - اور سچ یہ ہے کہ رقص کو عبادت سے خاص علاقہ ہے - عبادت کرتے وقت انسان اپنے معبود کے سامنے یا تو ایسے حرکات کرتا ہے جو اظہار عبودیت کے ہین - یا صرف چہرے ہی کو اظہارِ خشوع و خضوع کے لیے ملتجیانہ اور عاجزانہ بناتا ہے - اور یہ دونون باتین اصولاً رقص مین داخل ہین -

اہل بابل اور قبطی دونون عبادت مین ناچتے تھے - بنی اسرائیل کی عبادت مین ناچنے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ توراۃ مین ہے "اُنھین اُس (خدا) کے نام کی حمد کرنے اور ناچنے دو" یہ بھی لکھا ہے کہ "داؤد علیہ السلام خدا کے سامنے ناچے" اسی طرح قدیم الایام ہی مین محفل عیش و طرب کا ناچنا بھی تینون مذکورہ قدیم قومون مین موجود تھا - اسیریا و مصر کی صحبت عیش کا ناچ اُنکے منہدم محلون کے در و دیوار کے نقش و نگار سے ظاہر ہوتا ہے - یہودین اسکا ثبوت اِس قصے سے بخوبی مل سکتا ہے کہ ارض جلیل کے یہودی بادشاہ ہرودنٹی پاس کے سامنے ہرودیا نام اُسکے خاندان کی ایک حسین لڑکی ناچی - ناچ کے اُسے رجھایا اور اپنا فریفتہ بنایا - اور جب اُس نے بے اختیار ہو کے کہا "مانگ کیا مانگتی ہے؟" تو اُس سنگدل حسینہ نے بجاے زر و جواہر یا کسی اور چیز کے حضرت عیسیٰؑ کو بپتسما دینے والے یوحنا کا سر مانگا - اور لے کے دم لیا -

یونانیون نے بھی قدیم الایام مین ناچنے کو ایک ایسا فن قرار دیا جس کے ذریعے سے اظہار جذبات مین قوت آ جائے - ہومر شاعر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریبون اور تکلف کی صحبتون مین ناچ ہوا کرتا تھا - اور ارسطاطالیس نے رقص کو فن شعر مین شامل کر دیا ہے - یونان مین اہل اثینہ کے مقابل اسپارٹا والے زیادہ خشک مزاج اور دنیوی عیش و طرب سے متنفر تھے مگر ناچنے کے

فن کو اس قدر ضروری خیال کرتے تھے کہ اپنے بچون کو پانچ ہی برس کی عمر سے رقص کی تعلیم پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ لوگ ان بچون کو لے کے نکلتے۔ اور وہ بھجنین گا گا کے ناچتے۔ اہل اسپارٹا مین "خربک رقص" کے نام سے ایک فوجی ناچ مروج تھا۔ اُن کے نوجوان اُس رقص مین کمال دکھاتے اور معلوم ہوتا کہ قاعدے کے طریقے سے ایک فرضی جنگ ہو رہی ہے۔

قدما مین تین طرح کے ناچ تھے۔ اول فوجی ناچ جس مین سپہگری کی مشق کرنا اور اپنے آپ کو ایک اعلیٰ درجہ کا بہادر سپاہی بنانا مقصود ہوتا۔ اور غرض یہ ہوتی کہ جسم خوب تیار ہو سڈول اور پھرتیلا ہو جائے اور اُس مین طاقت آئے یہ ناچ دراصل ایک قسم کی ورزش تھی۔ دوسرا معاشرتی ناچ۔ یہ محض دلچسپی اور تفریح کے لیے اور قومی تقریبون مین دلبستگی پیدا کرنے کے لیے ہوتا۔ تیسرا ایک اور ناچ ان دونون کے بین بین ہوتا تھا جو گناہ کا کفارہ ادا کرنے اور چڑھاوا چڑھاتے کے وقت عبادت کی حیثیت سے عمل مین آتا۔

قدیم مسیحیون کے رقص کا اگرچہ انجیل مین کہین تذکرہ نہین ہے لیکن اس مین شک نہین کہ اپنے مذہبی مجمعون مین وہ لوگ بھی ناچا کرتے تھے۔ اسلام سے پیشتر جاہلیت عرب مین بھی ناچ قبائل عرب مین موجود تھا۔ خصوصاً مشرکین عرب اپنے بتون کے سامنے ناچا کودا کرتے تھے۔ اسلام نے بت پرستی کے ساتھ بت پرستون کے طریقۂ عبادت کو بھی مٹا دیا۔ اگرچہ رقص کی حرمت و ممانعت کے بارے مین کوئی نص قطعی نہین موجود ہے۔ مگر اسلامی تہذیب نے موسیقی کے ساتھ اُسے بھی ترک کرا دیا۔ تاہم جس طرح نیک نفسی و پاکبازی کا گانا عورتون مین باقی تھا جیسا کہ متعدد احادیث سے ظاہر ہوتا ہے اُسی طرح وہ ناچنا بھی ترک نہین ہوا تھا جس مین شرک کا شائبہ نہ تھا۔ چنانچہ حبشیوں کا رقص حضرت سرورِ کائنات علیہ السلام نے خود بھی دیکھا اور اپنی محبوبہ جناب عائشہ صدیقہ رضؓ کو بھی دکھایا۔ ایک قسم کا فوجی ناچ عربون مین آج تک موجود ہے۔ جب حملہ کے لیے وہ اپنا غول باندھ کے چلتے ہین تو گاتے بجاتے ناچتے کودتے اور خوش فعلیان کرتے ہوے جاتے ہین۔

لیکن اسلامی تہذیب کا تمام ممالک مشرقی پہ یہ اثر پڑا کہ رقص و سرود کے فنون علی العموم ممنوع و مکروہ اور غیر مشروع سمجھے جانے لگے - اور جو لوگ اِن فنون مین ترقی کرتے ہین چاہے کیسے ہی اعلیٰ کمال کا درجہ حاصل کرلین سوسائٹی مین اچھی نظر سے نہین دیکھے جاتے - اور ذلیل اور ادنیٰ طبقے کے لوگون مین شمار کیے جاتے ہین -

مصر مین ناچنے گانے والون کا ایک خاص گروہ موجود ہے جن کی عورتین حسین و پری جمال ہونے کے ساتھ نہایت بیباکی سے سڑکون پر ناچتی پھرتی ہین - اور اپنی نسل کو برمکی خاندانِ وزارت کی طرف منسوب کرتی ہین - دیگر مشرقی ممالک اسلام مین نوعمر لڑکے ناچ کی تعلیم پاتے ہین - اور اُنھین کے متناسب و موزون حرکات سے نوجوانون کی صحبتون مین گرمجوشی پیدا ہوتی ہے -

مگر ہندوستان مین قدیم الایام ہی مین موسیقی کا فن نہایت ہی کمال کے درجے کو پہونچ کے مدوّن و باقاعدہ بن گیا تھا - ہندوؤن مین ناچنا داخل عبادت ہے - جس طرح فی الحال جنوبی ہند کے مندرون کے متعلق بکثرت ایسی عورتین ہوتی ہین جو دیوتا کی مورت کے سامنے روز بلاناغہ جا کے ناچتی ہین اسی طرح کی عورتین ہزار بارہ سو برس پیشتر شمالی ہند کے بڑے بڑے مندرون مین بھی ہوا کرتی تھین - قدیم سیاحان عرب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملتان کے سب سے بڑے مشہور و ممتاز مندر مین ہزارہا عورتین تھین جنھون نے اکثر عربون کو بھی اپنا اسیر گیسو بنا لیا تھا - یہ عورتین مُرلیان کہلاتی ہین - اپنی زندگی دیوتاؤن کی نذر کر دیتی ہین - رقص و سرود اُن کا کام ہوتا ہے اور زناکاری کے ذریعے سے اپنا پیٹ پالتی ہین -

اس عام رجحان نے ہندوستان مین موسیقی کو غیر معمولی ترقی دلائی - اور اُس کے متعلق کئی فن پیدا ہو گئے - پہلے تو یہ کہ موسیقی مین جس طرح مختلف آوازون یعنی سُرون کے نشیب و فراز موزون ترتیب سے مرتب کیے جاتے ہین اسی طرح ناچ مین جسمانی حرکات متناسب ترتیب سے مرتب کر کے دلکش و نظر فریب بنائے جاتے ہین - اس فن نے موسیقی کے قدم بقدم ترقی کی -

اور جس طرح موسیقی میں بہت سے ترانے اور دُھنیں قائم ہو گئی ہیں ویسے ہی رقص میں حرکات جسمانی کی بہت سی گتیں بن گئی ہیں۔ اس میں جسم کا سُبک اور پھرتیلا بنانا۔ پاؤں میں گھونگھرو باندھ کے یہ قدرت پیدا کرنا کہ جب چاہیں وہ بجیں اور جب چاہیں نہ بجیں۔ اور بجنے کی صورت میں جے گھونگھرو چاہیں بجائیں۔ اس فن کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ بعض باکمال ناچنے والے تلوار کی باڑھ پر ناچتے ہیں اور تلوے میں چرکا نہیں لگتا۔

دوسرا فن بتانا ہے۔ وہ یہ کہ گانے میں جو الفاظ زبان سے نکلتے جائیں اپنی صورت سے اُن کی تصویر کھینچ کے دکھاتے جائیں۔ اس فن میں بعض باکمال ناچنے والوں کو اس حد تک کمال حاصل ہوتا ہے کہ ایک ایک مصرع کو سیکڑوں طریقوں سے بتاتے ہیں۔ اور چونکہ محفل میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو باریک تشبیہوں اور نازک خیال آرائیوں کو نہیں سمجھ سکتے اسلیے ضرورت ہوتی ہے کہ ایک شارح پاس کھڑا ہو کے اُن باتوں کی تشریح کرتا جائے۔

بہر تقدیر ہندوستان میں رقص کا فن بہت اعلیٰ درجۂ کمال کو پہونچا ہوا ہے اور اس قابل ہے کہ بجائے بے پروائی کرنے کے اس کی قدر کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو اُسے ترقی دلائی جائے۔

رَحِمَ اللہُ مَنْ ہَدَاِلٰی عُیُوْبِی

عرب کی ایک مثل ہے جس کا مطلب یہ کہ "جو میرے عیب بتائے خدا اُس پر رحمت کرے"۔ یہی مثل ہمارے قدیم کرم فرما مولانا مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علیگڈھ پر صادق آتی ہے۔ ہم نے مضمون "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" میں غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر فرمانروایان اودھ کے حالات میں ہاتھیوں اور درندوں کی لڑائی کا تذکرہ کرتے وقت یہ دعوی کیا تھا کہ "قدیم ہندوستان کی تاریخ میں درندوں کے لڑانے کا ذکر کہیں اور کبھی نہیں سُنا گیا تھا"۔ مولانا شروانی نے ہمارے اس دعوے

کی تغلیط فرمائی ہے - اور ایک کارڈ کے ذریعہ سے ہمین مطلع فرماتے ہین "تاریخ سے ثابت ہے کہ مغلیہ سلطنت مین ہاتھی قلعہ کے میدان مین لڑائے جاتے تھے - برنی ار نے اس کا مفصل تذکرہ کیا ہے - عالمگیر کا اُس ہاتھی سے مقابلہ کرنا جو اپنے حریف ہاتھی سے لڑکر بھاگا تھا مشہور ہے"۔

بے شک یہ ہماری کمی نظر تھی - اور برنی ار کے سفرنامے کو ہم نے نہین پڑھا تھا - اور اب اس کے تسلیم کر لینے مین ہمین کوئی عذر نہین ہو سکتا کہ دہلی مین ہاتھی لڑائے جاتے تھے - اور یہ مذاق لکھنؤ مین وہین سے آیا ہوگا - لیکن شاید درندو کا باہم لڑانا اور ہاتھی کا شیر - تمیندوے - اور گینڈے سے مقابلہ کرانا لکھنوہی مین ثابت ہو سکے گا - ممکن ہے کہ یہ شوق ہندوستان کے کسی اور بادشاہ کو بھی ہوا ہو - مگر ہمین اُس کی اطلاع نہین ہے -

بہرحال ہم مولانا کے نہایت ہی شکرگذار ہین اور اُمید رکھتے ہین کہ وہ ہمیشہ یونہین ہماری غلطیون سے آگاہ کرتے رہین گے - مولانا ہی پر موقوف نہین، ہندوستان مین یہ مذاق پیدا ہونا چاہیے کہ محقق و صاحب علم حضرات تحقیق و تدقیق مسائل خصوصًا تاریخی تفتیش مین قلم اُٹھانے والون کے ممد و معاون رہا کرین - ہم قدیم زبانی روایات یا بعض تحریری سندون سے فائدہ اُٹھا کے جو کچھ لکھتے ہین یقینی نہین ہو سکتا - اور ممکن ہے بہت سے حضرات کے علم مین ایسی باتین ہون جو ہماری جستجو اور ہمارے قیاسی فیصلون کے خلاف ہون - ایسے حضرات اگر بے توجہی کو چھوڑ کر ہمین متنبہ کرتے رہین تو ہمین اپنی تحریرون پر زیادہ بھروسا ہو جائے -

سچا عاشق کون ہے؟ مرد یا عورت؟

شاعری کا اصلی تعلق انسان کے دلی جوش و جذبات سے ہے - اور جذباتِ انسانی مین سب سے زیادہ اہم عشق ہے - اگرچہ یہ کشش حیوانات اور دیگر اصناف مخلوقات مین بھی نمایان طور پر پائی جاتی ہے - مگر ہماری شاعری کو اُسی عشق سے بحث ہے جو انسان مین ہو - اسی وجہ سے شاعر عشق کا بندہ ہوتا ہے

اور دعویٰ کرتا ہے کہ ع عشق انسان کے آب و گل مین ہے"۔ مگر انسان کی دو قسمین ہین۔ مرد اور عورت۔ اور کشش عشق کا پہلا مصدر انھین دونون گروہون کے دل ہین۔ جن کی باہمی کشش اور محبت نے دنیا مین نیرنگیان دکھائی ہین اور شعرا کو خیال آرائی کا موقع دیا ہے۔

لیکن شاعر اُس عشق کو چاہتا ہے جو تمام جذبات پر غالب آ جائے۔ اور عشق کے دُنیا و ما فیہا سے علاقہ نہ باقی رہے۔ لہٰذا غور طلب یہ امر ہے کہ انسان کے دونون طبقون مرد اور عورت مین سے کس مین عشق زیادہ ہے؟ اور کس کا عشق زیادہ مستقل اور سچا ہوتا ہے؟ جذباتِ عشق کے اعتبار سے نوعِ انسان کے ان دونون حصون کو باہم ضرب دیا جائے تو چار شکلین پیدا ہوتی ہین (۱) مرد کا عشق مرد کے ساتھ۔ (۲) مرد کا عشق عورت کے ساتھ۔ (۳) عورت کا عشق مرد کے ساتھ (۴) عورت کا عشق عورت کے ساتھ۔ ان چار شکلون کے سوا کوئی پانچوین شکل نہین ہو سکتی۔

اب غور طلب یہ امر ہے کہ اِن چارون شکلون میں سے کون سی شکل شاعری کے لئے زیادہ موزون ہے؟ کس مین کشش اور بیقراری بڑھی ہوئی ہے؟ اور کس مین زیادہ سچائی اور استقلال ہے؟ اِس سوال کا اگر ہم کافی اور اطمینان بخش جواب دے سکین تو مختلف زبانون کے شعرا کا ایک بہت بڑا جھگڑا چکا دین گے اور فیصلہ کر دین گے کہ کس زبان کے شاعرون کا مذاق اچھا اور سچا ہے۔

ان چار شکلون مین سے دو فطری ہین اور دو غیر فطری جنھین قانون مروجہ کی زبان مین "خلاف وضع فطری" کہا جائے تو زیبا ہے۔ اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ مرد کا عشق عورت کے ساتھ یا عورت کا عشق مرد کے ساتھ فطری ہے۔ اور اسی وجہ سے جن زبانون کے شعرا نے ان دو شکلون کو اختیار کیا ہے اُن کے مذاق مین فطرت اور نیچرل مذاق کی زیادہ جھلک بھی ہے۔ اور جن شاعرون نے غیر فطری عشق کی صورت اختیار کی ہے اُن کا مذاق شاعری فطرت صحیحہ سے کوسون دور ہو کے صرف خیال آرائی۔ لفاظی اور مبالغون مین پھنس کے رہ گیا ہے۔

اب ہم یہ بتاتے ہین کہ کن زبانون کے شاعرون نے کن شکلون کو اختیار کیا ہے - عربی - یونانی - رومی - انگریزی - فرانسیسی اور دیگر مغربی زبانون کے شعرا کے مذاق نے مذکورہٗ بالا شکلون مین سے دوسری فطری شکل اختیار کی ہے - یعنی مرد کا عشق عورت کے ساتھ - آخر عہد کے مولدین عرب، ترکی، فارسی اور اُردو کے شعرا نے پہلی غیر فطری شکل اختیار کی ہے یعنی مرد کا عشق مرد کے ساتھ - ہندوستان کی بھاشا اور غالباً سنسکرت نے تیسری فطری شکل اختیار کی ہے - یعنی عورت کا عشق مرد کے ساتھ - چوتھی غیر فطری شکل یعنی عورت کا عشق عورت کے ساتھ - یہ مذاق ہمین ابھی تک کسی زبان کے شعرا مین نہین نظر آیا - بداخلاقی نے بعض اشخاص مین چاہے یہ مذاق بھی پیدا کر دیا ہو مگر کسی قوم اور کسی زبان کے شعرا کا یہ مذاق نہین سنا گیا - پہلے مورخ یونان ہیروڈوٹس نے دامن کوہ قاف کے ملک گرجستان مین جب امیزنون (جنگجو عورتون) کا دور دورہ بتایا ہے اُن دنون ممکن ہے کہ وہان یہ مذاق ہو - اس لیے کہ کہتے ہین وہ سورما عورتین مردون سے متنفر تھین - اُنکو اپنی قلمرو مین رہنے نہ دیتی تھین - ضرورت کے لیے اپنے علاقے کے باہر جا کے دوسری سرزمین کے مردون سے مل کے حاملہ ہو آتین مگر اس کی روادار نہ تھین کہ کوئی مرد اُن مین رہے - وہان اُن دنون چونکہ عورتین ہی عورتین تھین - اور مردون سے دشمنی رکھتی تھین اس لیے قرین قیاس ہے کہ باہم عشق و محبت کے روابط رکھتی ہون - اُن کا قومی مذاق یہی ہو کہ عورت پر فریفتہ ہون - اور اُن کی شاعری اسی رنگ مین ڈوبی ہوئی ہو - لیکن دنیا مین اور کہین یہ مذاق نہین سُنا گیا -

الغرض موجودہ شعرائے ارض کے مذاق کا عشق تین ہی طرح کا ہے -
(۱) یا مرد مرد پر عاشق ہو (۲) یا مرد عورت پر عاشق ہو (۳) یا عورت مرد پر عاشق ہو - لیکن سوال یہ ہے کہ اِن تینون صورتون مین کون سی صورت بہتر ہے - بیچی

ع مولد اُن عربون کو کہتے ہین جن مین عجمی خون مل گیا ہو - یعنی مولد انگریزون کے یوریشین ہین - مولد شعرائے عرب وہ ہین جن کا مذاق شاعری بیرونی اثر سے مغشوش ہو گیا تھا -

اور شاعری کے لیے زیادہ موزون ہے؟

پہلی صورت چونکہ ہماری اور ہماری ہم مذہب دوسری زبانون کا شعار ہی ہو ئی ہے اس لیئے مروت سے چاہے ہم اُس پر نکتہ چینی نہ کرین مگر اِس حقیقت کو نہین مٹا سکتے کہ وہ مذہبًا شرعًا اور عرفًا بداخلاقی و معصیت قانونًا و تمدنًا جرم اور فلسفیانہ طور پر خلاف فطرت ہے۔ لہذا شعرا کے لیے اُس سے زیادہ لغو۔ بیہودہ۔ بے حقیقت۔ بدمزہ۔ اور بیحیائی و بے غیرتی پیدا کرنے والا کوئی مذاق عشق نہین ہو سکتا۔ اُس عشق مین چونکہ فطرت کی سچی کشش نہ تھی اُس کا مذاق حقیقت سے دور اور واقعیت سے جدا تھا۔ اِس لیے اس عشق کے مبتلاؤن کی شاعری کو سچائی اور نیچرل دلکشی سے کوئی علاقہ نہین رہا۔ وہ دل سے عاشق نہین بلکہ صرف بنے ہوے فرضی عاشق ہین۔ اُن کا معشوق ایک خیالی پیکر ہے جس پر دراصل نہ وہ خود عاشق ہین اور نہ کوئی اور عاشق ہو سکتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اُن مین سچے جذبات پیدا ہی نہین ہو سکتے۔ اُن کے استعارے۔ اُن کی تشبیہین۔ اُن کی خیال آرائیان۔ اُن کی نازک خیالیان صرف فرضی ہوتی ہین۔ اپنے عشق مین اصلیت و واقعیت نہ ہونے کو وہ خود محسوس کرتے ہین۔ اور فطری کششون سے اپنی شاعری کو مطلقًا محروم دیکھ کے کبھی لفاظی اختیار کرکے فضول گوئی کے مرتکب ہوتے ہین۔ کبھی رعایت کے پیچھے پڑ کے ضلع جگت بولنے لگتے ہین۔ کبھی مبالغے کو اپنا شعار بنا کے جھوٹ کے پُل باندھتے ہین۔ کبھی صنعتون اور بوقلمونیون کی بھول بھلیان بنا کے کھڑی کرتے ہین اور کبھی دُور از کار اوہام اور بناوٹی پیچیدہ خیالون کو جنگل کی وحشی چڑیون کی طرح زبردستی پکڑ پکڑ کے الفاظ کے پنجرون مین بند کرتے ہین۔ جو کبھی تو اُڑ جاتی ہین اور کبھی اُسی مین پھڑک پھڑک کے دم دیتی ہین۔ غرض سب کچھ کرتے ہین اور زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہین مگر ایسی ایک بات بھی مشکل سے کہہ سکتے ہین جو دل کو لگے۔ اور سامعین کو بیتاب کردے۔ اس لئے کہ جھوٹے کی زبان مین اثر نہین ہوتا۔ اُن کا مذاق جھوٹا ہے ان کی شاعری بے حقیقت ہے۔ اُن کا خیال مجرمانہ ہے۔ جس کی بنا پر وہ مذہبًا

گنہگار۔ اخلاقاً سوسائٹی کو گندہ اور ناپاک کرنے والے۔ اور قانوناً جیل میں بھیجے جانے کے قابل ہیں۔

اس بدمذاقی اور جھوٹے عشق نے سچے اثر کی برکتوں اور سادی مؤثر کششوں کی برکت سے محروم کرکے انھیں مجبور کردیا ہے کہ اپنی شاعری کی عمارت کو صرف خیال کے مال مسالے سے تعمیر کرکے رعایت لفظی اور طرح طرح کی آورد کی صنعتوں سے آراستہ کردیں۔ اس لیے کہ اگر اُن کے اشعار پر کسی دل سے "آہ!" نکلنے کی اُمید نہیں تو شوکتِ الفاظ دیکھ کے "واہ" ہی نکل جائے۔

اس صورت کے بیہودہ و بے اصل ثابت ہو جانے کے بعد دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں (۱) مرد کا عشق عورت پر اور (۲) عورت کا عشق مرد پر۔ پہلی صورت کو جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں قدیم شعرائے عرب اور یورپ کی اکثر اگلی پچھلی زبانوں کے شعرا نے اختیار کیا۔ اور دوسری صورت کو ہندی شاعری نے۔ یہ دونوں صورتیں فطرت کے موافق ہیں۔ ایک مرد جب اپنی محبوبہ کے فراق میں فریاد کرتا ہے۔ اور ایک باوفا عورت جب اپنے شوہر اور مرد معشوق کی یاد میں بیتاب و بیقرار ہوکے روتی ہے۔ دونوں کی زبان میں بلا کا اثر ہوتا ہے اور چونکہ ان جذبات عشق میں سچائی مضمر ہوتی ہے اس لیے اُن کی زبان کا ہر ہر لفظ تیر و نشتر کا کام دیتا ہے۔ اور جس کے کان تک پہونچتا ہے بیتاب کر دیتا ہے۔

لیکن اِن دونوں میں امتیاز دکھا کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا آسان نہیں ہے۔ مگر ہم فیصلہ ضرور کریں گے۔ اور سچا فیصلہ کریں گے۔ دنیا میں اکثر فیصلہ کثرتِ رائے اور دونوں کی زیادتی پر ہوا کرتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرد عاشق کے طرفدار بہت ہیں۔ ساری دُنیا اُسی کی سی کہہ رہی ہے۔ اور مغرب کے اگلے پچھلے سب زور و شور سے اُس کی تائید کر رہے ہیں۔ اور اُس کے مقابل دکھیاری عورت عاشقۂ بیکس ہے اُس کی دردبھری آواز گھر سے باہر نہ نکل سکی اور اِس لیے اُس کے اثر کا اندازہ بھی دنیا میں

بہت ہی کم لوگوں کو ہوا ہے۔ لیکن اگر سنو گے تو جو درد۔ جو سوز وگداز۔ اور جو اثر اُس کے لہجے اُس کی آواز۔ اور اُس کے بیان مین پاؤ گے کہین نہ نظر آئیگا۔ مگر اس بحث کو ہم اس وقت اُٹھائے رکھتے ہین۔ اور کسی آیندہ موقع پہ بتائینگے کہ دونون مین سے کون اچھا ہے اور کیون اچھا ہے۔

زبانِ اُردو کی شامت

چند سال ہوے ایک دن صبح کو ہم نے اپنے شہر کے قابل اور بیدار مغز میونسپل کمشنر پنڈت اقبال نرائن مسلہ دان بیرسٹرایٹ لا کو اپنے مکان کی طرف سے گذرتے دیکھا۔ اور صاحب سلامت کے بعد تعجب سے پوچھا "آج اِدھر کہان بھول پڑے؟" فرمایا "آپ کے پڑوس والے میونسپل اسکول کے معائنہ کو آیا تھا۔" پوچھا "تو کیسا پایا؟" اُنھون نے جواب مین فرمایا کہ "یہ دیہاتی مدرس تو بجائے اُردو کی تعلیم دینے کے لڑکون کی زبان خراب کرتے ہین۔" مین نے کہا "آپ کے سررشتۂ تعلیم نے انتخاب مدرسین کا جو طریقہ رکھا ہے اُس سے اہل زبان درکنار کسی زبان دان مدرس کے ملنے کی بھی اُمید نہین ہوسکتی۔"

خیر وہ گفتگو انھین دو باتون مین ختم ہوگئی۔ مگر مجھے خیال رہا کہ شاید پنڈت صاحب موصوف کی توجہ کوئی مفید نتیجہ پیدا کرے۔ اس کے بعد جب یہ سُنا کہ پنڈت مہاراج نرائن صاحب حلیبت تمام میونسپل اسکولون کے انسپکٹر مقرر ہوے ہین تو اُمید اور قوی ہوگئی۔ اور دل کو یقین ہوگیا کہ ان دونون بزرگون کی کوشش کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ ضرور ظاہر کرے گی۔

لیکن اپنی چھوٹی لڑکی کو پڑھانے کی ضرورت سے اتفاقاً ہم نے اپنے ملک کے مروجہ اُردو نصاب تعلیم کو دیکھا تو حواس جاتے رہے اور اصلاح کی جو کچھ اُمیدین دل مین پیدا ہوئی تھین سب خاک مین مل گئین۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب جس کا نام "اُردو کی پہلی ریڈر" ہے اس کے مصنف "منشی برج باسی لال صاحب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس قسمت بنارس" ہین۔ جن کو یا شاید سررشتۂ تعلیم کو دعویٰ ہے کہ اس کتاب کو اُنھون نے جدید طرز تعلیم کے مطابق

مئی ۱۹۱۶ء

"تصنیف" نہین کیا بلکہ "بنایا ہے"۔

مین نہ یہ جانتا ہون کہ گریجویٹ کتاب بنانے والے صاحب کس خطے کے رہنے والے ہین اور نہ اس سے آگاہ ہون کہ اُنھون نے اُردو کی تعلیم کہان پائی ہے لیکن یہ ضرور کہون گا کہ جو گریجوئٹانہ لٹریچر اُنھون نے اپنی اس بنائی ہوئی کتاب مین درج فرمایا ہے اُس سے سررشتۂ تعلیم کی اُردو شاید کسی کو آجائے مگر جس زبان اُردو کو ہم لوگ بولتے چالتے اور پڑھتے لکھتے ہین وہ اگر کسی بچّے کو آتی بھی ہوگی تو اُس کے چوپٹ کر دینے کے لیے یہ نصاب بہت اچھی طرح کافی ہے۔

گر ہمین مکتب ست و این مُلّا کار طفلان تمام خواہد شد

ایک سرسری نظر مین اس کتاب کے جو زبان اُردو کی مرمت کرنے والے خاص خاص محاورات نظر آئے حسب ذیل عرض کیے جاتے ہین۔

پہلے صفحے کا پہلا جملہ ہے "باباجی کے ہاتھ مین مالا ہے" اور اُس کے بعد دوسرا فقرہ ہے "وہ گیت گایا کرتا ہے"۔ ہماری اُردو مین جس کے نام کے ساتھ "جی" یا اس قسم کا اور کوئی تعظیمی لفظ استعمال کیا جاتا ہے اُسکے لیے تعظیماً فعل جمع لایا جاتا ہے۔ یعنی اس جملے کو یون بولین گے کہ "وہ گیت گایا کرتے ہین"۔ مگر شاید یہ انگریزی اُردو ہو جس مین تعظیم کے لیے جمع کا فعل لانا صاحب بہادرون کے محاورے کے بالکل خلاف ہے۔

تیسرے صفحے کی پہلی اور دوسری سطر مین ہے "پہلا جلد جلد قدم اُٹھاتا ہے اور دوسرا دھیرے دھیرے"۔ آخری لفظ ہندی گیتون مین البتہ سُنے گئے مگر اُردو مین آج تک نہین سُنے تھے۔ دھیرے دراصل اُردو زبان کا لفظ ہی نہین ہے۔

پانچوین صفحے کی پانچوین اور چھٹی سطر مین ہے "پیسے بھنالاؤ"۔ ہمارے یہان روپیہ بھنایا جاتا ہے۔ اور پیسہ اُس وقت بھنایا جاتا ہے جب اُس کی کوڑیان منگوانا ہون۔ لیکن ایسی صورت مین فقط ایک پیسہ بھنایا جاتا ہے "پیسے بھنانے" کا اتفاق نہین ہوتا۔

دسوین صفحے پر ہندوستانی معاشرت کی ایک تصویر ہے جس مین حکیم صاحب ایک اسٹول پر بیٹھے مریض کی نبض دیکھ رہے ہین - مریض نے بجائے جھکنے کے ایک گھٹنا زمین پر ٹیک دیا ہے اور دوسرا پاؤن آگے بڑھا کے اُس پر ہاتھ رکھ لیا ہے - اس شائستگی سے نبض دکھانے والے آج تک یہان کسی حکیم کے مطب مین نہین دیکھے گئے تھے - بڑی عنایت ہوتی اگر ہمارے گریجویٹ مصنف بچون کو فقط اپنی زبان سکھاتے اپنی تہذیب و شائستگی کے بھی سکھلا دینے کا ارادہ نہ فرماتے -

بارہوین صفحے کی چوتھی اور پانچوین سطر مین ہے "اس لحاف کی سنجاف اچھی ہے" - "سنجاف" گوٹ کی ایک خاص وضع کا نام ہے - کوئی مستقل چیز نہین ہم لوگ لحاف کی گوٹ کہین گے - لحاف کی سنجاف نہین کہہ سکتے - مگر مصنف صاحب کی زبان کون پکڑ سکتا ہے؟ جو چاہین فرمائین -

پندرہوین صفحے کی پہلی سطر مین ہے "مجھے تیرنا نہین آتا" یہ محاورہ اگرچہ بعض عوام بول جاتے ہین مگر زبان دان بخوبی جانتے ہین کہ اُردو مین کسی ہلکی بے جان چیز کے آپ ہی آپ پانی کے اوپر قائم رہنے کو تیرنا کہتے ہین اور جو ذی روح ہاتھ پاؤن کی کوشش سے اپنے آپ کو پانی کے اوپر قائم کرے اُس کے اس فعل کو تیرنا نہین "پیرنا" کہتے ہین -

اُنیسوین صفحے میں چھٹی سطر پر ہے "اُنچاس مین سے بائیس گھٹاؤ" اہل زبان اُنچاس کہتے ہین - لیکن ہمارے معلم زبان مصنف صاحب کی زبان اُنچاس ہے - مگر کاش یہ زبان اُن کے گھر ہی مین رہتی -

بائیسوین صفحے کی چوتھی سطر مین ہے "جو اُستاد پڑھاوین اُس پر دھیان دو" ہماری اُردو مین اس موقع پر کہین گے "اُس مین دھیان لگاؤ" مگر افسوس کہ مصنف صاحب کی زبان مین "اُس پر دھیان دو" کہتے ہین - اور ہمارے بچے مجبور ہین کہ اُن کی یہ بولی سیکھیں بھی -

تیئسوین صفحے مین ایک لڑکا اپنے باغ مین گیا ہے جس کی نسبت (سطر سات و آٹھ مین ہے) "وہان اُس کا دادا زمین کھود کر آم کے چھوٹے چھوٹے پودے

لگا رہا تھا" یہ کسی مالی کا لڑکا ہو تو اور بات ہے۔ لیکن کسی شریف لڑکے کا ذکر ہوتا ہے تو اُس کے دادا کی اس طرح توہین نہین کرتے بلکہ کہتے ہین کہ اُسکے دادا ایسا کام کر رہے تھے۔

چوبیسوین صفحہ کی پانچوین اور چھٹی سطر مین ہے" لوگ اپنے بزرگون کے نام مرنے کے پیچھے عزت سے یاد کرتے ہین"۔ اس مین اول تو "مرنے کے پیچھے" کی جگہ "مرنے کے بعد" کہنا چاہیے۔ مرنے کے پیچھے صحیح اُردو نہین۔ دوسرے یہ نہین پتہ چلتا کہ اُن کے مرنے کے بعد یا اپنے مرنے کے بعد۔ ہرحال اُردو مین اس جملے کو یون ہونا چاہیے کہ "اُن کے مرنے کے بعد عزت سے یاد کرتے ہین"۔

پچیسوین صفحہ کی چوتھی سطر مین ہے "جب اُس کی (چنے کی) پتیان بہت نرم رہتی ہین تو لوگ نوچ نوچ کے کھاتے ہین"۔ اہل زبان اُردو اس مقام پر "نرم رہتی" ہرگز نہ کہین گے بلکہ "نرم ہوتی" کہین گے۔

انھین چند محاورات پر موقوف نہین اس کتاب کو اول سے آخر تک غور سے پڑھا جایئے تو ہر صفحے پر ایسی ہی فاش غلطیان ملین گی۔ پڑھانے والے یا تو دیہاتی مدرس ہین یا بہت ہی معمولی استعداد کے اُردو دان جو سمجھ جاتے ہین کہ یہی فصیح و صحیح زبان ہے۔

کیا یہ عبرت کی بات نہین کہ لکھنؤ کے مدرسون مین یہ اُردو پڑھائی جاتی ہے جہان زبان اُردو نے نشو و نما پایا ہے۔ جہان کے شرفا و فصحا کی زبان سند اور معیار فصاحت مانی جاتی ہے۔ جہان ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کی تحقیق و تنقید مین خدا جانے کیسی کیسی بحثین پیش آتی رہتی ہین۔ اور جہان کی خاک مین میر۔ سودا۔ انشا۔ مصحفی۔ جرأت۔ ناسخ۔ آتش۔ انیس۔ دبیر اور اسی طرح کے صدہا اساتذۂ سخن آرام کر رہے ہین۔ لکھنؤ کے پاس اب زبان اُردو کے سوا کچھ نہین رہ گیا ہے۔ وضع قطع۔ صحبت و معاشرت سب چیزین تو چھن گئین۔ لے دے کے ایک زبان رہ گئی ہے اور افسوس کہ اب وہ بھی سررشتۂ تعلیم کے خنجر جہالت سے ذبح ہو رہی ہے۔

ہمین اُن بزرگون کے معزز نامون کے معلوم ہونے کی ضرورت ہے جنھون نے

اس کورس کو پسند اور منظور فرمایا ہے - یہ کام بورڈ کے سپرد ہے - اور بورڈ مین جو بزرگوار ممبر منتخب ہوا کرتے ہین اُن مین ہماری بدقسمتی سے سارے کمالات جمع ہوتے ہین ایک وہ معری ہوتے ہین تو زبان دانی سے - اُن کے لیے گریجویٹ ہونا شرط ہے - انگریزی دانی لازمی ہے - اور اور بھی خدا جانے کن کن صفات کا موجود ہونا ضروری تصور کیا جاتا ہے - مگر اس کو کوئی نہین پوچھتا کہ وہ اُردو بھی جانتے ہین یا نہین -

سب سے زیادہ خرابی یہ ہے کہ سررشتۂ تعلیم کے عہدہ دارون نے مدارس کو اپنی تجارت کی منڈی بنالیا ہے - وہ لوگ ادھر اُدھر سے جوڑ توڑ کے چند عبارتین جمع کرتے اور ایک کتاب بناتے ہین - اور منظور کرنے والے عہدہ دارون پر اثر ڈال کے اور سفارشین پہونچا کے منظور کرا لیتے ہین - آج تک کبھی اسکی کوشش نہین کی گئی کہ اُردو کا نصاب بنانے مین دہلی و لکھنؤ کے اُن لوگون سے بھی کچھ مدد لی جائے جو اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد ہین -

سُنا جاتا ہے کہ اب یونیورسٹی آپ اپنا کورس تیار کرائے گی - اور کسی کو اُس سے تاجرانہ نفع اُٹھانے کا موقع نہ دیا جائے گا - مگر اس سے یہ اُمید رکھنا فضول ہے کہ اساتذۂ زبان سے کوئی مدد لی جائے گی - اس لیے کہ یونیورسٹی کی دُنیا کے لال بجھکڑ وہی بزرگوار ہین جو سررشتۂ تعلیم مین بلحاظ عہدہ کوئی اثر و اقتدار رکھتے ہین - کورس بنانے کو جب کہا جائے گا اُنھین سے کہا جائیگا - اور یہ پہلے تو منفعت کے شوق مین تھوڑی بہت کوشش بھی کرتے اور ادھر اُدھر سے پوچھ کے کچھ کر بھی لیتے تھے اب بے پروائی کے باعث پہلے سے بھی بدتر نصاب مرتب کرین گے - اور اُردو کی اور مٹی خراب ہو گی -

ہر حال سررشتۂ تعلیم کے نصاب مین اصلاح کی کوئی اُمید نہین - اور اس کا سوا اس کے کوئی علاج نہین نظر آتا کہ ہم اور تمام وہ لوگ جو اپنے بچون کی زبان بگڑنے کو نہ برداشت کرسکتے ہون اُنھین مدارس سرکاری سے اُٹھا لین - اور اُن کی تعلیم کا کوئی اور انتظام کرین -

---

کیا واقعی انسان سب سے افضل ہے؟

گو اپنے منہ میان مٹھو بننا اچھا نہین معلوم ہوتا۔ مگر انسان کو اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا دعوٰی ہے۔ اور اپنے اس دعوے کی سچائی کا اُسے اس قدر یقین ہے کہ اس مین شک و شبہہ کی ذرا بھی گنجایش نہین۔ یہان تک کہ اُسکے خلاف کوئی بحث چھیڑی جائے تو اُس کے سننے کی بھی وہ تاب نہین لا سکتا۔ اس دعوے کی اصلی محرک تو انسان کی خود پرستی ہے جو اُس کی سرشت مین داخل ہے۔ اور وہ رہ رہ کے اُس کی زبان سے کہلا دیا کرتی ہے کہ "ہمچو من دیگرے نیست" مگر اُسے زیادہ قوت اس سے مل گئی کہ وہ تمام مذاہب جن سے اُمم عالم کے تمدن بنے ہین اُن سب نے بھی انسان کے اس دعوے کی تصدیق و تائید کر دی۔ چنانچہ اب یہ یقین ہمارے عقائد مین داخل ہو گیا ہے کہ "ہم اشرف المخلوقات ہین"۔

ہمارے راویان کہن کہتے ہین کہ اگلے دنون یہ مسئلہ اور دعوٰی ایک باضابطہ مقدمے کی شان سے بعض قدیم مستند دربارون مین پیش ہو کے طے ہو چکا ہے۔ چنانچہ پارسیون کے صحف آسمانی مین جو دساتیر کے مجموعے مین مرتب و مدون ہین بتایا گیا ہے کہ مجوس کے آدم "گل شاہ" کے دربار مین جانورون نے آکے شکایت کی کہ انسان اپنے آپ کو ہم سب سے افضل و اعلٰی بتاتا۔ پھر اُسکی بنیاد پر ہماری آزادی مین فرق ڈالتا۔ اور حکومت کے بہانے ہم پر طرح طرح کے ظلم و جور کرتا ہے۔ اُن کی بحث سُنی گئی۔ انسان کو جواب دہی کرنا پڑی۔ اور گو کہ عدالت کے تیورون سے جنبہ داری کا شائبہ نہ تھا مگر انسان ہی کے حق مین فیصلہ ہوا۔ اور اُسے اُن بے اعتدالیون کی اور جرأت دلائی گئی۔

اس کے بعد رسائل اخوان الصفا مین سے ایک رسالہ غالبًا پارسیون ہی کے مذکورۂ بالا خیال سے لے کے زیادہ لطف و وضاحت کے ساتھ اسی دعوے کی تائید مین لکھا گیا۔ اُس مین یہ طے شدہ مقدمہ پھر نمبر پر لیا گیا ہے۔ اور حاکم انسان نہین ایک تاجدار جن ہے۔ اس رسالے مین یہ قضیہ جنون کے ایک

محترم دربار میں پیش ہوا ہے۔ تمام جانوروں نے باری باری آکے اپنے کمالات اور ہنر بیان کیے۔ انسان کو نہایت بے اعتدالی کا الزام دیا اور اُس کے جور وستم سے پناہ مانگی۔ انسان نے اپنے فضائل ومحامد بیان کیے۔ اور زور دے کے ثابت کیا کہ ہم سب سے افضل واعلیٰ ہیں۔ اور خدا نے ہمیں ایسی قوت عطا کی ہے کہ سارے حیوانات پر تصرف کرتے اور جس سے جو کام چاہتے ہیں لیتے ہیں۔ آخر اُس جنّی دربار نے بھی انسان ہی کی طرفداری کی۔ اور جانوروں کا دعویٰ خارج کرکے انسان کو حق دیدیا کہ بے زبان جانوروں کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے۔

لیکن اصل یہ ہے کہ یہ دونوں فیصلے خود انسان نے اپنے مقاصد واغراض کے مطابق بنا لیے ہیں۔ اور اگر کوئی غیر جانبدار عدالت موجود ہوتی تو اس جعل بنانے پر انسان کو بڑی بھاری سنگین سزا ملتی۔ دراصل انسان نے اپنی کامیابی کے زعم اور غلبے کے نشہ میں جہاں جانوروں پر ظلم وجور کیے وہاں اپنی تائید میں یہ مقدمے اور فیصلے بھی بنا لیے۔ اُسے اپنی چالاکی اور قوت تدبر پر گھمنڈ اور ناز ہے۔ اور اُنھیں چیزوں کو مصداق "مائٹ از رائٹ" (قوت ہی استحقاق ہی) اپنی عظمت کی دلیل تصور کر لیا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ہمارا جانوروں پر غالب آجانا اور اُن میں ہر قسم کا تصرف کر سکنا ہی ہماری فضیلت وفوقیت کی دلیل ہے۔

جن لوگوں نے مسئلۂ تخلیق عالم پر غور کیا ہے اب اُن کی یہ رائے قرار پائی ہے کہ انسان کی تخلیق سے پہلے کرۂ ارض جنگلوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور اُس میں ایسے ایسے عجیب وغریب حیوانات۔ اور مہیب الخلقت وعظیم الجثہ جانور بھرے ہوے تھے کہ اُن کے سامنے انسان ضعیف البنیان کی کچھ ہستی نہ تھی۔ اُنھیں وحشی موذیوں اور خونخوار دشمنوں کے آغوش میں انسان پیدا ہوا۔ جس نے آفرینش کے ساتھ ہی اپنی نوعی حفاظت کا سامان شروع کیا۔ انسان کی صورت دیکھتے ہی وہ سب اُس کی ہلاکت کے درپے ہوگئے۔ پہلے تو انسان نے بھاگ کے پہاڑوں کی کھوہوں۔ درختوں کے جھنڈوں۔ اور تنگ وتاریک غاروں میں پناہ لی۔ پھر اپنی چالاکی ومکاری سے اُن موذیوں کو زیر کرنے لگا۔ اسکے بعد

اُس نے جنگل کاٹ کے میدان نکالے۔ اپنے رہنے اور وحشی درندون سے بچنے کے لیے مکان بنائے۔ آپس مین اتفاق کیا۔ اور آخر مین شہر اور گانون آباد ہونے لگے ترقی کے اس درجے تک پہونچتے پہونچتے اُس نے بہت سے بڑے بڑے وحشت ناک جانورون کی نسلین فنا کر دین۔ بہتون کو اپنا مطیع بنا لیا۔ جن مین سے بعض کو کھاتا بعض پر سواری لیتا۔ بعض کو تفنن طبع کے لیے پالتا ہے۔ اور جو قابو مین نہین آتے اُن کا شکار کرتا ہے۔

وحشی جانورون کو حریف پر غالب آنے اور اپنے بچانے کے لیے خدا نے طرح طرح کے خوفناک اسلحہ دے تھے۔ اُن کے مقابل مین انسان نے اپنی طباعی سے ایسے ایسے مصنوعی اسلحہ ایجاد کر لیے جنھون نے حیوانات کے قدرتی اسلحہ کو بیکار کر دیا۔ اور ان آلات اور حربون سے اُس نے جانورون کو فنا کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی نسل روز بروز بڑھنے لگی۔ اور ان قوی ہیکل وحشی جانورون کی مقدار یوماً فیوماً گھٹتی گئی۔ اُن کی بہت سی نسلین کلیتہً فنا ہو گئین۔ جو رہ گئین اُنھون نے انسان کے شر سے بچنے کے لیے اُن کی بستیون کو چھوڑ چھوڑ کے کوہ و صحرا اور دشت و بیابان کی راہ لی۔ اور انسان کو اپنی عام فتح کے زعم باطل اور اپنے غلبے کے نشے مین یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ "ہم ہی سب سے افضل و اعلیٰ ہین"

آخر اسی غلبے اور حکومت کو اُس نے اپنی فوقیت و افضلیت کی دلیل قرار دیا۔ جس طرح کہ انسانون کی کامیاب و حکمران قومین حکمرانی اور اپنے غلبے کو دوسری قومون کے مقابلے مین اپنے اشرف و اعلیٰ ہونے کی دلیل خیال کیا کرتی ہین۔ چنانچہ اسی دلیل کے گھمنڈ پر انھون نے اپنے خیالی مقدمے بنائے۔ اپنے خیال سے اُن مقدمون کی رودادین قلمبند کین اور اس حجت پر اس قدر ناز تھا کہ جعلی فیصلے شایع کر کے خود ہی ڈگری لے لی۔

مگر اب دنیا کا تمدن بہت آگے بڑھ آیا ہے۔ تحقیق و تنقید نے انسان کے اگلے تمام دعوے توڑ دیے ہین۔ اور واقعات کی صورت ہی اور سے اور ہو گئی ہے۔ گانو زوریون اور جسمانی قوت سے حکومت کا حق مل جانا اگلے دنون ایک

قطعی فیصلہ تھا۔ مگر اب انسان کو ایسے مصنوعی آلات واسلحہ ہاتھ آگئے ہیں کہ تنو مندی اور قوت کی کچھ اصل وحقیقت ہی نہین رہی۔

علاوہ برین اب یہ بھی ثابت ہوگیا ہے کہ غلبے اور حکومت کو فضیلت وشرافت سے بہت ہی کم تعلق ہے۔ بلکہ لڑائی اور جسمانی زور آزمائی انسان کے ادنی ترین فضائل مین شمار کی جاتی ہین۔ ممکن ہے کہ انصاف پسندی۔ دیانتداری۔ صفائی اور اسی طرح کے اور بہت سے صفات جانورون مین زیادہ ہون۔ اور اس مین کوئی شک نہین کہ یہ صفات جنگجوئی سے زیادہ افضل ہین۔

دنیا کے وہ لوگ جو تمام مذہبون مین واجب التعظیم اور اشرف وافضل سمجھے جاتے ہین۔ اُن کے نزدیک نیکی اور خوبی یا دوسرے الفاظ مین یون کہا جائے کہ فضیلت وشرافت صرف اس مین ہے کہ انسان دنیاوی جھگڑون سے الگ رہے۔ دولتمندی کی ہوسون سے بھاگے۔ خدا نے جو کچھ دیا ہے اُس پر قناعت کرے۔ اپنی نسل کی بقا کا انتظام رکھے۔ اور شب وروز خدا کو یاد کرے۔ ہمین ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جانورون مین یہ صفات بہ نسبت انسان کے زیادہ اکمل و اعلٰے درجے تک پائے جاتے ہین۔ وہ قانع ہین۔ بے ضرورت بھیک نہین مانگتے۔ اپنے فرائض سے غافل نہین ہوتے۔ دوسرون کے معاملات مین دخل نہین دیتے۔ اور جہان تک بنتا ہے بے آزار زندگی بسر کرتے ہین۔ کیا ان صفات کا لحاظ کیجیے تو یہ جانور جن کو ہم نے حد سے زیادہ ستا رکھا ہے ہم سے زیادہ شریف وافضل نہین معلوم ہوتے؟

اس کو بھی چھوڑیے۔ جانورون کی اس قطعی دلیل فضیلت کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ تمام صفات حسنہ اور کل خوبیون کا ایک ذات مین جمع ہو جانا اور کل بُرائیون۔ خرابیون اور ذلیل حرکتون سے اُس کا مصئون ومعصوم ہونا محال ہے۔ اس لیے کہ مستجمع جمیع کمالات ہونا صرف اُس رب العزت کے ساتھ مخصوص ہے جو ہم سب کا خالق بے ہمتا ہے۔ ایسی حالت مین جانورون نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کسی ایک صفت کو اپنے ساتھ مخصوص کر لیا ہے۔

بخلاف اس کے انسان کی یہ حالت ہے کہ طلب الکل فوت الکل۔ وہ چاہتا ہے

کہ ساری خوبیاں اُس مین جمع ہو جائین - مگر اصل مین دیکھیے تو سب ناقص درجے تک ہین - اور اس قدر ناتمام اور غیر مکمل ہین کہ اُن خوبیون کا ہونا بجاے کوئی خوبی ہونے کے عیب ہو گیا ہے - اور پھر لطف یہ کہ ان تمام ناقص صفات پر انسان کو تو یہ غرّہ ہے کہ اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے - اور جانورون کی یہ حالت ہے کہ اپنی اپنی صفتون مین اس درجہ کمال رکھنے پر بھی اس طرح خاموش ہین کہ گویا کچھ جانتے ہی نہین -

انسان کو سب سے بڑا دعویٰ اپنے ہُنرون اور اپنی صنعتون پر ہے - اُسکی یہی ترقی ایسی نمایان ہے جس نے دنیا مین اس قدر ترمیم کر دی - اول تو اسی مین شک ہے کہ اسے ترقی کہنا چاہیے یا ہوس پرستیون کا کرشمہ - لیکن اگر بالفرض یہ ترقی بھی ہے تو اگر غور کیجیے تو انسان نے تمام صنعتین جانورون ہی سے سیکھی ہین - وہ موجد بنتا ہے - مگر انصاف سے پتہ لگائیے تو اُس مین سوا دوسرون کی نقل کرنے کے ایجاد کا مطلق مادہ نہین ہے - انسانی ہُنرمندیون کے جتنے مبادی ہین سب دوسرون سے لیے اور چرائے ہوے ہین - اُس نے جانورون کے اون اور پر دیکھ کے اپنے جسم کے لیے کپڑے بنائے - جانورون کی غذاؤن سے منتخب کر کے اور اُن کو باہم ترتیب دے کے اپنے لیے قسم قسم کی غذائین منتخب کین - مختلف جانورون کے مسکن اور آشیانے دیکھ کے اپنے رہنے کو گھر بنائے - بَنے کے جھونجھ مین جگنو چمکتے دیکھ کر اپنے مکان مین چراغ روشن کیا - شہد کی مکھیون کا نظام دیکھ کے اپنا نظام تمدنی قائم کیا - اسی طرح جتنی چیزون کو خیال کیجیے کوئی خاص انسان کی ایجاد کی ہوئی نہ ملے گی -

اس مین شک نہین کہ انسان کو ایک بیقرار و غیر قانع طبیعت ملی ہے - جو اُسے کسی حال پر قرار نہین لینے دیتی - اور اُس کی ہوس کسی طرح پوری ہونے کو نہین آتی - جس کے نتیجے مین اُس نے کیا دی - مکاری - اور خوشامدی و منزل رسانی مین سب سے زیادہ ترقی کر لی ہے - جبکہ ساری مخلوق کا یہ طریقہ ہے کہ بے وجہ دوسرون کی آزادی معاشرت مین کوئی فرق نہین ڈالتی - انسان بجاے اس کے کہ اپنی حالت درست کرے خواہ مخواہ اورون کے معاملات مین دخل دیتا

اُن کو ستاتا - اُن کی زندگی تلخ کرتا - اور اپنے ذلیل نفع کے لیے اُن کی جان لیتا ہے۔
اگرچہ ساری مخلوق مین خدا نے یہ شان پیدا کر دی ہے کہ ایک ایک کو کھائے جاتا ہے - خلاق عالم نے ہر ایک کو غذا حاصل کرنے پر مجبور کر دیا ہے - اور اسی بہانے خداوند جل وعلا نے ایک مخلوق کو دوسرے کے فنا کرنے کا آلہ بنا دیا ہے - فنا کرنے کا یہ قانون حجر و شجر تک مین جاری ہے - اس مین خدا کی بڑی بھاری مصلحت ہے - کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو قدرت کے اکھاڑے مین جو بازیگر آتے سامنے سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتے - اور دوسرون کے لیے جگہ خالی نہ ہوتی - لہذا پیٹ بھرنے کے لیے اگر انسان بھی قدرت کے اس عام باورچی خانے سے اپنا نسکھی و ظیفہ حاصل کر لیتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا - مگر وہ اِس حد سے تجاوز کر کے محض شوق و تفنن کے لیے ہر مخلوق کے نوعی عالم مین دخل دیتا اور بے ضرورت مخلوقات پر ظلم کرتا ہے - وہ اپنے پاؤن بیکار کر کے جانورون سے سواری لیتا ہے - اپنا بدن ڈھانکنے کے لیے جانورون کا اُون کاٹتا - اُن کے پر نوچتا - اور اُن کی کھال کھینچتا ہے -
ان چیزون کو اگر ترقی کہا جائے تو ترقی مین چاہے اعلیٰ درجے کی نفس پروری ہوتی ہو مگر وہ نہایت ہی شرمناک چیز ہے - خود انسانون مین جو اعلیٰ درجے کے واجب الاحترام بزرگ ہین وہ بھی انسان کی ان حرکتون اور اُس کی اس دست بُرد کو بُرا سمجھتے ہین -
اُن کے نزدیک فضیلت و شرافت یہ ہے کہ انسان ایک بے ضرر و بے آزار زندگی بسر کرے - اُس کے ہاتھ سے کسی کو نقصان نہ پہونچے - بجائے دوسرون کے معاملات مین پڑنے کے وہ اپنی فکر رکھے - اپنے اخلاق درست کرے - اور خدا کو نہ بھولے - جب خود انسان کے مدوّنہ علم اخلاق کا یہی اصول باعثِ شرافتِ نفس و افضلیت ہے تو سچ یہ ہے کہ شرافت مین انسان من حیث المجموع سب سے بدتر ہے - اور جانور قطعاً اُس سے زیادہ شریف و افضل ہین

چلتے پھرتے باغ و مکان ستمبر ۱۹۱۶ء

خدا کی عجیب و غریب قدرت کا ایک یہ بھی نمونہ ہے جو ہمارے لیے حد سے زیادہ حیرت انگیز ہو سکتا ہے کہ دریاؤن اور جھیلون مین پانی کی سطح پر تیرتے اور چلتے پھرتے قطعات زمین بن جاتے ہین - اور وہ اس قابل ہوتے ہین کہ اُن پر باغ لگائے جائین - کھیت بوئے جائین - اور شاداب ترکاریان تیار کی جائین -

ہمارے ہندوستان مین جابجا گنگا مین زمین کے بڑے بڑے تختے سطح آب پر پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوے دیکھے جاتے ہین - مگر یہ عموماً انسانون کے بنائے ہوے نہین بلکہ خود قدرت الٰہی کی صنعت ہوتے ہین - یہ تختے درختون کی ٹہنیوں - لکڑی کے ٹکڑوں - اور سِوار وغیرہ کے باہم رل اور جڑ جانے سے بن جاتے ہین - اور جب تیار ہو چکتے ہین تو سیلاب مین پانی کا زور اُنھین کنارے سے چھڑا کے بہا لاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ دریا کے آغوش مین ایک شاداب اور نزہت بخش مرغزار بہتا چلا جاتا ہے - ان مین سے بعض پر اکثر بڑے بڑے پیڑ بھی دیکھے جاتے ہین - اور اُن کو چلتے پھرتے دیکھ کے عقل انسانی چکر مین آجاتی ہے -

انگلستان کی جھیلون مین بھی دو ایک جھیلین ایسی ہین جن کی سطح پر اسی قسم کے تختہ ہاے زمین پانی مین سدا بہار باغ لگانے کے لیے پیدا ہو گئے ہین - اور اس سے بھی زیادہ لطف و حیرت کی یہ بات ہے کہ وہان کی جھیل "ڈرونٹ واٹر" مین جو ایسا ہی ایک مصنوعی تختۂ زمین ہے اُس کے آغوش مین ایک اور جھیل پیدا ہو گئی ہے -

مملکت پروشیا (جرمنی) مین ایک "جھیل باغ" ہے - اُسکی سطح آب پر بڑے بڑے تیرنے والے اور چلتے پھرتے جزیرے ہین - اور ایسی ہی ایک جھیل مین ایسے مضبوط قطعات زمین بن گئے ہین جن پر اچھے اور نفیس جھاؤ کے درخت لگائے جاتے ہین - اسپین والون نے جب امریکہ کو فتح کیا ہے تو

میکسیکو کی جھیل مین بھی تیرتے اور چلتے پھرتے باغ دیکھے تھے۔

شمالی و مغربی ہند یعنی کشمیر مین اور تبت و ایران کی سرحد پر لوگ اپنی جھیلون مین خود ہی ایسے جزیرے اور قطعات زمین بنا لیا کرتے ہین جن پر وہ باغ لگاتے ہین۔ اور تربوزون۔ اور خربزون۔ کھیرون۔ ککڑیون اور دیگر بقولات کے جو مرطوب زمین چاہتے ہون بڑے بڑے کھیت تیار کرتے ہین۔ جن کی نسبت اختیار رہتا ہے کہ جب تک چاہین کسی جگہ قائم رکھین اور جب چاہین کسی اور مقام پر ہٹا لے جائین۔ یہان کوئی کسی سے کہے کہ فلان شخص کے کھیت کو چور چُرا لے گئے تو تم اُسے مجنون و فاتر العقل کہو گے۔ مگر وہان یہی تمھارے خیال کے خلاف فطرت واقعات روز پیش آیا کرتے ہین۔ اور اکثر کھیتون کی چوریان ہوتی رہتی ہین۔ یعنی مالک کو غافل پا کے لوگ اُس کے کھیت کھین اور کھینچ لے جاتے ہین یا اپنے کھیت مین ملا لیتے ہین۔ کشمیر مین اس قسم کے تختون پر جہان باغ ہو گیا ہے اور پھول کھلے ہین وہان کی بہار سارے مناظرِ قدرت کو مات کر دیتی ہے۔

یہ تختہ ہاے زمین بہت پتلے۔ سُبک اور نازک ہوتے ہین۔ اور اُن کا دَل کہین شاذونادر ہی ایک فٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔ اصلی چیز جس پر اُن تختون کی بنیاد قائم کی جاتی ہے۔ درختون کی ٹہنیان۔ لکڑی کے ٹکڑے ہین جن کو سوار بُن کے جوڑ دیتی ہے۔ پھر اُس پر چٹائیان بچھا کے تھوڑی مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ اور اُس مین تخم پاشی ہوتی ہے۔

مگر ان سب چیزون سے زیادہ حیرتناک ملک سیام کے چلتے پھرتے گانوَن ہین۔ جن کے بنانے مین دار السلطنت سیام بنکوک کے لوگ ساری دنیا سے سبقت لے گئے ہین۔ وہ لوگ سیلاب سے بچنے اور پانی کے ضرر سے محفوظ رہ کے آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لیے ایسے مکان بناتے ہین جو پانی پر تیرتے اور چلتے پھرتے رہتے ہین۔ ان مکانون کو برابر برابر جما کے اور لنگرون کے ذریعے سے ایک جگہ قائم کر کے وہ بڑی بڑی بستیان بنا لیتے ہین جن کے بیچ مین پانی کی کشادہ سڑکین ہوتی ہین۔ اور پانی اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اُن آبی سڑکون مین دو دو

تین تین سو ٹن کا بوجھ لیجانے والے جہاز گذرتے رہتے ہین - ان بستیون کی وضع و قطع بدلنے کا اُنھین اختیار رہتا ہے - مکان کا رُخ جدھر چاہین پھیر سکتے ہین اور یہ اُن کے بس کی بات ہے کہ جب چاہین اپنے اس بحری گانوٗن کی وضع و صورت بدل دین - اُن کے یہ مکان علی العموم بانس کی کھپاچون - ٹٹیون - اور کھجور کے درختون سے بنتے ہین اور نہایت ہی سُبک اور خوشنما ہوتے ہین - جن مین سامنے کے رُخ پر عموماً ایک برآمدہ ہوتا ہے - جس سے کشتیان اور جہاز آکے لگ جاتے ہین اور اُن کے ذریعہ سے بآسانی ہر حصۂ آبادی اور ہر سڑک کی سیر ہو سکتی ہے - اور وہی ذریعۂ آمد و رفت ہوا کرتے ہین -

اٹلی مین شہر وینس کی بڑی تعریف کی جاتی ہے کہ سمندر کو شہر کے اندر کاٹ لائے ہین - اور پانی کی نہرین سڑکون کا کام دیتی ہین جن مین کشتیون کے ذریعے سے آمدو رفت ہوتی ہے - مگر جو خوبی سیام کی اِن چلتی پھرتی بستیون مین ہے وینس کو بھلا کہان نصیب ہو سکتی ہے ؟ وینس کی جو قطع ہے نہین بدل سکتی - اس لیے کہ پانی کی سڑکون کے کنارے دونون جانب پختہ عمارتین ہین - بخلاف اسکے سیام کی بستیون مین یہ صفت ہے کہ جس گانوٗن کو جہان اور جتنی دور چاہین لے جاکے قائم کر دین - اور جب ایک وضع کی آبادی سے دل اُکتائے بدل کے دوسری وضع کر دین - جس کسی کا جب تک جی چاہے ایک جگہ رہے اور جب چاہے مع مکان کے دوسرے محلے اور دوسرے احباب کے جوار مین چلا جائے -

ایشیا - تجھ مین سب طرح کے کمال ہین - سارے مذہب - سارے تمدن - اور ساری صنعتین تجھ سے نکلی ہین - مگر یورپ کی زبردستیون نے تیرے سارے کمالات پر خاک ڈال دی - اور اسی ناقدری کا نتیجہ ہوم رول کی تمنا و آرزو ہے -

حمام کی تاریخ

انگریزی میں حمام کو "باتھ" کہتے ہین جسکے لغوی معنی غسل یا نہانے کے ہین اور اس وجہ سے وہان یہ سمجھا جاتا ہے کہ جسم انسان کے گرد و پیش معمولی اوقات میں حسب معتاد جب گرمی یا سردی ہا کرتی ہے اسکے خلاف کسی جگہ زیادہ درجے کی گرمی یا سردی اسکے جسم پر اثر ڈالنے کیلیے پیدا کیجائے

تو وہ مقام "حمام" ہے۔ مگر ہمارے یہاں صرف اُسی مقام کو حمام کہنا چاہیے جہاں کی فضا معمول سے زیادہ گرم کردی گئی ہو۔ اگرچہ اُسی مکان مین گرمیون کے موسم مین کبھی لوگ ٹھنڈے پانی سے بھی نہا لیا کرتے ہون۔

دراصل حمام اُس عمارت کا نام ہے جس مین پانی کے حوض کے نیچے آگ جلا کے حوض کا پانی خوب گرم کیا جائے۔ پھر اُس پانی سے جو بخارات اُٹھین اُن کو دروازے اور باہر کے منافذ بند کر کے محفوظ کیا جائے۔ اور مکان کی فضا اور ہوا جس درجے تک ضرورت ہو گرم کردی جائے۔ اُس مین ایک ٹھنڈا حوض رکھنا بھی لازمی ہے تاکہ جب پانی بہت زیادہ گرم ہو جائے تو اُس کو جس درجے تک مناسب ہو سمو کے معتدل کر دیا جائے۔

اس مین نہانے کے طریقے بھی مختلف ہین۔ کہین لوگ حوض مین اُتر کے غوطہ لگاتے ہین۔ کہین حوض سے لوٹے مین پانی لے کے بنڈے پر ڈالتے ہین۔ اور بعض جگہ چھت پر لگے ہوئے فوارون اور ہزارون سے مینھ کی طرح اپنے اوپر پانی برساتے ہین۔

نہانے کا آغاز تو اُسی وقت سے دنیا مین ہو گیا ہو گا جب انسان پیدا ہوا اور اُسے صفائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن مذکورۂ بالا خاص شان کے گرم حمامون کا آغاز غالباً بابل اور مصر مین ہی ہوا ہو گا جہان تمدن انسانی یورپ سے پہلے ترقی کر گیا تھا۔ مگر یورپ مین یونان کے پہلے شاعر ہومر کے زمانے تک گرم حمامون کا پتہ لگتا ہے۔ جو حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ۱۴۷۰ سال پیشتر کا زمانہ تھا۔

اُس کے بعد یونانیون مین ایسے گرم حمام کثرت سے بن گئے جو یا تو معززامرا کے گھرون مین تھے اور خاص اُن اور اُن کے احباب کے غسل کرنے کے لیے مخصوص تھے۔ اور یا عام لوگون کے نہانے کی غرض سے تھے۔ لیکن اس کا پتہ لگانا دشوار ہے کہ یونانیون کے وہ حمام کس وضع قطع کے تھے۔ اُن مین گرمی کس درجے تک بڑھائی جا سکتی تھی اور کیونکر بڑھائی جاتی تھی۔ اور نہانے کے کیا کیا مدارج اور طریقے تھے۔ زیادہ تفتیش سے اُنکے حمامون کے متعلق فقط

اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ اُن کے جو حمام عوام کے لیے تھے وہ علی العموم "جِم نے شیہ" یعنی ورزش خانون اور اکھاڑون سے متعلق ہوا کرتے تھے - اور ورزش کرنے کے بعد فوراً اُن مین جا کے وہ لوگ گرم پانی سے نہایا کرتے تھے -

یونانیون کے بعد رومیون کا زمانہ شروع ہوا تو ابتداءً اُنھون نے وہی یونانیون کی وضع کے حمام اپنے وہان بنوائے - پہلے پہل رومیون مین حمامون کو زیادہ اہمیت نہ تھی - یہان تک کہ آگسٹس قیصر کا زمانہ آیا - اور اُس کے شوق نے حمامون کو غیر معمولی اہمیت دے کے اُن مین شاہانہ شوکت و رونق پیدا کر دی - رومی حمامون کو "تھرمہ" کہتے تھے - جس کے معنے گرم غسل خانے کے ہین - اور اُس کا صحیح ترجمہ ہمارا عربی لفظ "حمام" ہے گو کہ رومیون مین ہمارے یہان کی طرح ٹھنڈے حمام بھی تھے -

رومی امرا اور قیصرون کی شوقینی کا آخر یہ انجام ہوا کہ رومۃ الکبریٰ کے تمام محلون مین کثرت سے عالیشان حمام تیار ہو گئے - مختلف مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکیلے شہر رومہ مین آٹھ سو سے زیادہ ہی حمام تھے - جن مین زیادہ مشہور و معروف حمام اگرپا - حمام انطونیوس - حمام قراقلا - حمام دیوقلی طین - حمام نیرو - اور حمام طیطوس تھے - دیوقلیطین مین کہتے ہین کہ ۱۸۰۰ آدمیون کے نہانے کے چبوترے تھے - اور اُن کی عظمت و رونق اور آراستگی و زیبایش کے جو افسانے بیان کیے جاتے ہین حیرت انگیز ہین - جن رومی حمامون کے منہدم آثار آج باقی ہین اُن کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ عمارتین جب اپنی اصلی حالت پر قائم ہون گی تو کیسی شاندار ہون گی - اور یقین آ جاتا ہے کہ اُنکی نسبت جو کچھ کہا جاتا ہے بالکل سچ ہے -

رومیون مین حمام کرنے کا وقت علی العموم گرمیون مین دن کو دو بجے اور جاڑون مین تین بجے تھا - اور اُن مین نہانے کا طریقہ یہ تھا کہ حمام مین داخل ہونے کے بعد کپڑے اُتارتے ہی کوئی عام قسم کا گاڑھا اور ستا تیل سارے بدن مین لگا دیا جاتا - اس کے بعد وہ افارسٹوئیم مین داخل ہوتے - افارسٹوئیم ایک بڑے ہال کا نام تھا جس مین ہر طرح کی ورزشون کا سامان موجود رہتا - وہان

وہ خوب ورزش کرتے یہاں تک کہ خوب پسینہ آجاتا۔ جو ورزش زیادہ عام تھی یہ تھی کہ بھاری فولادی گولوں کو اُٹھایا اور مختلف طریقوں سے گھمایا جاتا تھا۔

جی بھر کے ورزش کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے گرم کمرے میں جاتے جو کالڈوریم کہلاتا۔ اور اُس میں خوب تیز گرمی ہوتی۔ یہاں ٹینگ اور اژدھات کے جھانووں سے خوب رگڑ رگڑ کے بدن دھویا جاتا۔ خوب نہا دھو لینے کے بعد یہاں اُنکے بنڈے میں ایک لطیف خوشبودار تیل لگایا جاتا۔ جس کے بعد وہ ٹیپی ڈوریم میں داخل ہوتے۔ یہ وہ کمرہ تھا جس میں نہانے کے کمرے کے مقابل خفیف درجے کی گرمی ہوتی۔ تھوڑی دیر وہاں توقف کرکے وہ فرجی ڈاریم میں جاتے جو ٹھنڈا کمرہ ہوتا تھا۔ اور اُس ٹھنڈے کمرے میں آنے کی ضرورت یہ ہوتی کہ کالڈوریم کی سخت گرمی کے بعد ایک ٹھنڈے مقام میں ٹھہر کے جسم میں کھلی فضا اور باہر کی ہوا میں آنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

یہ تھا رومی حمام جس کا رومیوں کو اس قدر شوق تھا کہ جس سرزمین پہ جاکے انھوں نے قیام کیا اسی قسم کے پبلک حمام وہاں انھوں نے تعمیر کرلیے۔ گرم چشموں سے فائدہ اُٹھایا اور اُنکے پانی کو حمام میں پہونچایا۔ چنانچہ مغربی انگلستان میں شہر باتھ (حمام) رومیوں کے اس مذاق کی یادگار آج تک موجود ہے۔

رومیوں کے زوال کے بعد قرون وسطیٰ میں یورپ پر مسیحی مقتداؤں کا اثر تھا اور اُنھیں طہارت اور نہانے اور دھونے سے اس قدر نفرت تھی کہ رومیوں کے بنائے ہوئے تمام حمام منہدم ہوگئے۔ اور جن لوگوں کو اُس پر فخر و ناز ہو کہ ہمارے بنڈے میں عمر بھر پانی نہیں لگا اُن کے زمانے میں اگلے حماموں کے باقی رہنے اور کسی نئے حمام کے تعمیر ہونے کی کیا اُمید ہوسکتی تھی؟ چند ہی روز میں اہل ملک حمام اور اُس کے لطف کو بھول گئے۔ اور اُسکے ساتھ ہی طہارت و نجاست کا امتیاز بھی اُٹھ گیا۔ اور یورپ کی پبلک میں وہ تمام عیوب پیدا ہوگئے جو صفائی اور طہارت کا خیال نہ ہونے کے لازمی نتائج ہیں۔ حتیٰ کہ پیشاب بپا خانے کے بعد بھی دھونے کی ضرورت نہ باقی رہی۔ اگرچہ اب بہت سے ہندوستانی نجس رہنے میں یورپ کی تقلید کرنے لگے ہیں مگر وہ ننگ وطن ہیں۔ اور اس نجس رہنے پر

اُنھین تو شرم نہین آتی مگر ہم بجائے خود اُن کے عوض شرما لیا کرتے ہین۔

رومیون کے بعد سرزمین عرب سے نیّر اسلام طلوع ہوا۔ اور عرب لوگ توحید کندھے پر رکھ کے افریقیہ سے ہوتے ہوے یورپ پہونچے۔ ان موحدون کے نزدیک نہانا اور وضو کرنا خدا کی عبادت کے لیے لازمی تھا۔ اسی قدر نہین جنابت کی حالت مین اُنھین بغیر نہائے ایک گھڑی بسر کرنا بھی دشوار تھا۔ اُن کو غسل و وضو کرتے اور گھڑی بھر کے لیے بھی نجاست کو نہ برداشت کر سکتے دیکھ کر تعصب نے مسیحیون کو یقین دلایا کہ نہانا دھونا اور بدن کو پانی مین بھگونا ایمانداری کے خلاف اور کافرون (مسلمانون) کا کام ہے۔ دیندار مسیحیون کو ان باتون سے کیا غرض؟ بہرحال مسیحیون کو طہارت کرنے اور نجاست دُور کرنے سے روز بروز نفرت و مخالفت ہوتی گئی۔ اور نہانے دھونے کا جو کچھ سامان اگلے رومیون کا مہیا کیا ہوا باقی تھا سب ان کے ہاتھون فنا ہو گیا۔ جس کا عجیب نتیجہ آج یہ نظر آرہا ہے کہ اسی سرزمین (یورپ) مین جہان رومیون نے گانون گانون مین حمام بنوائے تھے آج اگر ایک آدھ حمام عجائباتِ قدرت کے نمونے کے طور پر بنا بھی لیا گیا ہے تو اپنی چیز نہین بلکہ "ٹرکش حمام" یعنی ترکون اور مسلمانون کی چیز کہا جاتا ہے۔

مسلمانون کو تمدن و دولت حاصل کرتے ہی اپنی طہارت اور صفائی کی ضرورتون کے لحاظ سے حمام ایک نعمت غیر مترقبہ نظر آیا۔ اُنھون نے فوراً اُسے اختیار کر لیا۔ اور جہان جہان عرب جاکے آباد ہوے یا دین اسلام پہونچا ہزارون حمام تعمیر ہو گئے۔ اسی قدر نہین اُنھون نے اپنے حمامون مین رومی حمام سے بھی زیادہ ترقی کی۔ چنانچہ فی الحال دنیا کے تمام باعظمت و شان حمام مسلمانون کے بنائے ہوے ہین۔

اہل اسلام کے حمامون مین سے وہ ورزش خانہ نکل گیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ سپہگری کے فنون اور اسلحۂ جنگ کی ورزشون کا جداگانہ مستقل انتظام ہو گیا۔ اور یہ چیزین کبھی کبھی کے لیے نہین بلکہ روزانہ تعلیم مین داخل ہو گئین۔ ان اسلامی حمامون مین پہلے انسان ایک کمرے مین داخل ہوتا ہے جس کی گرمی اس قدر معتدل

ہوتی ہے کہ ناگوار نہیں گزرتی - اور کوئی مضر اثر نہیں ڈال سکتی - وہان کپڑے اُتار کے اور ایک مناسب زمانے تک ٹھہر کے انسان ایک اور کمرے مین جاتا ہے جو پہلے کمرے سے زیادہ اور نہانے کے کمرے سے کم گرم ہوتا ہے - یہان بھی تھوڑی دیر ٹھہر کے وہ اُس کمرے مین جاتا ہے جہان نہاتا ہے - یہان تک پہونچتے پہونچتے خوب پسینہ آجاتا ہے - میل چھوٹنے کے لیے خوب پھول جاتی ہے - اب حمامی ایک چوکی پر بٹھا کے تمام جسم پر تیز گرم پانی ڈال دیتا ہے - پھر کیسے سے خوب مل مل کے میل چھڑاتا ہے اور بدن کو صاف کرتا ہے - بالون کو بیسن یا کھلی یا کسی اور چیز سے مل کے دھوتا ہے - اسکے بعد وہ مختلف پیچون اور طریقون سے ہڈیون کے جوڑون کو کھینچتا ہے اور ایسی اچھی دلک کرتا ہے کہ نہایت آرام ملتا ہے - اور معلوم ہوتا ہے کہ سارے اعضا نرم پڑ گئے - تھکن اور سُستی دُور ہوگئی اور ہاتھ پاؤن کھل گئے - اس کے بعد جسم پر خوب پانی بہا کے اور بخوبی طہارت کر کے انسان لنگی بدل کے حسب ترتیب اُنھین کمرون سے گذرتا ہے جن مین سے ہو کے گیا تھا - اور آخری کمرے مین دم بھر ٹھہر کے اور کپڑے پہن کے اپنے گھر چلا آتا ہے -

تدریجی کمرون کی وجہ سے انسان آخری کمرے مین اُس درجے تک کی حرارت کو برداشت کر لیتا ہے کہ اگر براہِ راست نہانے کے کمرے مین چلا جائے تو وہان کی حرارت اُس کے لیے اس قدر ناقابل برداشت ہو کہ ضرر پہونچا دے - ترکی حمامون مین پتھرون پر گرم پانی چھڑک چھڑک کے نہانے کی کمرے کی حرارت ۱۴۰ درجے تک پہونچا دی جاتی ہے -

حمام اگرچہ سرد ممالک اور ہمارے یہان بھی جاڑون مین نہایت لطف کی چیز ہے اور اِن سے اطبانے اپنے فن مین بھی بہت فائدہ اُٹھایا ہے مگر اُسکے ساتھ نہایت ہی خطرناک چیز بھی ہین - اگر حرارت اعتدال سے تجاوز کر جائے تو جان کا خطرہ ہے - چنانچہ اگلی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد بادشاہون اور بہت سے امیرون کی جانین حمامیون سے سازش کر کے حمام ہی کے ذریعے سے لی گئی ہین -

---

چلتے پھرتے باغ و مکان ستمبر ۱۹۱۷ء

خدا کی عجیب و غریب قدرت کا ایک یہ بھی نونہ ہے جو ہمارے لیے حد سے
زیادہ حیرت انگیز ہو سکتا ہے کہ دریاؤن اور جھیلون مین پانی کی سطح پر تیرتے اور
چلتے پھرتے قطعات زمین بن جاتے ہین - اور وہ اس قابل ہوتے ہین کہ اُن پر
باغ لگائے جائین - کھیت بوئے جائیں - اور شاداب ترکاریان تیار
کی جائین -

ہمارے ہندوستان مین جابجا گنگا مین زمین کے بڑے بڑے تختے سطح آب
پر پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوے دیکھے جاتے ہین - مگر یہ عموماً انسانون کے
بنائے ہوے نہین بلکہ خود قدرت الٰہی کی صنعت ہوتے ہین - یہ تختے درختون کی
ٹہنیون - لکڑی کے ٹکڑون - اور سوار وغیرہ کے باہم مل اور جڑ جانے سے بن
جاتے ہین - اور جب تیار ہو چکتے ہین تو سیلاب مین پانی کا زور اُنھین کنارے سے
چھڑا کے بہا لاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ دریا کے آغوش مین ایک شاداب اور
نزہت بخش مرغزار بہتا چلا جاتا ہے - ان مین سے بعض پر اکثر بڑے بڑے پیڑ
بھی دیکھے جاتے ہین - اور اُن کو چلتے پھرتے دیکھ کے عقل انسانی چکر مین
آ جاتی ہے -

انگلستان کی جھیلون مین بھی دو ایک جھیلین ایسی ہین جن کی سطح پر اسی قسم
کے تختہ ہاے زمین پانی مین سدا بہار باغ لگانے کے لیے پیدا ہو گئے ہین -
اور اس سے بھی زیادہ لطف و حیرت کی یہ بات ہے کہ وہان کی جھیل "ڈرونٹ
واٹر" مین جو ایسا ہی ایک مصنوعی تختہ زمین ہے اُس کے آغوش مین ایک اور
جھیل پیدا ہو گئی ہے -

ملکت پروشیا (جرمنی) مین ایک "جھیل باغ" ہے - اُسکی سطح آب پر
بڑے بڑے تیرنے والے اور چلتے پھرتے جزیرے ہین - اور ایسی ہی ایک
جھیل مین ایسے مضبوط قطعات زمین بن گئے ہین جن پر اچھے اور نفیس جھاڑ
کے درخت لگائے جاتے ہین - اسپین والون نے جب امریکہ کو فتح کیا ہے تو

میکسیکو کی جھیل مین بھی تیرتے اور چلتے پھرتے باغ دیکھے تھے۔

شمالی و مغربی ہند یعنی کشمیر مین اور تبت و ایران کی سرحد پر لوگ اپنی جھیلون مین خود ہی ایسے جزیرے اور قطعات زمین بنا لیا کرتے ہین جن پر وہ باغ لگاتے ہین۔ اور تربوزون۔ اور خربزون۔ کھیرون۔ ککڑیون اور دیگر بقولات کے جو مرطوب زمین چاہتے ہون بڑے بڑے کھیت تیار کرتے ہین۔ جن کی نسبت اختیار رہتا ہے کہ جب تک چاہین کسی جگہ قائم رکھین اور جب چاہین کسی اور مقام پر ہٹا لے جائین۔ یہان کوئی کسی سے کہے کہ فلان شخص کے کھیت کو چور چرا لے گئے تو تم اُسے مجنون و فاترالعقل کہو گے۔ مگر وہان یہی تمہارے خیال کے خلاف فطرت واقعات روز پیش آیا کرتے ہین۔ اور اکثر کھیتون کی چوریان ہوتی رہتی ہین۔ یعنی مالک کو غافل پا کے لوگ اُس کے کھیت کہین اور کھینچ لے جاتے ہین یا اپنے کھیت مین ملا لیتے ہین۔ کشمیر مین اس قسم کے تختون پر جہان باغ ہو گیا ہے اور پھول کھلے ہین وہان کی بہار سارے مناظرِ قدرت کو مات کر دیتی ہے۔

یہ تختہ ہاے زمین بہت پتلے۔ سُبک اور نازک ہوتے ہین۔ اور اُن کا دَل کہین شاذونادر ہی ایک فٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔ اصلی چیز جس پر اُن تختون کی بنا و قائم کی جاتی ہے۔ درختون کی ٹھنیان۔ لکڑی کے ٹکڑے ہین جن کو سوار بن کے جوڑ دیتی ہے۔ پھر اُس پر چٹائیان بچھا کے تھوڑی مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ اور اُس مین تخم پاشی ہوتی ہے۔

مگر ان سب چیزون سے زیادہ حیرتناک ملک سیام کے چلتے پھرتے گانون ہین۔ جن کے بنانے مین دارالسلطنت سیام بنکوک کے لوگ ساری دنیا سے سبقت لے گئے ہین۔ وہ لوگ سیلاب سے بچنے اور پانی کے ضرر سے محفوظ رہ کے آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لیے ایسے مکان بناتے ہین جو پانی پر تیرتے اور چلتے پھرتے رہتے ہین۔ ان مکانون کو برابر برابر جما کے اور لنگرون کے ذریعے سے ایک جگہ قائم کر کے وہ بڑی بڑی بستیان بنا لیتے ہین جن کے بیچ مین پانی کی کتنی دہ سڑکین ہوتی ہین۔ اور پانی اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اُن آبی سڑکون میں دود

تین تین سو ٹن کا بوجھ لیجانے والے جہاز گذرتے رہتے ہین - ان بستیون کی وضع و قطع بدلنے کا اُنھین اختیار رہتا ہے - مکان کا رُخ جدھر چاہین پھیر سکتے ہین اور یہ اُن کے بس کی بات ہے کہ جب چاہین اپنے اس بحری گانؤن کی وضع و صورت بدل دین - اُن کے یہ مکان علی العموم بانس کی کھپاچون - ٹھنیون - اور کھجور کے درختون سے بنتے ہین اور نہایت ہی سُبک اور خوشنما ہوتے ہین - جن مین سامنے کے رُخ پر عموماً ایک برآمدہ ہوتا ہے - جس سے کشتیان اور جہاز آکے لگ جاتے ہین اور اُن کے ذریعہ سے بہ آسانی ہر حصۂ آبادی اور ہر سڑک کی سیر ہو سکتی ہے - اور وہی ذریعۂ آمد و رفت ہوا کرتے ہین -

اٹلی مین شہر وینس کی بڑی تعریف کی جاتی ہے کہ سمندر کو شہر کے اندر کاٹ لائے ہین - اور پانی کی نہرین سڑکون کا کام دیتی ہین جن مین کشتیون کے ذریعے سے آمدہ رفت ہوتی ہے - مگر جو خوبی سیام کی اِن چلتی پھرتی بستیون مین ہے وینس کو بھلا کہان نصیب ہو سکتی ہے ؟ وینس کی جو قطع ہے نہین بدل سکتی - اس لیے کہ پانی کی سڑکون کے کنارے دونون جانب پختہ عمارتین ہین - بخلاف اسکے سیام کی بستیون مین یہ صفت ہے کہ جس گانؤن کو جہان اور جتنی دور چاہین لے جاکے قائم کر دین - اور جب ایک وضع کی آبادی سے دل اُکتائے بدل کے دوسری وضع کر دین - جس کسی کا جب تک جی چاہے ایک جگہ رہے اور جب چاہے مع مکان کے دوسرے محلے اور دوسرے احباب کے جوار مین چلا جائے -

ایشیا - تجھ مین سب طرح کے کمال ہین - سارے مذہب - سارے تمدن - اور ساری صنعتین تجھ سے نکلی ہین - مگر یورپ کی زبردستیون نے تیرے سارے کمالات پر خاک ڈال دی - اور اسی ناقدری کا نتیجہ ہوم رول کی تمنا و آرزو ہے -

حمام کی تاریخ

انگریزی مین حمام کو "باتھ" کہتے ہین جسکے لغوی معنی غسل یا نہانے کے ہین اور اس وجہ سے وہان یہ سمجھا جاتا ہے کہ جسم انسان کے گرد و پیش معمولی اوقات سے بے اعتدال گرمی یا سردی پیدا کرنی ہو اسکے خلاف کسی جگہ زیادہ درجے کی گرمی یا خنکی اسکے جسم پر اثر ڈالنے کیلیے پیدا کیجائے

تو وہ مقام "حمام" ہے۔ مگر ہمارے یہاں صرف اُسی مقام کو حمام کہنا چاہیے جہاں کی فضا معمول سے زیادہ گرم کر دی گئی ہو۔ اگرچہ اُسی مکان میں گرمیوں کے موسم میں کبھی لوگ ٹھنڈے پانی سے بھی نہا لیا کرتے ہوں۔

دراصل حمام اُس عمارت کا نام ہے جس میں پانی کے حوض کے نیچے آگ جلا کے حوض کا پانی خوب گرم کیا جائے۔ پھر اُس پانی سے جو بخارات اُٹھیں اُن کو دروازے اور باہر کے منافذ بند کر کے محفوظ کیا جائے۔ اور مکان کی فضا اور ہوا جس درجے تک ضرورت ہو گرم کر دی جائے۔ اُس میں ایک ٹھنڈا حوض رکھنا بھی لازمی ہے تاکہ جب پانی بہت زیادہ گرم ہو جائے تو اُس کو جس درجے تک مناسب ہو سمو کے معتدل کر دیا جائے۔

اس میں نہانے کے طریقے بھی مختلف ہیں۔ کہیں لوگ حوض میں اُتر کے غوطہ لگاتے ہیں۔ کہیں حوض سے لوٹے میں پانی لے کے بدن پر ڈالتے ہیں۔ اور بعض جگہ چھت پر لگے ہوئے فواروں اور ہزاروں سے مینھ کی طرح اپنے اوپر پانی برساتے ہیں۔

نہانے کا آغاز تو اُسی وقت سے دنیا میں ہو گیا ہو گا جب انسان پیدا ہوا اور اُسے صفائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن مذکورۂ بالا خاص شان کے گرم حماموں کا آغاز غالباً بابل اور مصر میں ہی ہوا ہو گا جہاں تمدن انسانی یورپ سے پہلے ترقی کر گیا تھا۔ مگر یورپ میں یونان کے پہلے شاعر ہومر کے زمانے تک گرم حماموں کا پتہ لگتا ہے۔ جو حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ۱۴۷۰ سال پیشتر کا زمانہ تھا۔

اُس کے بعد یونانیوں میں ایسے گرم حمام کثرت سے بن گئے جو یا تو امرا کے گھروں میں تھے اور خاص اُن اور اُن کے احباب کے غسل کرنے کے لیے مخصوص تھے۔ اور یا عام لوگوں کے نہانے کی غرض سے تھے۔ لیکن اس کا پتہ لگانا دشوار ہے کہ یونانیوں کے وہ حمام کس وضع قطع کے تھے۔ اُن میں گرمی کس درجے تک بڑھائی جا سکتی تھی اور کیونکر بڑھائی جاتی تھی۔ اور نہانے کے کیا مدارج اور طریقے تھے۔ زیادہ تفتیش سے اُنکے حماموں کے متعلق نقطہ

اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ اُن کے جو حمام عوام کے لیے تھے وہ علی العموم "جِم نے شیہ" یعنی ورزش خانون اور اکھاڑون سے متعلق ہوا کرتے تھے - اور ورزش کرنے کے بعد فوراً اُن مین جا کے وہ لوگ گرم پانی سے نہایا کرتے تھے

یونانیون کے بعد رومیون کا زمانہ شروع ہوا تو ابتداءً اُنھون نے وہی یونانیون کی وضع کے حمام اپنے وہان بنوائے - پہلے پہل رومیون مین حمامون کو زیادہ اہمیت نہ تھی - یہان تک کہ آگسٹس قیصر کا زمانہ آیا - اور اُس کے شوق نے حمامون کو غیر معمولی اہمیت دے کے اُن مین شاہانہ شوکت و رونق پیدا کر دی - رومی حمامون کو "تھرمہ" کہتے تھے - جس کے معنے گرم غسل خانے کے ہین - اور اُس کا صحیح ترجمہ ہمارا عربی لفظ "حمام" ہے گو کہ رومیون مین ہمارے یہان کی طرح ٹھنڈے حمام بھی تھے -

رومی امرا اور قیصرون کی شوقینی کا آخر یہ انجام ہوا کہ رومۃ الکبریٰ کے تمام محلّون مین کثرت سے عالیشان حمام تیار ہو گئے - مختلف مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکیلے شہر رومہ مین آٹھ سو سے زیادہ ہی حمام تھے - جن مین زیادہ مشہور و معروف حمام اگریپا - حمام انطونیوس - حمام قراقلا - حمام دیوقلیطین - حمام نیرو - اور حمام طیطوس تھے - دیوقلیطین مین کہتے ہین کہ ۱۸۰۰ آدمیون کے نہانے کے چبوترے تھے - اور اُن کی عظمت و رونق اور آراستگی و زیبایش کے جو افسانے بیان کیے جاتے ہین حیرت انگیز ہین - جن رومی حمامون کے منہدم آثار آج باقی ہین اُن کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ عمارتین جب اپنی اصلی حالت پر قائم ہون گی تو کیسی شاندار ہون گی - اور یقین آ جاتا ہے کہ اُنکی نسبت جو کچھ کہا جاتا ہے بالکل سچ ہے -

رومیون مین حمام کرنے کا وقت علی العموم گرمیون مین دن کو دو بجے اور جاڑون مین تین بجے تھا - اور اُن مین نہانے کا طریقہ یہ تھا کہ حمام مین داخل ہونے کے بعد کپڑے اُتارتے ہی کوئی عام قسم کا گاڑھا اور سستا تیل سارے بدن مین لگا دیا جاتا - اس کے بعد وہ افارسٹوئیم مین داخل ہوتے - افارسٹوئیم ایک بڑے ہال کا نام تھا جس مین ہر طرح کی ورزشون کا سامان موجود رہتا - وہان

وہ خوب ورزش کرتے یہان تک کہ خوب پسینہ آجاتا۔ جو ورزش زیادہ عام تھی یہ تھی کہ بھاری فولادی گولون کو اُٹھایا اور مختلف طریقون سے گھمایا جاتا تھا۔

جی بھر کے ورزش کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے گرم کمرے مین جاتے جو کالڈریم کہلاتا۔ اور اُس مین خوب تیز گرمی ہوتی۔ یہان سینگ اور اژدھات کے جھانوون سے خوب رگڑ رگڑ کے بدن دھویا جاتا۔ خوب نہا دھو لینے کے بعد یہان اُنکے بنڈے مین ایک لطیف خوشبودار تیل لگایا جاتا۔ جس کے بعد وہ ٹیپی ڈوریم مین داخل ہوتے۔ یہ وہ کمرہ تھا جس مین نہانے کے کمرے کے مقابل خفیف درجے کی گرمی ہوتی۔ تھوڑی دیر وہان توقف کرکے وہ فرجی ڈاریم مین جاتے جو ٹھنڈا کمرہ ہوتا تھا۔ اور اُس ٹھنڈے کمرے مین آنے کی ضرورت یہ ہوتی کہ کالڈوریم کی سخت گرمی کے بعد ایک ٹھنڈے مقام مین ٹھہر کے جسم مین کھلی فضا اور باہر کی ہوا مین آنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

یہ تھا رومی حمام جس کا رومیون کو اس قدر شوق تھا کہ جس سرزمین پر جاکے انھون نے قیام کیا اسی قسم کے پبلک حمام بھی وہان انھون نے تعمیر کرا لیے۔ گرم چشمون سے فائدہ اُٹھایا اور اُنکے پانی کو حمام مین پہونچایا۔ چنانچہ مغربی انگلستان مین شہر باتھ (حمام) رومیون کے اس مذاق کی یادگار آج تک موجود ہے۔

رومیون کے زوال کے بعد قرون وسطیٰ مین یورپ پر مسیحی مقتداؤن کا اثر تھا اور انھین طہارت اور نہانے اور دھونے سے اس قدر نفرت تھی کہ رومیون کے بنائے ہوے تمام حمام منہدم ہوگئے۔ اور جن لوگون کو اُس پر فخر و ناز ہو کہ ہمارے بنڈے مین عمر بھر پانی نہین لگا اُن کے زمانے مین اگلے حمامون کے باقی رہنے اور کسی نئے حمام کے تعمیر ہونے کی کیا اُمید ہوسکتی تھی؟ چند ہی روز مین اہل ملک حمام اور اُس کے لطف کو بھول گئے۔ اور اُسکے ساتھ ہی طہارت و نجاست کا امتیاز بھی اُٹھ گیا۔ اور یورپ کی پبلک مین وہ تمام عیوب پیدا ہوگئے جو صفائی اور طہارت کا خیال نہ ہونے کے لازمی نتائج ہین۔ حتیٰ کہ پیشاب پاخانے کے بعد بھی دھونے کی ضرورت نہ باقی رہی۔ اگرچہ اب بہت سے ہندوستانی نجس رہنے مین یورپ کی تقلید کرنے لگے ہیں مگر وہ ننگ وطن ہین۔ اور اس نجس رہنے پر

اُنھین تو شرم نہین آتی مگر ہم بجاے خود اُن کے عوض شرما لیا کرتے ہین۔

رومیون کے بعد سرزمین عرب سے نیّر اسلام طلوع ہوا۔ اور عرب لوگ توحید کندھے پر رکھ کے افریقہ سے ہوتے ہوے یورپ پہونچے۔ ان موحدون کے نزدیک نہانا اور وضو کرنا خدا کی عبادت کے لیے لازمی تھا۔ اسی قدر نہین جنابت کی حالت مین اُنھین بغیر نہائے ایک گھڑی بسر کرنا بھی دشوار تھا۔ اُن کو غسل و وضو کرتے اور گھڑی بھر کے لیے بھی نجاست کو نہ برداشت کرسکتے دیکھ کر تعصب نے مسیحیون کو یقین دلایا کہ نہانا دھونا اور بدن کو پانی مین بھگونا ایمانداری کے خلاف اور کافرون (مسلمانون) کا کام ہے۔ دیندار مسیحیون کو ان باتون سے کیا غرض؟ بہرحال مسیحیون کو طہارت کرنے اور نجاست دُور کرنے سے روز بروز نفرت و مخالفت ہوتی گئی۔ اور نہانے دھونے کا جو کچھ سامان اگلے رومیون کا مہیا کیا ہوا باقی تھا سب ان کے ہاتھون فنا ہوگیا۔ جس کا عجیب نتیجہ آج یہ نظر آرہا ہے کہ اسی سرزمین (یورپ) مین جہان رومیون نے گانون گانون مین حمام بنوائے تھے آج اگر ایک آدھ حمام عجائباتِ قدرت کے نمونے کے طور پر بنا بھی لیا گیا ہے تو اپنی چیز نہین بلکہ "ٹرکش حمام" یعنی ترکون اور مسلمانون کی چیز کہا جاتا ہے۔

مسلمانون کو تمدن و دولت حاصل کرتے ہی اپنی طہارت اور صفائی کی ضرورتون کے لحاظ سے حمام ایک نعمت غیر مترقبہ نظر آیا۔ اُنھون نے فوراً اُسے اختیار کرلیا۔ اور جہان جہان عرب جاکے آباد ہوے یا دین اسلام پہونچا ہزارون حمام تعمیر ہوگئے۔ اسی قدر نہین اُنھون نے اپنے حمامون مین رومی حمام سے بھی زیادہ ترقی کی۔ چنانچہ فی الحال دنیا کے تمام باعظمت و شاندار حمام مسلمانون کے بنائے ہوے ہین۔

اہل اسلام کے حمامون مین سے وہ ورزش خانہ نکل گیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ سپہگری کے فنون اور اسلحۂ جنگ کی ورزشون کا جداگانہ مستقل انتظام ہوگیا۔ اور یہ چیزین کبھی کبھی کے لیے نہین بلکہ روزانہ تعلیم مین داخل ہوگئین۔ ان اسلامی حمامون مین پہلے انسان ایک کمرے مین داخل ہوتا ہے جس کی گرمی اس قدر معتدل

ہوتی ہے کہ ناگوار نہیں گزرتی - اور کوئی مضر اثر نہیں ڈال سکتی - وہان کپڑے اُتار کے اور ایک مناسب زمانے تک ٹھہر کے انسان ایک اور کمرے مین جاتا ہے جو پہلے کمرے سے زیادہ اور نہانے کے کمرے سے کم گرم ہوتا ہے - یہان بھی تھوڑی دیر ٹھہر کے وہ اُس کمرے مین جاتا ہے جہان نہاتا ہے - یہان تک پہونچتے پہونچتے خوب پسینہ آ جاتا ہے - میل چھوٹنے کے لیے خوب پھول جاتی ہے - اب حمامی ایک چوکی پر بٹھا کے تمام جسم پر تیز گرم پانی ڈال دیتا ہے - پھر کیسے سے خوب مل مل کے میل چھڑاتا ہے اور بدن کو صاف کرتا ہے - بالون کو بیسن یا کھلی یا کسی اور چیز سے مل کے دھوتا ہے - اسکے بعد وہ مختلف پیچون اور طریقون سے ہڈیون کے جوڑون کو کھینچتا ہے اور ایسی اچھی ولک کرتا ہے کہ نہایت آرام ملتا ہے - اور معلوم ہوتا ہے کہ سارے اعضا نرم پڑ گئے - تھکن اور سُستی دُور ہو گئی اور ہاتھ پاؤن کھل گئے - اس کے بعد جسم پر خوب پانی بہا کے اور بخوبی طہارت کر کے انسان لنگی بدل کے حسب ترتیب اُنھین کمرون سے گزرتا ہے جن مین سے ہو کے گیا تھا - اور آخری کمرے مین دم بھر ٹھہر کے اور کپڑے پہن کے اپنے گھر چلا آتا ہے -

تدریجی کمرون کی وجہ سے انسان آخری کمرے مین اُس درجے تک کی حرارت کو برداشت کر لیتا ہے کہ اگر براہِ راست نہانے کے کمرے مین چلا جائے تو وہان کی حرارت اُس کے لیے اس قدر ناقابل برداشت ہو کہ ضرر پہونچا دے - ترکی حمامون مین پتھرون پر گرم پانی چھڑک چھڑک کے نہانے کی کمرے کی حرارت ۱۴۰ درجے تک پہونچا دی جاتی ہے -

حمام اگرچہ سرد ممالک اور ہمارے یہان بھی جاڑون مین نہایت لطف کی چیز ہے اور اُن سے اطبا نے اپنے فن مین بھی بہت فائدہ اُٹھایا ہے مگر اُسکے ساتھ نہایت ہی خطرناک چیز بھی ہین - اگر حرارت اعتدال سے تجاوز کر جائے تو جان کا خطرہ ہے - چنانچہ اگلی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد بادشاہون اور بہت سے امیرون کی جانین حمامیون سے سازش کر کے حمام ہی کے ذریعے سے لی گئی ہین -

---

رقص موریق

یورپ کا ایک خاص قسم کا ناچ ہے جس مین ناچتے وقت پاؤن مین گھنگرو باندھ لیے جاتے ہین۔ ہندوستان مین ناچ مین علی العموم گھنگرو باندھنے کا رواج ہے۔ یہان ناچ مین گھنگرو باندھنا لازمی ہے۔ مگر انگریز ایسا نہین کرتے۔ بلکہ اُنکے وہان جس ناچ مین گھونگھرو باندھے جائین وہ ناچ رقص موریق کہلاتا ہے۔ اور اُن کا خیال ہے کہ اسکے موجد خاص عرب ہین جن کی صحبت سے پہلے اسپین والون نے سیکھا۔ اور اُن سے سارے یورپ نے تعلیم پائی۔

اس رقص مین خصوصیت یہ ہے کہ گھونگھرو کی آواز تال سُر کے موافق رہتی ہے اور اُنکے نغمے کی دلکشی اور اُنکے بجنے کی مناسب ترتیب حاضرین محفل کو لطف دیتی ہے۔ اگرچہ ممالک یورپ مین تو اب اس رقص کا رواج بہت کم ہو گیا ہے مگر اسپین مین آج تک باقی ہے اور "فنڈانگو" کہلاتا ہے۔

غور طلب یہ امر ہے کہ محققین یورپ پاؤن مین گھونگھرو باندھ کے ناچنے کو مسلمانون کی ایجاد بتاتے ہین۔ مگر ہمین اس کا رواج ایشیا بلکہ تمام مشرقی ممالک مین اس کثرت سے نظر آتا ہے خصوصاً ہندوستان کے قدیم فن رقص مین اس قدر ضروری مانا جاتا ہے کہ اسکی ایجاد کو عربون سے منسوب کرنا بعید از قیاس معلوم معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کی روایتین بتا رہی ہین کہ رقص خاص دیوتاؤن سے اور دیوتاؤن کی پرستش سے شروع ہوا۔ اور اُس قدیم ترین زمانہ سے آج تک اُسی حال پر چلا آتا ہے۔ جس مین غالباً گھونگھرو باندھ لینا اسی زمانے لازمی ہو گا۔

ہندوستان کی موسیقی کی نسبت بھی پہلے سے ہمارا یہی خیال تھا کہ موجودہ موسیقی وہی ہے جو ہندوون کے قدیم عہد مین موجود تھی۔ مگر بعد کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ ہندی موسیقی خالص ہندو موسیقی نہین ہے بلکہ اُس مین بہت بڑا حصہ عربون کی موسیقی کا مل گیا ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ رقص مین بھی گھونگھرو باندھنے کا رواج مسلمانون کے آنے سے پہلے نہ ہو۔ اور اس جزو کو یہان کے

ناچ مین مسلمانون ہی نے اضافہ کیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسلمانون سے ہندوون نے سیکھا ہو۔

دنیا مین ناول نویسی کی ابتدا

ناولون اور ناول نویسی کو فی الحال ہم نے اہل یورپ سے لیا ہے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ہماری قدیم امانت ہے جس کو ہم ان امانت داران مغرب سے واپس لے رہے ہین۔ ناول کا آغاز خیالی اور طبعزاد قصوں سے ہے۔ جو ابتداءً محض داستان گوئی کی شان سے قلمبند کر لیے گئے۔ اسکے بعد یہ ترقی ہوئی کہ محض خیال آفرینی چھوڑ کے تاریخی واقعات مین رنگ آمیزی کو کے دلچسپ داستانون کی شان پیدا کی گئی۔ اسکے بعد ناول کی ترقی کا تیسرا درجہ یہ تھا کہ انسانی زندگی کے واقعات نئے نئے اسلوب سے دکھائے جائین اور اُنکے ذریعے سے معاشرت و اصلاحِ زندگی کا سبق دیا جائے۔

مشرق مین سب سے پہلا متمدن ملک مصر ہے۔ اور مصر والون ہی سے قصہ نویسی کا آغاز بھی ثابت ہوتا ہے۔ فراعنۂ مصر کے قدیم عہد کا لکھا ہوا ایک قصہ جو آج سے کچھ اوپر تین ہزار سال پیشتر لکھا گیا تھا ایک پاپرس (مصریون کا پرانا مکتوب نما کاغذ جو ایک درخت کی لکڑی کے ورق اُتار کے بنایا جاتا تھا) پر لکھا ہے لندن کے عجائب خانہ "برٹش میوزیم" مین موجود ہے۔ اسکے مختلف اجزا الگ الگ لیے گئے تھے۔ مگر اُسکا مکمل ترجمہ سب سے پہلے مشہور جرمنی محقق علومِ مصریہ ڈاکٹر بروغش نے جرمنی زبان میں کیا۔ جو ۱۸۶۵ء مین شایع ہوا تھا۔ اس قصے کو دربارشاہی مصر کے ایک وقائع نگار نے فرعون مصر "رامیس ثانی" کے فرزند اور ولیعہد "ستی منی فاتہ" کے تفنن طبع کے لیے لکھا تھا۔

اس قصے کے رنگ عبارت اور اُسکے مذاق ادبی کی نسبت جرمنی محقق "مسٹر ایکا فونیل ویوخ" لکھتے ہین کہ "عبارت سادی اور صاف ہے۔ اور گو کہ شاعرانہ تخئیل سے خالی نہین مگر اس پر بھی سادی اور سلجھی ہوئی ہے۔ اس کی عبارت بھی اُسی رنگ کا نمونہ ہے جو قدیم الہامی کتابون خصوصًا توراۃ میں پایا جاتا ہے یعنی

بجد صفائی اور سادگی ہے"

اس قدیم مصری قصے کا خاکہ یہ ہے کہ دو بھائی ہین - بڑے بھائی کی جورو چھوٹے کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو پوطیفار (عزیز مصر) کی بیوی زلیخا نے حضرت یوسف کے ساتھ کیا تھا - چنانچہ وہ اُسے اپنے شوہر کی نظر مین ملزم و مجرم ثابت کر دیتی ہے - آخر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے خوف سے گھر چھوڑ کے بھاگا اور سورج دیوتا کی مدد سے انسانی پیکر چھوڑ کے ایک عجیب قسم کے نئے پیکر کو اختیار کر لیتا ہے - اب اصلی واقعہ بڑے بھائی پر کھلتا ہے - اُس کی مکار جورو اپنے کیفر کردار کو پہونچتی ہے - جس کے بعد چھوٹا بھائی پھر انسانی صورت اختیار کرتا ہے - اور دونون بھائی الفت و محبت سے ملتے ہین - بڑا بھائی چھوٹے کی قدر اور چھوٹا بڑے کا احترام کرتا ہے - اور انجام یہ ہوا کہ بڑا بھائی ترقی کر کے عزیز مصر ہو گیا -

اس مصری قصے کے سوا یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ ایران و عرب اور دیگر ممالک مشرق مین بہت قدیم زمانے سے خیالی اور طبعزاد قصون کا عام رواج چلا آتا تھا - اُنھین سے یونانیون نے قصہ خوانی و قصہ نویسی سیکھی - پھر یونانیون سے اس مذاق کو اہل روم نے حاصل کیا - چنانچہ سب سے پہلے لاطینی مین رومیون نے یونان کی داستان ہائے "ارسٹائڈیز" کا ترجمہ نہایت اہتمام سے کیا - اور یہ ترجمہ اُس عہد مین ہوا جب رومیون مین عنان حکومت ہاتھ مین لینے کے لیے باہمی خونریزی ہو رہی تھی - اور ماریوس اور سیلا ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے - رومیون نے اس قصے کو بہت پسند کیا - اور ان مین بھی افسانہ نویسی و قصہ خوانی کا رواج ترقی کرنے لگا -

مسلمانون نے اپنے عہد مین افسانہ نویسی کو کسی اور قوم سے نہین لیا - اس لیے کہ خود انسان مین داستان گوئی کا حد سے زیادہ رواج تھا - اور عہد جاہلیت سے اُن مین داستان گوئی کی محفلین مرتب ہوا کرتی تھین - عرب کے اکثر قصون کا مجموعہ "الف لیلہ" ہے جو دنیا کے سارے افسانون سے زیادہ پسندیدہ اور ہر قوم و ملک مین رواج پا چکی ہے - الف لیلہ کے اصلی مصنف یا مولف کا

...م کسی کو نہین معلوم ۔ مگر کہا جاتا ہے کہ فارسی کے قصہ "ہزار افسانہ" سے ماخوذ ہے
...ساسانیون کے عہد مین ایران مین مروج اور اہل عجم کو بہت پسند تھا ۔ لیکن
...ر یہ صحیح بھی ہے تو عربون نے اُسے اس خوبی کے ساتھ لیا کہ اُس مین عجمی معاشر
...نام بھی نہین خالص عربی معاشرت اور خلفاے عباسیۂ بغداد کی اعلیٰ ترین معاشرت
...نمونہ ہے ۔ مگر کمال یہ ہے کہ اسکے مختلف قصون مین ایسے ایسے عجیب اور جدید
...اقعات زندگی دکھائے گئے ہین کہ باوجود عربی معاشرت ہونے کے ہر قوم اور
...ر زبان مین جاکے تمام افسانون سے زیادہ دلچسپ ثابت ہو جاتی ہے ۔

انگریزی ناولون کا آغاز رومیون کے ترجمون سے ہوا ۔ جن سے انگلستان
...بہت سے قدیم ترین اور اعلیٰ ترین مصنفین ڈراما نے اپنی تصانیف کے لیے
...تلف قصون کے خاکے لیے ہین ۔ مگر یہ عموماً رومیون کی عام پسند ۔ باذاق اور
...مضحک کاٹیون سے ماخوذ تھے ۔

انھین طبعزاد خیالی قصون سے تاریخی ناولون کا آغاز ہوا ۔ کسی عشق یا
...نگ کے واقعہ کو گھٹا بڑھا کے ایسی رنگین عبارت مین لکھا جاتا کہ قصہ سے
...یادہ لطف تاریخ مین پیدا ہو جاتا ۔

ملکہ الزبتھ کے عہد مین اسپین کے ناول ترجمہ ہوے جن کا ماخذ عربی مذاق
...تھا ۔ ان کا پہلا مترجم "جان للیا" تھا ۔ جس کی عبارت مین کسی قسم کی رنگینی
...عبارت آرائی نہ تھی ۔

سترہوین صدی کے وسط مین "مسز افرا بہن" نے یہ جدید طریقہ اختیار کیا کہ
...ر افسانون مین انسان کی معاشرت اور گھریلو زندگی کے نئے نئے نمونے دکھائے
...جائین ۔ اور اسی عہد مین "مسز مین لے" نام ایک انگلش خاتون نے اپنے
...ناولون کے ذریعے سے اُس دَور کی مروجہ اور پسندیدہ بدکاریون کے نمونے
...دکھائے ۔ اور سارے مصنف اُسی رنگ کے پیرو ہو گئے ۔

دہلی اور لکھنؤ کی اُردو

مدت دراز سے یہ جھگڑا چلا جاتا ہے جو کسی طرح طے نہین ہوتا ۔ اور

وہی پرانے اعتراضات و شکوک ہیں جن کا بار بار اعادہ کیا جاتا ہے - دہلی والے کہتے ہیں کہ لکھنؤ والوں نے اُردو میں عربی الفاظ اور فارسی بندشوں کو بے احتیاطی سے بھر دیا - رعایت لفظی جگت اور قافیہ پیمائی میں پڑ گئے - لکھنؤ والے کہتے ہیں کہ دہلی والوں کی زبان میں پنجابی مل گئی - وہاں نے لفظوں - وہاں کے لہجے - اور وہاں کی ترکیبوں میں ناگوار سختی اور کرختگی ہے - اور فارسی و ہندی جن کی آمیزش سے زبان اُردو بنی ہے اُن کے امتزاج نے تکمیل کا درجہ حاصل نہیں کیا تھا اور خامی باقی تھی کہ دہلی اُجڑ گئی -

لیکن یہ سب باتیں غلط ہیں - دہلی والوں کا اعتراض اگر صحیح بھی ہو تو فارسی و عربی کے الفاظ کا بھرتی ہونا کسی غیر مانوس و نا آشنا زبان سے متاثر ہونا نہ تھا عربی ملی ہوئی فارسی ہی کے آغوش میں اُردو پلی تھی - اسی زبان سے سبق لے لے کے اُس نے اپنی حیثیت کذائی حاصل کی تھی اور اُردو شعرائے متقدمین اُسی رجحان و شوق سے فارسی و عربی کے الفاظ کو اختیار کرتے چلے آئے تھے جس طریقے سے کہ لکھنؤ والوں نے لیا - علیٰ ہذا القیاس رعایت لفظی اور مناسبات صوری و معنوی کا لحاظ بھی شعرائے فارس و عرب کو ویسا ہی تھا جیسا کہ لکھنؤ میں سب کو یا بعض لوگوں کو ہو گیا

دہلی کی زبان پر پنجابی کا اثر پڑنے کے بھی کوئی معنی نہیں - اہل لکھنؤ کو دہلی کے جو الفاظ یا بندشیں اپنی زبان پر غیر مانوس معلوم ہوتی ہیں اُن کی نسبت عموماً کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ پنجابی کا اثر ہے - ممکن ہے کہ بعض لہجے اور بعض محاورے پنجاب کی زبان سے ملتے ہوں اس لیے کہ پنجاب دہلی سے قریب ہے - مگر اُنکی نسبت یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ پنجابی زبان کے اثر سے دہلی میں پیدا ہوے - یہ کیوں نہ کہا جائے کہ دہلی سے پنجابی میں پیدا ہوے - بعینہ اسی طرح اہل دہلی کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لکھنؤ کی اُردو پر پوربی بھاشا کا اثر پڑ گیا - اُردو وہی پر منحصر نہیں دنیا کی جو دو زبانیں ایک دوسرے کے قریب بولی جاتی ہوں گی اُن کا اثر ایک دوسرے پر ضرور پڑا کرتا ہے - مگر یہ کہنا کہ اُس اثر سے زبان بگڑی یا بنی یا ایک غیر موجہ اور فرضی چیز ہے - اسی طرح یہ بھی لغو

ہے کہ دہلی مین اُردو ہندی کی آمیزش عمدہ اور مکمل مزاج نہین پیدا کرنے پائی تھی۔ اس لیے کہ اصلی اُردو کا کوئی صحیح معیار نہین قرار دیا جا سکتا۔

اور لطف یہ ہے کہ لکھنؤ اور اہل دہلی کی زبان مین جو اختلاف ہے اُسکو تعلق نہ فارسی الفاظ کے زیادہ داخل ہونے سے ہے نہ پاس پڑوس کی زبانون سے اثر پذیر ہونے سے۔ بلکہ اصلی اختلاف چند الفاظ کی تذکیر و تانیث۔ چند محاورون اور دونون مقامات کے لہجے اور طرز ادا مین ہے۔ یہ چیزین دونو مابہ البحث شہرون کے خصوصیات مین سے ہین۔ جن کا محاکمہ نہ کسی عقلی اصول یا کسی مسئلہ علم معانی و بیان سے ہو سکتا ہے۔ اور نہ کسی ادبی استدلال سے۔

واقعہ یہ ہے کہ اُردو زبان آگرے اور دہلی مین پیدا ہوئی اور وہین نشو و نما پا کے اُس نے اپنی موجودہ صورت پیدا کر لی۔ شجاع الدولہ آصف الدولہ اور سعادت علی خان کے زمانون مین دربار دہلی کی کمزوری و بے استطاعتی اور لکھنؤ کے نوابی دربار کی دولتمندی و قدردانی کی وجہ سے قریب قریب دہلی کے تمام صاحبان کمال عام اس سے کہ کسی فن اور کسی طبقے کے ہون لکھنؤ مین کھنچ آئے۔ اور جو چند دہلی مین پڑے رہ گئے وہ بھی لکھنؤ کو حسرت کی نظر سے دیکھتے تھے اس لیے کہ وطن مین محفلہاے شعر و سخن کا چراغ گُل ہو گیا تھا۔

یہ مجمع لکھنؤ مین جمع ہو گیا تو جب تک وہ صاحبان کمال زندہ رہے جو بذات خود دہلی سے آئے تھے یہ سمجھتے رہے کہ دہی دہلی کی سبھا اودھ مین آکے جم گئی ہے۔ مگر اُنکے مرنے کے بعد اُنکی اولاد نے دہلی کی غلامی سے آزاد ہونے کا دعوے کیا۔ اپنے وطنی اساتذہ کی شاگردی پر ناز کرنے لگے۔ اور چونکہ لکھنؤ کے ادبی و علمی اسکول کا بھی اثر پڑنے لگا۔ جسکو سب سے زیادہ قوت یون ملی کہ صرف و نحو معانی بیان عربی منطق و فلسفہ اور فقہ و اصول فقہ کی منفرد درس گاہ لکھنؤ تھا۔ لکھنؤ ہی نہین لکھنؤ کے بہت سے قصبات مثلاً بلگرام۔ سندیلہ گوپامؤ۔ امیٹھی۔ وغیرہ بھی علم و فضل کی مستقل درس گاہین تھے۔ جہان تشنگانِ علم اقطاع ہند سے کھنچ کے آتے اور برسون رہ کے کمال پیدا کرتے۔ یہ لوگ عربی علم و فن کے علاوہ اُردو کا ادبی مذاق اور سخندانی کا ذوق بھی اپنے

ساتھ لے جاتے - اور سچ یہ ہے کہ اُردو زبان گو کہ دہلی مین پیدا ہوئی مگر سارے
ہندوستان مین اُس کی اشاعت لکھنؤ کے ذریعے سے ہوئی -

لکھنؤ کی اس ادبی خودسری نے ادب اُردو کے دو جداگانہ اسکول قائم
کردیے - ایک دہلی کا اور ایک لکھنؤ کا - اور سارا ہندوستان اُردودانی مین
ان دونون اسکولون پر بٹ گیا - ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہین کہ ان دونون
اثرون کی تقسیم بلحاظ جغرافیہ کیا ہے - شمالی ہند مین پنجاب سے لے کے بریلی
تک دہلی کا اسکول مرکز زبان مانا جاتا ہے - لہذا اہل لاہور - میرٹھ - علی گڈھ -
مرادآباد - بدایون - اٹاوہ - اور بریلی خالص دہلی کی زبان کے پیرو ہیں - شاہجہان
پور سے لیکر کلکتہ تک لکھنؤ کی زبان کا اثر مانا جاتا ہے - اور وہان کے شعرا و زباندان
لکھنؤ کی زبان کے پیرو ہین - چنانچہ شاہجہانپور - کانپور - جون پور - فیض آباد
گورکھپور - بنارس - اعظم گڈھ - غازیپور - پٹنہ - عظیم آباد - مرشدآباد - ڈھاکہ
کلکتہ - ان سب مقامات کے لوگ لکھنؤ کی زبان کو دہلی پر ترجیح دیتے ہین -

رہا جنوبی ہندوہان کے لوگون کا کوئی عام مذاق یا رجحان نہین ہے
بلکہ جس سوسائٹی مین جس شہر کا اُستاد اپنا سکہ جما لیتا ہے لوگون کو اپنی طرف
کھینچ لیتا ہے - حیدرآباد میں اگرچہ زبان اُردو براہ راست دہلی سے گئی -
بلکہ سچ یہ ہے کہ پہلے اُستادانِ اُردو دکن ہی مین پیدا ہوے اور زبان اُردو
چاہے دہلی سے دکن مین گئی ہو - مگر اُردو شاعری دکن سے دہلی مین آئی - لیکن
آخر مین شعرائے دہلی و لکھنؤ کا ایسا سکہ جما کہ سارے دکن کے شعرا کو اُنکے آگے
سر جھکا دینا پڑا - اور ضروری ہوگیا کہ دہلی یا لکھنؤ مین سے کسی ایک شہر کی زبان
کو اختیار کرین - رشید الدین خان نے اپنی تاریخ رشید الدین خانی مین زبانِ
لکھنؤ کی خوبی کو بڑے زور سے تسلیم کیا ہے - اور چند روز پیشتر وہان کا عام
رجحان زبان لکھنؤ کی طرف تھا - داغ مرحوم کے اثر نے بہت سے دلون پر
دہلی کا سکہ جمایا - مگر اُنکے زمانے ہی مین امیر مرحوم کا بہت کچھ اثر موجود تھا -
جس کو اب حضرت جلیل نے زندہ کردیا - اور فی الحال حیدرآباد کی شاعری کا
رجحان جس قدر حضرت جلیل - اختر مینائی - اور مولوی سید علی حیدر صاحب نظم

لکھنوی کے کلام اور اُنکی زبان کی طرف ہے دہلی کی زبان کی طرف نہین یہین
السلطنتہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بھی جو بجاے خود ایک شاعر شیوا بیان اور
ادیب بے ہمتا ہین پنڈت رتن ناتھ سرشار اور دیگر اساتذہُ لکھنؤ کی دوستی
کی بدولت لکھنؤ کی زبان کے مربی ہین - اور جہان تک میرا خیال ہے اعلیحضرت
محی الملتہ والدین خسرو دکن خلداللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے کلام سے اُنکا رجحان
بھی لکھنؤ ہی کی طرف پایا جاتا ہے - لیکن وہین ہمارے مکرم دوست مولوی
عبدالحق صاحب بی اے اپنی وطنی اثر اور علیگڈھ کی تعلیم کی برکت سے
دہلی کے اسکول زبان کے دلدادہ ہین - اس مین کوئی مضائقہ نہین - مگر اُنکے
اس رجحان کا اگر یہ نتیجہ ہو کہ انجمن ترقی اُردو کی ہر کتاب کے دیباچے مین لکھنؤ
کی اُردو پر حملے کیے جائین تو ضرور افسوس کے قابل ہوگا - اس سے وہ اُردو
کو فائدہ نہین بلکہ نقصان پہونچائین گے -

لکھنؤ اور دہلی کی زبانون کا محاکمہ کرنا اُن کا یا میرا یا کسی شخص کا کام
نہین ہے - یہ مسئلہ اب اس درجے سے گذر گیا کہ کسی فیصلہ کرنے سے فیصلہ
ہو جائے - یا جھگڑا چلے - غذا - خوشبو - نغمہ اور اس قسم کے صدہا ذوق ہین
جو "العادۃ کالطبیعۃ الثانیہ" کے اثر سے انسان کے دماغ مین بس جاتے ہین اور
پھر اُن سے وہ اس قدر متأثر ہو جاتا ہے کہ کوئی فیصلہ اور کوئی فلسفہ اُنکے
اثر پر غالب نہین آ سکتا - ایک غذا یورپ والون کو سب سے زیادہ لذیذ -
ایک خوشبو اہل فرنگ کو سب سے بڑھ کے فرحت بخش اور ایک نغمہ اہل مغرب
کو لذیذ ترین غذاے روح معلوم ہوتا ہے مگر ہندوستان والون کو وہ تینون
نہایت ہی بدمزہ - دماغ سوز اور عذاب جان محسوس ہوتے ہین - کوئی صاحب
ہین جو اسکا فیصلہ کر دین یا اس جھگڑے کو مٹا دین؟

یہی حالت زبان کی ہے - ایک بچہ جس سرزمین مین پیدا ہوتا، جس
آغوش مین پلتا، جن بچون مین کھیلتا، جن دوستون سے ملتا جلتا ہے اُنکی
زبان اُسکے دل و دماغ میں جم کے بیٹھ جاتی ہے - اور وہی زبان اسکو دنیا
کی بہترین زبان نظر آنے لگتی ہے - جس طرح ایک بچہ مسلمان گھر مین پیدا ہوکے

کی اگلی نامور شاہنشاہیون کی یادگار عمارتون پر کندہ ہین - اُسکے حروف علی العموم میخون یا تیر کے پھلون (پیکانون) کی قطع کے ہوتے ہین - اسی وجہ سے حال کی دنیا نے اس خط کا نام "خط پیکانی" رکھ دیا ہے -

اس خط کے اکثر کتبے بڑی بڑی چٹانون اور عہد قدیم کی مورتون پر کھدے ہوے ہین - یا اینٹون اور کھپرون پر ٹھپے کے طریقے سے بنا دیے گئے ہین - یہ کتبے دولت عجم کے قدیم دار السلطنت پرسی پولی (اصطخر) کی پرانی یادگارون پر - جا بجا ساسانی سلطنت کے اور بہت سے شہرون مین - بابل اور نینوا کے کھنڈرون مین اور نیز مصر کے بعض آثار منہدمہ مین بھی نظر آتے ہین - بظاہر اسباب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل اس خط پیکانی سے اشوریا اور میڈیا مین کام لیا گیا - بعد ازان یہ تحریر پورے عجم اور دولت فارس کی ساری قلمرو میں پھیل گیا -

اس کے خط کے حروف تین جداگانہ شانون کے برآمد ہوے ہین - اور اکثر مقامات ہین اس خط کی تینون شانین ایک ہی جگہ یون دکھا دی گئی ہین کہ تینون وضعون کے حروف تین متوازی کالمون مین برابر برابر منقوش ہین - اور ایک ہی مطلب یا ایک ہی الفاظ تینون خطون مین کندہ کر دیے گئے ہین تاکہ ان مین سے جس کسی کو کوئی پڑھ سکتا ہو پڑھ کے دوسرون کا بھی مطلب سمجھ جائے - ان تین شانون مین سب سے قدیم اشوریا والون کے خط پیکانی کی شان ہے - اس مین تقریباً ۴۰۰ متمائز اور جداگانہ حروف ہین - دوسری شان میڈیا والون کی ہے جو در اصل پہلے ہی خط کی اصلاح و تہذیب ہے - اور اُس مین گھٹا کر ۱۰۰ حرف رکھ لیے گئے ہین - تیسری اور سب سے پچھلی شان فارسیون کے خط کی ہے - جس مین فقط ۳۹ سے لے کے ۴۴ تک حروف تہجی باقی رہ گئے ہین - اور یہی خط پیکانی سب سے زیادہ مکمل اور اصلاح شدہ ہے - سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے حرفون مین باہمی تشابہ و التباس نہین باقی رہا ہے کہ ایک حرف پر دوسرے کا شبہہ ہو سکے - اُسکے حروف نہایت ہی واضح و متمائز بھی ہین - اور اُن کے پڑھنے مین بہت کم دشواری یا غلطی ہو سکتی ہے اسکے علاوہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ الفاظ ایک ترچھی لکیر کے ذریعہ سے جدا اور ممتاز

کر دیے جاتے ہین - جو فارسی زبان اس خط مین لکھی ہوئی ہے اُسکی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ موجودہ فارسی کی مان یہی ہے - اور حیرت کی بات ہے کہ موجودہ حالت سے الگ ہو کر وہ سنسکرت سے بہت قریب ہو گئی ہے - جس سے یہ خیال قائم ہو گیا ہے کہ فارسی اور سنسکرت زبانین اصل مین کبھی ایک ہی تھین -

اشوریا والون کے کتبون مین مختلف پیکانی قطع کے حروف ابتدائی خیالات ظاہر کرتے تھے - لیکن بیرونی ممالک کے لوگ یا جو لوگ دوسری زبان بولتے تھے اُنکی تحریر مین اُنھین الفاظ کی شکلین جو اُسی خیال کو ظاہر کرتین اشوریا والون کی لفظون کی شکلون سے جداگانہ تھین - اس خط مین بہ تعمق غور کرنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ حروف جن سے ایک لفظ مرکب ہوتا وہ بلا لحاظ اپنی شکلون کے ایک خاص خیال کو ظاہر کرتے - نتیجہ یہ تھا کہ ایک جملے کے سمجھنے مین یہ بڑی دشواری پیش آجاتی کہ آیا یہ جملہ خیالات کی شکلون کے لحاظ سے لکھا گیا ہے یا آوازون کی شکلون کے لحاظ سے - پھر اس سے بھی زیادہ مشکل یہ بات تھی کہ بعض حروف مختلف خیالات کی جگہ پر استعمال کیے جاتے - اور اس کا پتہ لگانا کہ یہان کون سا خیال مقصود ہے نہایت ہی دشوار تھا - لیکن خزف پارون پر بعض کھڑی کھڑی سطرین لکھی ملین جن سے بڑی مدد ملی - ان مین پہلے تو یہ بتا دیا گیا تھا کہ کون کون حروف خیالات کے ادا کرنے کے لیے مخصوص ہین - اور اُنکے مقابل وہ تمام حروف کنندہ تھے جو آوازون کو ادا کرتے ہین یا خاص خاص آوازون کے لیے قائم کیے گئے ہین - چند ایسے خزف پارے ملے جن مین الفاظ کے مقابل اشوریا کی زبان مین اُن کا مطلب بھی بیان کر دیا گیا تھا -

یہ پیکانی وضع کے حروف اصطخر کے کھنڈرون مین پہلے پہل سنہ ۱۰۲۷ محمدی (سنہ ۱۶۱۸ء) مین نظر آئے - لیکن اُسوقت نہ اُن کا کچھ مطلب سمجھا جا سکتا تھا اور نہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ کیا ہے - سنہ ۱۰۸۳ محمدی (سنہ ۱۶۷۴ء) مین اے ایم چارڈون نام ایک شخص نے اُن مین سے بعض کتبون کی نقلین لے لین - اور اُن پر غور ہونے لگا - یہان تک کہ سنہ ۱۲۱۷ محمدی (سنہ ۱۸۰۲ء) مین ایک مستشرق عالم یورپ ٹامسن ہائڈ نے اُس پر بے انتہا فکر کی - اور بڑے غور و پرداخت کے بعد اُس نے جو رائے قائم

کی یہ تھی کہ یہ کوئی تحریر نہین - فقط خیالی شکلین ہین جو اس غرض سے بنا دی گئی ہین کہ طرح طرح کے پیکانی نقش و نگار بنا کے خوشنمائی پیدا کی جائے - بعض لوگون کا خیال اس جانب گیا کہ معمارون نے محض اتفاقی طور پر یہ نقش بنا دیے ہین - ورنہ ان سے کوئی خاص غرض نہین مقصود ہے - ایک جرمنی بزرگ نے یہ فرمایا کہ یہ نقش کیڑون اور حشرات الارض نے بنا دیے ہین - مگر باوجود ایسے خیالات کے ظاہر کیے جانے کے لوگون کو اطمینان نہ ہوتا تھا - چنانچہ نیہر نام ایک محقق نے اس بات پر اپنا یقین ظاہر کیا کہ یہ نقوش بے وجہ نہین - اور بجز اسکے اور کوئی بات نہین کہ یہ نقوش کسی اگلے رسم خط کے حروف ہین - چند روز مین دیگر مبصرین بھی نیہر کے ہم خیال ہو گئے - مگر ایسی کوئی تدبیر کسی کے ذہن مین نہ آتی تھی کہ ان تحریرون کا مطلب سمجھا جا سکے - ۱۲۲۱ محمدی (۱۸۰۲ع) مین ہنیوور کے ایک مشہور عالم اسنہ روٹ فنڈ نے اعلان کیا کہ مین نے اس خط پیکانی کے تمام حروف بھی پڑھ لیے اور پتہ لگا لیا کہ یہ کتبے کیونکر پڑھے جا سکتے ہیں - اس کے بعد ۳۳ سال تک خاموشی رہی - یہان تک کہ ۱۲۶۴ محمدی (۱۸۳۵ع) مین سر ہنری رالنسن نے ایران کا سفر کیا - کوہ بے ستون کے مشہور و معروف کتبے کو خود جا کے دیکھا - اور اُسکی نقل اُتار لی - ایک بلند پہاڑ کے ایک پہلو پر جس جانب سر بفلک چٹان سیدھی بخط مستقیم کاٹ کے مسطح کر دی گئی ہے دامن کوہ سے ۳۰۰ فٹ کی بلندی پر یہ کتبہ کھدا ہوا ہے - جہان تک بمشکل انسان کی رسائی ہو سکتی ہے - یہان پہاڑ کے اُس مسطح پہلو پر خط پیکانی مین تین تحریرین ہین اور شان و رسم خط مین تینون ایک دوسرے سے جدا اور متمائز ہین - باوجود اسکے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اگرچہ تینون خطون کی شان بدلی ہوئی ہے مگر اصل مین ہے ایک ہی خط -

یہ نقل لانے کے بعد سر ہنری رالنسن نے اُسپر غور کرنا شروع کیا - اور آخر محنت و جستجو کے بعد اُنھین پوری کامیابی ہوئی - فارسی زبان سے وہ بخوبی ماہر تھے - پرانی فارسی کا بھی مطالعہ کیا تھا - اسی فارسی دانی کی مدد سے انھون نے یہ کتبے پڑھ لیے - اُن کا ترجمہ کیا - اُنکو اس تحریر مین ہر حرف اور

ہر لفظ کی آواز معلوم ہو گئی اور ربط عبارت کا سلسلہ بھی معلوم ہو گیا۔

اسکے بعد انگلستان اور دیگر ممالک یورپ کے علمانے اس جانب بے انتہا توجہ کی۔ اور اُن تمام کتبوں اور تحریروں کو جو پُرانی عمارتوں کے در و دیوار پر، پہاڑوں کے پہلووں میں، اور ظروف یا ٹھیروں کے خزف پاروں پر ملیں سب پڑھ لی گئیں۔ اور اس ذریعہ سے اشوریا۔ بابل اور فارس کی اگلی سلطنتوں کا بہت معتدبہ حصہ جو تاریخوں میں موجود نہ تھا دنیا کو معلوم ہو گیا۔ اسی قدر نہیں تفتیش و جستجو کا جو سلسلہ جاری ہو گیا ہے اور جو نیا کتبہ زمین سے نکلتا یا کسی کھنڈر میں مل جاتا ہے ایک نیے صفحۂ تاریخ کا کام دیے جاتا ہے۔

رقص (اپریل ۱۹۱۹ء)

اگرچہ رقص اور سرود کا ساتھ ہے مگر ناچنا بذاتہ ایک نہایت ہی دلچسپ فن ہے۔ اُس کا اصل منشا یہ ہے کہ پاؤں ایک معینہ و مقررہ مقدار و ترتیب سے اُٹھائے جائیں یا گانے میں اسکی گت کی مناسبت سے جسم کو حرکت دی جائے۔ ناچنا اُن فطری جذبات سے ہے جن کی تعلیم خود فطرت نے دی ہے۔ اسی وجہ سے اس بات کا پتہ لگانا غیر ممکن ہے کہ انسان میں ناچ کا آغاز کب سے ہوا۔ اس کا پہلا موجد کون شخص ہے۔ یا پہلے پہل اس کا رواج کس قوم اور ملک میں ہوا۔ نہایت ہی وحشی و غیر متمدن قوموں میں بھی ناچنے کا رواج قدیم سے قدیم زمانے میں پایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں ناچ ایک بہت بڑا اہم فن ہے۔ اُسکے موجد اولیں مہادیو جی سمجھے جاتے ہیں۔ اور اُس کی ابتدا برھما جی کی پرستش و عبادت سے بتائی گئی ہے۔ اس سے بھی یہی نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ ناچنا فطری جذباتِ انسانی کے تقاضے سے ہے۔

ناچ کو عبادت سے وابستہ کرنا ہندوستان کے لیے مخصوص نہ تھا بلکہ دیگر اقوام نے بھی عبادت الٰہی میں اُس سے کام لیا ہے۔ یہودیوں میں بھی جو بت پرستی سے بالکل گریزاں و متنفر تھے بعض موقعوں پر ناچنا داخل عبادت تھا۔ توراۃ کے الفاظ ہیں کہ "اُنھیں ناچ کر خدا کی حمد کرنے دو"۔ اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ "حضرت داوٗدؑ خدا کے سامنے ناچے"۔ مسلمانوں کو ان بیانات سے وحشت نہ

نہ کھانا چاہیے۔ اس لیے کہ دراصل ناچ جس چیز سے عبارت ہے اُس میں آپ کا نماز میں بہ ترتیب اُٹھنا بیٹھنا۔ رکوع و سجود کرنا کلام الٰہی سے متاثر ہو کر آپ سے کسی بیتابی کی حرکت کا ظاہر ہو جانا۔ شعر خوانی میں الفاظ کے مطابق ہاتھ پاؤں اور چشم و ابرو کو حرکت دینا۔ یا مشائخ صوفیہ کا صحبتِ سماع میں بیتابی سے اُٹھ کھڑا ہونا اور ہاتھ پاؤں مارنے لگنا۔ یہ سب چیزیں رقص میں داخل ہیں۔

قدیم یونانیوں نے رقص کو علمی شان سے منضبط کر دیا تھا۔ اور غرض یہ تھی کہ اُس کے ذریعے سے مختلف قسم کے جذبات نہایت ہی خوبی کے ساتھ نمایاں کیے جا سکتے۔ ہومر کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ یونانیوں میں اکثر تفریحوں کے موقعوں پر ناچ ہوا کرتا تھا۔ ارسطا طالیس رقص کو بھی فنون شعر و نظم کے زمرے میں شامل کرتا تھا۔ اسپارٹا والے جو یونانیوں میں نہایت ہی بانکے اجاں باز سپاہی تھے بچوں کو پانچ ہی سال کی عمر سے ناچنے کی جبریہ تعلیم دینا شروع کر دیتے تھے۔ وہاں بڑے بوڑھے سکھاتے اور قوم کے سارے بچے سیکھتے۔ اہل اسپارٹا ناچ کے ساتھ بھجن اور مختلف قسم کے گیت بھی گایا کرتے۔ اسپارٹا کے نوجوانوں میں ایک خاص قسم کا ناچ "رقص فیرک" کا رواج تھا۔ یہ ایک جنگی ناچ تھا۔ جس کو ایک نمایشی لڑائی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

قدیم الایام کے لوگوں میں تین طرح کے رقصوں کا پتہ لگتا ہے (ایک) جنگی ناچ جو درحقیقت ایک قسم کی ورزش تھی۔ اور اُس کا مقصود یہ تھا کہ جسم تیار کیا جائے اور خوبصورت بنایا جائے۔ (دوسرا) تفریحی ناچ یہ صرف دل بہلانے اور صحبت میں زندہ دلی و بیمار انگیختگی پیدا کرنے کے لیے ہوتا۔ (تیسرا) دینی ناچ یہ عبادت کے ساتھ مخصوص تھا اور توبہ کرانے یا چڑھاووں کے موقعوں پر جوش و خروش کے ساتھ عمل میں آتا۔

مصریوں میں ناچ فراعنہ کے زمانے سے ثابت ہوتا ہے۔ فرعونوں کے دربار میں اُنکے سامنے ناچنے والی عورتیں کھڑی ہو کر ناچا کرتی تھیں۔ اسی طرح آج بھی مصر کے بازاروں اور وہاں کی صحبت ہائے علیش میں وہ پیشہ ور عورتیں ناچا کرتی

ین جو اپنے آپ کو خاندان برامکہ کی یادگار بتاتی ہین -
اشوریا و بابل مین بھی معلوم ہوتا ہے کہ فتحمند فوجون کے آگے آگے نازنین و
حسین عورتین ناچتی اور کھلیتی ہوئی چلتی تھین -
ہندوستان مین بھی ناچنے والی عورتون کا رواج نامعلوم زمانے سے چلا آتا ہے
ان مین سے اکثر مندرون مین روز دیوتاؤن کی مورتون کے سامنے ناچا کرتی تھین
یک ہزار سال پیشتر کا ایک عرب سیاح کہتا ہے "بعض راجاؤن کی سواری کے
ساتھ بہت سی عورتین ناچتی ہوئی چلتی ہین" - عبادت کے لیے عورتون کے ناچنے
کا رواج دکن کے بڑے مندرون مین آج بھی موجود ہے -
ساسانیون کے عہد مین ایران میں بھی رقاصہ عورتین موجود تھین - اور یہود
ین تو معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادیون اور امیرزادیون تک کے لیے کسی صحبت مین
کھڑے ہو کر ناچنا معیوب نہ تھا - ہیروڈیہ جس نے بادشاہ کو اپنے رقص سے از
خود رفتہ کر کے حضرت مسیح کو بپتسمہ دینے والے یحییٰ کا سر کٹوایا شاہزادی تھی -
ابتدائی زمانے کے مسیحی بھی اپنے مذہبی جلسون مین ناچا کرتے تھے - گو کہ
انجیل مین اس کا ذکر نہین ہے مگر اُنھون نے اپنے طرز عمل سے رقص کو عبادت
بنا لیا تھا -
اسلام مین البتہ بجز صوفیہ کی مجالس حال وقال کے قرآن و حدیث یا فقہ
سے کہین اور کسی زمانے مین نہین ثابت ہوتا کہ رقص سے عبادت و خدا پرستی مین
کام لیا گیا ہو - بلکہ علما علی العموم اُسکے حرام ہونے کا فتوے دے رہے ہین - مگر
ہماری سمجھ مین نہین آتا کہ اِس فتوے کی بنیاد کیا ہے - قرآن و حدیث سے اسکی
حرمت ثابت نہین ہوتی - اہل حبشہ کا رقص خود حضرت سرور عالم نے ملاحظہ فرمایا
اور خاتون محترم ام المومنین عائشہ صدیقہ کو اپنے پیچھے کھڑا کر کے دکھایا تھا -
یورپ مین ناچنا اعلیٰ درجے کی شریفانہ صحبتون مین مہذب ترین دلچسپی تصور کیا
جاتا ہے - اعلیٰ و ادنیٰ ہر طبقے کے زن و مرد بے تکلف ناچتے ہین - اور رقص کی
تعلیم بچپن سے لازم ہو گئی ہے - خصوصاً لڑکیان اگر ناچنا نہ جانتی ہون تو بالکل
پھوہڑ خیال کی جاتی ہین -

یورپ والون کا عام خیال ہے کہ رقص سے صحت اور اخلاق دونون پر نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے - مگر ہندوستان مین رقص چونکہ بدکار وعصمت فروش عورتون کا پیشہ ہے اس لیے اُس مین دلچسپی چاہے جس قدر زیادہ ہو مگر صحت و اخلاق پر ہرگز اچھا اثر نہین پڑ سکتا -

ہمارے شعرا مین رقص بسمل بہت مشہور ہے - اس سے علی العموم کاری زخم کھانے یا ذبح ہونے کے بعد نیم جان لاش کا تڑپنا مراد لیا جاتا ہے - مگر بعض ظالم و بہائم صفت وحشی قومون مین رقص بسمل کا خوفناک تماشا حیرت ناک بیرحمی وسنگدلی کی مسرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اس طرح کہ رقص بسمل کے شایق کسی جنگل مین مسافرون کی رہگذر پر جاکے جمع ہوتے ہین - اور آگ جلاکے اُسپر ایک لوہے کا توا رکھ دیتے ہین جو خوب گرم ہوکر سرخ ہو جاتا ہے - اُسوقت جو مسافر یا اجنبی شخص مل جاتا ہے اُسکو پکڑ لیتے ہین اور فوراً تلوار سے اُس کا سر کاٹ کر وہ جلتا توا گردن پر رکھ دیتے ہین - توا جم کے بیٹھ جاتا ہے - خون جو جوش مارکے نکلنا چاہتا ہے محتبس ہوکر بند ہو جاتا ہے اور بے سر کی لاش جس کی گردن پر سر کے عوض توا ہوتا ہے گھنٹون دوڑتی کودتی ناچتی اور گرتی پڑتی ہے - جسکو دیکھ کر وہ لوگ قہقہے لگاتے اور بہت ہی خوش ہوتے ہین -

افسوس انسان مین اگر رحم اور خدا کا خوف نہ ہو تو اُس سے زیادہ وحشی و خونخوار کوئی نہین ہو سکتا - درندہ پیٹ بھرنے کے لیے ذی روح مخلوق کی جان لیتا ہے اور وہ بے ضرورت محض تفنن طبع - اور دل بہلانے کے لیے - جانور بھوک کے تقاضے سے کسی جاندار کو مارتا ہے تو وہ سیر وتفریح اور دلچسپی کے لیے جس کا نام شکار رکھ دیا گیا ہے -

گلستان

شیخ سعدی کی کتاب گلستان کو پڑھتے تو سب ہین مگر شاید ہی کسی کو معلوم ہوگا کہ اُس کے نام کا ماخذ و مخرج کیا ہے - اور لوگ یہ سن کر تعجب کرین گے کہ اس نام کا اصلی ماخذ یونانی زبان اور اُس کا ادب ہے -

ولادت حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوا چھ سو برس پیشتر یا یوں کہیے کہ حضرت مسیح سے پہلی صدی کے وسط میں ارض شام کے شہر غدارہ میں ملیاغر نام زبان یونانی کا ایک شاعر و معلم رہتا تھا۔ اس نے اپنے زمانے تک کے یونانی شاعروں اور ادیبوں کے نظم ونثر کلام کا ایک منتخب مجموعہ مرتب کیا جس میں ہر شاعر کی بہترین نظمیں اور ہر ادیب کی افصح و مؤثر و مختصر نثریں جمع کی تھیں۔ ملیاغر نے اس مجموعہ میں یونانی شاعر سافو سے لے کر اپنے عہد تک کے تمام شعرا و ادبا کا منتخب کلام جمع کیا تھا۔ اور آخر میں اپنا بھی بہت سا کلام درج کر دیا تھا۔ اُسکے شروع میں اپنی ایک تمہیدی نظم درج کی جس میں ہر شاعر کو اپنے خیال و مذاق کے مطابق کسی خاص پھول سے تشبیہ دے کر اُسی پھول سے تعبیر کیا۔ اور اسی رعایت سے اُس مجموعے کا نام "پھولوں کا ہار" رکھ دیا۔

ملیاغر کے بعد تھسا لونکا کے فلپ نے اس "پھولوں کے ہار" میں زمانۂ مابعد کے تیرہ[۱۳] اور شاعروں اور انشا پردازوں کے کلام کا انتخاب اضافہ کیا۔ اور اپنے اس نئے مجموعۂ سخن کا نام "انطالوغی" رکھدیا۔ یونانی زبان میں "انطوس" پھول کو کہتے ہیں اور "لوغیہ" کے معنی خرمن کے ہیں۔ لہذا "انطالوغی" کا لغوی ترجمہ "خرمن گل" یا "گلستان" و "گلزار" ہے۔

فلپ کے بعد شہر ہرقلہ کے دیوجیانوس۔ شہر سارڈیس کے اسٹراٹو اور اغاتھیاس نام ایک اور یونانی سخن سنج نے جو اپنے دور کے بڑے نامور اساتذۂ سخن میں تھا بہت سے نئے منتخبات کے اضافے کر کے نئے نئے مجموعے شایع کیے۔ مگر ان سب مجموعوں کا نام وہی "انطالوغی" یعنی گلستان یا خرمن گل رہا۔ جن میں سو یونانی شعرا اور ادیبوں کی ۴۵۰۰ نظمیں اور نثریں درج تھیں۔ اور اب یونانی میں اس قسم کے مجموعوں کا عام نام "انطالوغی" ہوگیا۔ گویا یہ کسی کتاب کا نام نہیں بلکہ ایک فن یا خاص قسم کی کتابوں کا عام نام تھا۔ چند روز بعد یونانی زبان کے تمام مذکورہ مجموعہ ہائے سخن دست برد زمانہ کی نذر ہو گئے۔ فقط "انطالوغی" کا نام رہ گیا۔ جس پر یورپ کی زبانوں نے اپنے لب و لہجہ کے لحاظ سے تصرفات کیے۔ چنانچہ انگریزی میں وہ "انتھالوجی" بن گیا۔ انگریزی میں آج بھی اس قسم کے

بے دلیل خدا کو مانتا ہے اُسی طرح ایک لڑکا کسی زبان کو آغوش مادر مین سیکھ کے بے دلیل اُسکی خوبیون کا قائل ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس بات کی امید رکھنا حماقت ہے کہ جو بچہ دہلی و توابع دہلی مین پیدا ہو کے۔ وہان آغوش مین پل کے اور وہان کی صحبتون مین اُٹھ بیٹھ کے بڑا ہوا ہے لکھنو کی زبان کو پسند کرے گا اور اسی طرح اسکے برعکس یہ خیال کرنا جنون ہے کہ جو لوگ لکھنو اور توابع لکھنؤ مین پیدا ہوے ہین اور وہین کی سوسائٹیون مین اُن کا نشوونما ہوا ہے وہ دہلی کی زبان کو کسی دلیل یا فیصلہ سے مان لین گے۔ مین ہون یا ہمارے دوست مولوی عبدالحق صاحب دونون پر یہی اثر پڑا ہوا ہے۔ اور اُسکا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کی خوبیون کے دلدادہ ہین۔ اور دوسرے اسکول کی زبان پر اعتراض اور نکتہ چینیان کرتے ہین۔ جن سے سوا اپنا دل خوش کر لینے کے کوئی نتیجہ نہین حاصل ہو سکتا۔ مولوی عبدالحق صاحب اطراف میرٹھ مین پیدا ہوے۔ اور علیگڈھ مین تعلیم پائی۔ یہ دونون شہر زبان دہلی کے زیر اثر ہین۔ اس لیے اُنکے کانشنس سے بجز اسکے کہ لکھنؤ کی زبان کو پسند نہ کرین ہم اور کوئی امید بھی نہین کر سکتے۔ بیشک زبان مین لکھنو والون کے تصرفات انکو ناگوار گذرتے ہون گے، مگر اس ناگواری کو اُنھین تھوڑی نفس کشی اختیار کر کے برداشت کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس نزاع مین وہ قاضی نہین بلکہ فریق ہین۔

قابل لحاظ فقط اُن لوگون کا بیان ہو سکتا ہے جو ہون تو لکھنؤ کے ساختہ و پرداختہ مگر زبان دہلی کی تعریف مین رطب اللسان ہون یا خلاف اسکے اُنھون نے دہلی مین نشوونما پایا ہو اور زبان لکھنؤ کی مدح سرائی کرتے ہون۔ مثلاً غالب مرحوم کہ اگرچہ دہلی کے استاد عدیم المثال اور شاعر صاحب کمال تھے مگر لکھنؤ کی حد سے زیادہ مدح خوان تھے اور تسلیم کرتے تھے کہ دہلی کی زبان مٹ گئی۔

یا مرزا رجب علی بیگ صاحب سرور جو اکبر آباد آگرہ مین پیدا ہوے وہین نشوونما پایا۔ ناشئیے ہمتاب ننے کے بعد لکھنؤ مین آئے۔ اور یہان کی معاشرت و زبان اس قدر پسند آئی کہ بآواز بلند مدح خوانی کرنے لگے۔ اور اس کا یہ

انعام ملا کہ وہ لکھنؤ والے خیال کر کے مورد سہام بن گئے۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم باوجودیکہ ثقہ آدمی تھے اور جانتے تھے کہ مرزا رجب علی بیگ صاحب بھی ایک شریف آدمی ہیں اُن سے دست و گریبان ہو گئے اور اُنھیں "لکھنؤ کا شہدا" کہدیا۔ اور آج تک اکثر آپے سے باہر ہو جانیوالے دلدادگان زبان دہلی جب قلم اُٹھاتے ہیں اُنکی یہ سنت ادا کرنے کے لیے مرحوم مرزا صاحب کو دو ایک گالیاں ضرور دے دیا کرتے ہیں۔ اور اس کا خیال نہیں کرتے کہ وہ بیچارے تو خاص اکبر آباد کے رہنے والے اور دہلی کے اسکول زبان کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ تلاش معاش میں لکھنؤ آئے۔ لوگوں نے قدر کی۔ دیگر صاحبان کمال کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُستاد بنا دیا۔ رہا اُنکا رنگِ عبارت تو اُنکے زمانہ تک لکھنؤ ہو یا دہلی سب جگہ کا وہی رنگ تھا جو فارسی کی نثاری سے ماخوذ تھا۔ اُسی رنگ کو اُن دنوں تمام اہل علم لکھنؤ کے ہوں یا دہلی کے پسند کرتے تھے۔ اور اگر انگریزی تعلیم نے ترقی کر کے اُردو کے لیے ترقی کی سڑک نہ بدل دی ہوتی تو آج بھی سب جگہ وہی رنگ ہوتا۔

اس رنگ کو لکھنؤ کا رنگ بتانا ہی غلطی ہے۔ اس لیے کہ وہی نثر اُردو کا وہ قدیم رنگ تھا جو دہلی سے لکھنؤ میں آیا۔

بہرحال ان بحثوں میں پڑنے کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ اب سب جگہ اُردو کا وہی رنگ ہے جس کا آغاز انگریزی اثر اور انگریزوں کی رہبری میں میر امن سے ہوا تھا۔ غالب نے اُس میں اور سادگی پیدا کی۔ آزاد مرحوم نے مشرقی و مغربی رنگ کو ملا کے ایک نیا رنگ پیدا کیا۔ اور چند روز میں سارے ہندوستان کی نثر ایک ہی وضع کی ہو کے ایک سطح پر آ گئی۔

العادۃ کالطبیعۃ الثانیہ

(ماخوذ از ایڈیسن)

عوام و خواص سب میں ضرب المثل ہے کہ عادت فطرتِ ثانیہ ہے۔ یعنی جو چیزیں قدرت نے انسان کی سرشت و جبلت میں داخل کر دی ہیں اُنھیں کے مثل وہ باتیں

بھی ہوتی ہین جن کی عادت پڑ گئی ہو - اس کے صحیح ہونے مین تو کوئی شک وشبہ نہین - لیکن ہمین اکثر یہ نظر آتا ہے کہ عادت سرشت پر بھی غالب آجاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا وہی عادت اصلی فطرت وجبلت ہے - کہتے ہین کہ کوئی شخص ایک ایسے مقام پر رہا کرتا تھا جہان ہروقت گھنٹے کی آواز سُنی جاتی تھی - اور اُس کا معمول تھا کہ جب گھنٹہ بجتا وہ بھی گھنٹے کی آواز کے ساتھ باواز بلند کہتا جاتا ایک - دو - تین - چار - وغیرہ وغیرہ - چند روز بعد اتفاقاً گھڑی بگڑ گئی - اُس کا بجنا موقوف ہوگیا - لیکن جہان گھنٹہ بجنے کا وقت آیا اُس کی زبان پر خود بخود الفاظ ایک - دو - تین - چار جاری ہوجاتے - اس واقعے کے تسلیم کرنے مین شاید بہت سے لوگون کو عذر ہو - لیکن اس سے وہ انکار نہین کرسکتے کہ عادت کا انسان کی طبیعت پر اثر پڑتا ہے - اور اُسکے اثر سے اُسکے اخلاق وعادات سب بدل جاتے ہین -

سچ یہ ہے کہ اگر ہم عادت کی قوت اور اُس کے اثرون سے فائدہ اُٹھانا چاہین تو بہت سے بکارآمد نتائج حاصل کرسکتے ہیں - سب جانتے ہین کہ وہی چیزین جو ہمین پہلے ناگوار معلوم ہوتی تھین عادت پڑ جانے کے بعد نہایت خوشگوار ہوجاتی ہین - اس مین اچھے یا بُرے کی تفریق نہین - جو شخص جوے یا کسی بداخلاقی کے مشغلے مین منہمک ہوتا ہے ابتداءً اُسے ان باتون مین اتنا لطف نہین آتا تھا اور نہ اُن کی طرف ایسی رغبت تھی - مگر بُری صحبتون مین پڑ کے اور بدکار لوگون مین اُٹھ بیٹھ کے اُسے ان باتون کی عادت پڑ گئی - اور اب اس قدر مزہ آنے لگا کہ بغیر اُنکے دم بھر نہین رہا جاتا - عزیز واقارب بُرا کہتے ہین - اپنے پرائے لعنت ملامت کرتے ہین - مذہب عذاب آخرت سے ڈراتا ہے - قانون دنیا ہی مین سزا دیتا ہے - مگر وہ اپنی حرکتون سے باز نہین آتا - اُسے نظر آنے لگتا ہے کہ اُس کی زندگی کا مقصدِ اصلی یہی کام ہین - انھین کامون کے لیے دنیا مین آیا ہے - اور اس قابل ہی نہین رہا کہ دوسری قسم کی زندگی بسر کرے -

تنبا کو کھانے - حقہ پینے - ناس لینے - یا شراب پینے کی عادتین بھی اسی طرح

طبیعت ثانیہ بنجاتی ہین - اور یہ حالت ہو جاتی ہے کہ بغیر اُنکے ایک گھڑی بھی چین نہین پڑتا - انھین چیزون پر موقوف نہین - تم اپنی غذاؤن - اپنے شربتون - اپنے کپڑون - اپنی خوشبوؤن - اپنی مسرتون - اپنے غمون - اپنی شاعری اپنی موسیقی ہر چیز پر عادت کو حاکم و متصرف پاؤگے - یہان تک کہ تمھارا معشوق اور تمھارا دوست بھی تمھاری عادات کا لباس پہنے ہو گا - اور اُنھیں اخلاق - اُنھین کرشمون - اُنھین غمزون - اور حُسن و جمال کے اُنھین نمونون اور زیورون سے آراستہ نظر آئے گا جو تمھاری عادت کے بنائے اور تیار کیے ہوے ہین -

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ عادت کے ان تصرفات سے ہم فائدہ کیونکر اُٹھا سکتے ہین - جس طرح بُوے نشے - اور بدکاری کی عادت پڑتی ہے اُسی طرح اگر تم علوم و فنون یا کسی چیز کے مطالعے کا شوق کرو اور اُسکی عادت ڈالو تو کیا اُس کی عادت نہ پڑجائے گی ؟ ضرور پڑیگی - اسی پر منحصر نہین جس کام مین محنت کی جائے اور جس کی مزاولت کی جائے عادت پڑ ہی جاتی ہے - اور چند روز کے بعد اُسی مین لطف آنے اور مزہ ملنے لگتا ہے -

وہی کام جو پہلے بار معلوم ہوتا ہے اور اُسکے انجام دینے مین تکلیف ہوتی ہے عادت ڈالنے کے بعد خوشگوار اور پُرلطف ہو جاتا ہے - مغربی فیلسوف فرانسس بیکن اپنی کتاب فلسفۂ قدرت مین کہتا ہے "ہمین اُسی چیز مین زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے جو ابتدائً ہمارے لیے بار اور دشوار تھی اور ہم اُس سے نفرت کرتے تھے" اس کی مثال وہ دیتا ہے کہ شراب - کافی - چاء - پہلے ہمین بدمزہ معلوم ہوتی تھین - مگر عادت پڑ جانے کے بعد یہ حالت ہو جاتی ہے کہ بغیر اُنکے قرار نہین آتا - اور زندگی بھر نہین چھوٹ سکتی ہین -

ہمارے دل و دماغ کی یہی حالت ہے کہ کسی خاص کام یا محنت کی عادت ڈالنے سے اسی قدر نہین ہوتا کہ اُسکی دشواری کم ہو جاتی ہو بلکہ اُس کی جانب ایک طرح کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور دل مین شوق نمایان ہوتا ہے - ایک بڑے عالم بے ہمتا اور فاضل گران پایہ کا مقولہ تھا کہ پہلے مجھے مصنفین سلف کی کی کتابون مین کسی قسم کا لطف نہ حاصل ہوتا تھا مگر ایک مجبوری اور ضرورت سے

چند روز تک مجھے یہ دشوار و ناگوار کام کرنا پڑا - اب نہایت حیرت سے دیکھتا ہون کہ ان کتابون مین مجھے غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے - اور جب تک اُنکا مطالعہ نہین کر لیتا ہون دل کو قرار نہین آتا - بہر حال ان باتون سے یہ نتیجہ ضرور حاصل ہوتا ہے کہ عادت ڈالنے سے ناگوار اور بے مزہ کام ہم پر آسان ہی نہین ہو جاتے بلکہ خوشگوار اور با مزہ معلوم ہونے لگتے ہین -

انسانی فطرت کی اس خصوصیت پر اگر ہم زیادہ غور کرین تو اس سے بڑے بڑے فائدے اُٹھا سکتے ہین اور بہت سے اچھے اور نتیجہ بخش اصول ہاتھ آ سکتے ہین - اس سے اخذ کیا ہوا سب سے پہلا اور نہایت ہی اہم اصول یہ ہے کہ "جو کوئی جس کام مین مصروف ہو گا اور محنت کریگا اُس مین محروم و ناکام نہین رہ سکتا" ممکن ہے کہ ابتدا مین وہ اُسے بہت دشوار - نامناسب اور اپنے مذاق و رجحان کے خلاف نظر آتا ہو لیکن چند روز کی محنت و مصروفیت مین مذاق کے موافق ہی نہین نظر آنے لگے گا بلکہ اچھا اور خوشگوار معلوم ہو گا -

دوسرے عادت کے ان معجز نما اثرون سے فائدہ اُٹھا کے مین ہر شخص کو وہی نصیحت کرنا چاہتا ہون جو فیثا غورس نے اپنے شاگردون کو کی تھی - اُس نے اُن سے کہا "ہمیشہ وہ پیشہ اختیار کرو جو عمدہ اور اعلیٰ نظر آتا ہو - عادت ڈالنے سے اگر مشکل بھی ہو گا تو آسان ہو جائے گا - اور آخر مین تم خود اُسے پسند کرنے لگو گے - جن لوگون کو اس بات کا موقع حاصل ہے کہ اپنے لیے سوچ سمجھ کے کوئی پیشہ اختیار کرین وہ اگر کوئی سودمند اور پسندیدہ عام مشغلۂ معاش نہ اختیار کرین تو ہرگز قابل معافی نہین ہین - انتخاب صورت کسب معاش کے وقت ہمین سب سے زیادہ اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ کس کام مین ہم زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے ہین - ابتدائی حالت مین دلی رجحان کے ہونے یا نہ ہونے کی مطلق پروا نہ کرنی چاہیے - کیونکہ عادت پڑ جانے کے بعد خود بخود طبیعت عادی ہو جائے گی اور آخرکار اس مین لذت ملنے لگے گی -

تیسری بہت بڑی بات معاد اور زندگی مابعد الموت کا خیال ہے - سخت سے سخت دنیا پرست جو مذہب کی دشواریون اور قیدون کو نہ برداشت کر سکتے ہو

اور بالکل بندۂ ہوا و ہوس ہو اُسے بھی عالمِ آخرت کا کچھ نہ کچھ خیال ضرور ہوتا ہے۔ اور نیکو کاروں کی طرح وہ بھی باوجود اپنی بدکاریوں کے اسی بات کا آرزومند ہوتا ہے کہ اُس عالمِ ابدی و سرمدی میں فلاح حاصل ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے گناہگار کو بھی اُن فرائض کے ادا کرنے میں جو مذہب کے بتائے ہوئے ہیں مسرت ہوتی ہے اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ مگر باوجود اسکے اُن لوگوں کو مذہب کے بتائے ہوئے اخلاقِ حسنہ خدا پرستی کے فرائض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس قدر بار و دشوار معلوم ہوتے ہیں کہ پابندی نہیں کرسکتے۔ اس کی وجہ فقط یہ ہے کہ انھوں نے اُن دینی باتوں کی عادت نہیں ڈالی۔ لیکن اگر ہم ان باتوں کی عادت ڈالیں اور چند روز کی محنت میں اُنکو گوارا بنالیں تو پھر ہمیں عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ ہی میں لذت حاصل ہونے لگے۔ اور وہ اطمینان قلب اور فلاح دارین حاصل ہو جو خدا ہر دیندار کو نصیب کرے۔

چوتھے اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ ہم نے جب ایک اسلوبِ زندگی اختیار کر لیا تو پھر ہمیں اس پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ دلچسپی اور تفریح و تفرج کے لیے ہم جن باتوں کو اختیار کریں وہ نہایت ہی لطیف۔ پاکیزہ۔ بے عیب اور دل کو ظلمتِ گناہ سے صاف کرنے والی ہوں۔ اگر اسکی احتیاط نہ کی گئی اور جو بُری باتیں ہماری دلچسپیوں میں داخل ہو گئیں تو اُن کے اثر سے رفتہ رفتہ آئینۂ دل زنگ آلود ہو جائے گا۔ صفائی و پاکیزگی مٹ جائے گی۔ سچی مسرت سے دل خالی ہوگا۔ اور ادنیٰ درجے کے ذلیل۔ سفلہ۔ اور بُرے کاموں میں لطف آنے لگے گا۔

آخر میں اس نتیجے کو پہونچتا ہوں کہ انسان چند روز تک جو کام کرتا ہے عام ازیں کہ وہ بُرا ہو یا بھلا اُس میں اسکو ایک گونہ خوشی ضرور حاصل ہونے لگتی ہے۔ لہذا ہر معمولی مسرت کو دیکھ کے اُسے نفس پروری کے پھندے میں نہ پڑ جانا چاہیے۔ دین و دنیا کی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے اُس کے لیے ضروری ہے کہ اس چند روزہ زندگی میں ایسی پاکیزہ اور نیک عادتیں اختیار کرے جو اُس عالم میں بھی اُسے فائدہ پہونچائیں اور زندگیِ اُخروی میں بھی کام آئیں۔

جنۃ الفردوس اصل پوچھو تو کامل اور دائمی مسرت کا نام ہے جو ہمین اپنے مذاق کے مطابق دنیوی شکلون مین دکھائی اور بتائی گئی ہین۔ ان مسرتون کے مستحق ہم اُسی وقت ہو سکتے ہین اور اُسی وقت وہ ہمارے لیے موزون و مناسب ہو سکتی ہین جب ہم اپنے آپ کو اُنکے قابل بنائین۔ اس عالم مین تم سچائی اور نیکوکاری کے عادی ہو اور اپنی زندگی اُس اعلیٰ مقصد کے حاصل کرنے مین صرف کرو۔ دوسرے عالم مین بھی اچھے رہو گے۔ اور وہان کی سچی اور پاکیزہ لذتون کے اہل ہو جاؤ گے۔ اصل یہ ہے کہ اُس ابدی روحانی مسرت کا بیج اس امتحان گاہ فانی کی زمین مین بویا جاتا ہے۔ اور گو تخم ریزی یہان ہوتی ہے مگر اُکھوا اُس دوسرے عالم مین نکلتا اور ایک خوشنما فرحت بخش پودھا بن کے پھولتا پھلتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جنت کی نسبت یہ کہنا کہ ہمین اپنے اعمال نیک کے صلے مین ملتی ہے فقط کہنے کی بات ہے۔ اصل مین پاکبازی اور شریفانہ زندگی کا قدرتی نتیجہ جنت ہے۔

برخلاف اسکے وہ طبیعتین جو شہوت پرستی۔ خواہشات نفسانی۔ جھوٹ۔ کینہ پروری اور عداوت و خصومت اور اسی طرح کی اور بہت سی باتون کی عادی ہو گئی ہین اُنھین یقینی طور پر رنج و الم اور ندامت و افسوس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اُن کی یہ تکلیف دنیا ہی سے شروع ہو جاتی ہے اور اُس کے بعد جب انکی روحین اس جسم خاکی فانی سے علٰحدہ ہو جاتی ہیں تو اُس وقت بھی اُنھین مسرت نہین نصیب ہو سکتی۔ اور گو وہ اُس عالم مین نہ ہون گے جہان اُنھون نے بداخلاقی سے اپنی زندگی خراب کی اور معاصی و جرائم کے مرتکب رہے تھے مگر اُسی دوسرے عالم مین اُنکے اعمال و افعال کا صدمہ و الم ہر وقت پیش نظر رہے گا۔ اور اِن باتون سے اُنکو اس قدر تکلیف ہو گی اور ایسے پریشان رہین گے کہ اُن کا وہ عالم آخرت اشد ترین دوزخ اور عذاب الٰہی کا مرکز ہو گا۔

یہ اہل مذہب کے مذاق پر نہین کہا جاتا جو جنت و دوزخ کو مستقل مقامات ثواب و عقاب مانتے ہین۔ مگر وہ لوگ جو اس کے قائل نہین وہ بھی اس دوسرے عالم کو اسی حیثیت سے مزرعۃ الآخرۃ تسلیم کرتے ہین کہ وہان اپنے دنیوی افعال

خیر کی بے اندازہ مسرت اور بدکاری کی ناقابل برداشت تکلیف ہوگی۔ اور اسی کو دنیا والون کے جنت و دوزخ بتاتے ہین۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ جنت و دوزخ کا خیال فطرت کے مطابق ہے۔ اور بڑے بڑے محققون اور مبصرون نے بخوبی غور کرکے ان دونون عالمون کا پتہ لگا لیا ہے۔ چنانچہ اُن کا دعوے ہے کہ ہماری عادتین اور خصلتین ہی ہمارے لیے جنت و دوزخ کو پیدا کر دیا کرتی ہین۔

خط پیکانی

اس دور کی ترقیون مین سب سے زیادہ حیرت انگیز اُن قدیم کتبون کو پڑھ لینا ہے جو آج تک نہین پڑھے جا سکے تھے۔ اور پھر اُن کے ذریعے سے اہم حصۂ تاریخ کا پتہ لگا لینا ہے۔ یہ تھوڑی حیرت کی بات نہین ہے کہ مسلمان ایران و عراق اور شام مصر پر تیرہ صدیون تک حکمران رہے مگر اس جانب توجہ نہ کی کہ اگلی دنیا کے کتبون پر غور کرتے اور پتہ لگاتے کہ اُن مین کیا لکھا ہے۔ اور جس قدر زیادہ زمانہ گذرتا جاتا تھا اُسی قدر انکا پڑھنا دشوار ہوتا جاتا تھا۔ یہان تک کہ کمال مایوسی کے ساتھ یقین کر لیا گیا کہ مردہ اور فنا شدہ زبانون کی ان مجہول و نامعلوم تحریرون کا مطلب سمجھنا غیر ممکن ہے۔

مگر نہایت ہی صحیح ہے کہ "من طلب وجد" جس نے ڈھونڈھا پایا۔ اور حضرت مسیح نے بجا ارشاد فرمایا تھا کہ "جو دروازہ کھٹکھٹائے گا اُسکے لیے دروازہ کھلجائیگا" آج کل کے محققون نے اس بارہ خاص مین کوشش کی۔ ان قدیم کتبون پر غور و خوض کرنے مین عمرین صرف کین اور آخر اس طلسم کو توڑ ہی کے دم لیا جو کسی کے توڑے نہ ٹوٹ سکا تھا۔ بلکہ کسی کو اُسکی طرف توجہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی۔

قدیم نامعلوم خطون مین سب سے زیادہ اہم تو اہل مصر کا "خط تصویر" ہے۔ جس کا حال ہم آیندہ لکھین گے۔ مگر اسکے بعد سب سے زیادہ اہمیت ایران و عراق کے "خط پیکانی" کو ہے جسکے بہت سے کتبے جا بجا اشوریا۔ بابل اور فارس

انتخابات سخن کو "انتھالوجی" کہتے ہین جسکے معنی وہی خرمن گل یا گلستان کے ہین۔

مگر ولادت سرور عالم کے تقریبًا چارسو برس بعد یعنی دسوین صدی عیسوی مین قسطنطین قفالاس کی جستجو سے پھر بعد ازان نوین صدی ولادت محمدی یا چودھوین صدی ولادت عیسوی مین مقسیموس فلانودیس کی جستجو سے فنا شدہ یونانی "انتھالوجی" یعنی قدیم گلستان یونان کے چند اجزا دستیاب ہوگئے جو بعد والون کی کوشش سے دنیا مین محفوظ رہ گئے۔

مقسیموس کا ترتیب دیا ہوا مجموعہ بسلسلۂ لسکریس ایڈیشن سنہ ۹۲۴ محمدی (سنہ ۱۴۹۴ء) مین شہر فلارنس مین طبع ہوا۔ اسکے بعد اُسکے اور کئی ایک عمدہ ایڈیشن ترجمے اور توضیحات کے ساتھ شایع ہوے۔ لوگ اسی مقسیموس کے نسخے کے دلدادہ ہو رہے تھے کہ یکایک سلماسیوس نام ایک شخص نے سنہ ۱۰۳۵ محمدی (سنہ ۱۶۰۶ء) مین قسطنطین قفالاس کے گم شدہ مجموعے کو ہیڈل برگ کے کتب خانے سے برآمد کرکے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ مجموعہ زیادہ مکمل تھا اور اُس مین مقابل مقسیموس کے مجموعے کے زیادہ استیعاب تھا۔ یہ نسخہ سی سالہ جنگ کے زمانے مین روما الکبریٰ مین لایا گیا۔ وہان سے پیرس مین گیا۔ اور آخر سنہ ۱۲۴۵ محمدی (سنہ ۱۸۱۶ء) مین پھر ہیڈل برگ مین بھیج دیا گیا۔

اس یونانی گلستان (انتھالوجی) کی دیکھا دیکھی رومیون نے اپنی لاطینی زبان مین بھی شعر و سخن کے کئی مجموعے منتخب کرکے مدون کیے۔ جن کے مولف کملاے روم سقالیغر۔ پتھوس۔ بورمان۔ اور چند اور سخن سنجان لاطینی تھے بورمان کا مجموعہ زیادہ ضخیم تھا جو سنہ ۱۱۸۹ محمدی اور سنہ ۱۲۰۳ محمدی (سنہ ۱۷۵۹ء و سنہ ۱۷۷۳ء) مین امسٹرڈم سے شایع ہوا۔ پھر اُسکو کسی قدر ترقی دے کے زیادہ خوبی کے ساتھ مے یر نام ایک یورپین فاضل نے سنہ ۱۲۶۴ محمدی (سنہ ۱۸۳۵ء) مین اور اُسکے بعد اُس سے بھی زیادہ خوبی و خوش اسلوبی سے اسکندر ریس نام ایک عالم لاطینی نے سنہ ۱۲۹۸ محمدی (سنہ ۱۸۶۹ء) مین شایع کیا۔

عربی زبان اس قسم کے گلستانون سے بمقابل یونانی و لاطینی کے زیادہ مالامال ہے۔ اُس مین سب سے پہلے ابو تمام

حبیب بن اوس المتوفی ۲۴۲ھ محمدی (۸۴۵ء) نے پچھے بعد از ان

ء یہ دونون ادیب اسلام کی پہلی صدیون کے نامور ادیب اور تاریخی روایات عرب کے

عالم بے بدل تھے - ابو تمام کا نام حبیب بن اوس تھا وہ بنی طے مین سے تھا - ادب شاعری

مین اُستاد زمانہ تھا - اسکی کتاب "حماسہ" نہایت مشہور و مقبول ہے اور آج تک ادب عربی کے

نصاب مین داخل ہے - اُس نے اپنے ایک مجموعۂ اشعار کا نام "فحول الشعرا" رکھا - جسکے

معنی شعرائے نامور کے سمجھنے چاہیے - اس مین جاہلیین (جاہلیت کے شعرا) مخضرمین (وہ شاعر

جنھون نے جاہلیت و اسلام دونون زمانون کو دیکھا) اور اسلامیین (شعرائے عہد اولین

اسلام) کا نہایت ہی عمدہ انتخاب کیا ہے - اُسکی ایک اور کتاب "کتاب الاختیارات" ہے اس مین

محض شعرائے سلف کے مقبول و پسندیدہ اشعار جمع کیے ہین - اُسکو اتنے اشعار زبانی یاد تھے

کہ اور کسی کی نسبت نہین سنے گئے - کہتے ہین کہ قصیدون - غزلون - اور متفرق اشعار کے سوا

اُسکو صرف چودہ ہزار عربی مثنویان برزبان یاد تھین - اُس عہد کے ایک رئیس اور والی ملک

ابودلف عجلی کی مدح مین اُس نے قصیدہ پڑھا - ابودلف نے پچاس ہزار درہم صلہ مین

دیے - اور کہا "خدا کی قسم یہ ادنیٰ رقم اس قصیدہ کے سامنے حقیر و ہیچ ہے - اس لیے کہ آپ

کی اس نظم کو بجز اُس مرثیے کے جو آپ نے محمد بن حمید طوسی کے غم مین کہا ہے اور کوئی نظم نہین

پہونچ سکتی" ابو تمام نے کہا "اُس کے غم مین تو مین نے کئی مرثیے کہے ہین اُن مین سے کس

مرثیے کو آپ نے پسند فرمایا؟" ابودلف نے اُس مرثیے کا مطلع پڑھا اور کہا "کاش مین

مرگیا ہوتا اور یہ مرثیہ آپ نے میرے مرنے پر کہا ہوتا - اس لیے کہ جس شخص کے غم مین یہ مرثیہ

ہو وہ مر نہین سکتا - وہ ابد الآباد تک زندہ رہے گا"

لوگ کہتے ہین کہ بنی طے مین تین شخص ایسے پیدا ہوے کہ ساری دنیا مین اُنکا جواب نہین ہوا

حاتم طائی سخاوت مین - داؤد طائی زہد و تقویٰ مین اور ابو تمام طائی شعر و سخن مین -

آخر عمر مین وہ شہر موصل کی ڈاک کا مہتمم مقرر ہوگیا تھا - ۱۹۰؁ محمدی (۸۰۶ء) مین مضافات

دمشق کے قریۂ جاسم مین پیدا ہوا تھا - گندم گون، کشیدہ قامت، فصیح البیان اور شیرین زبان

تھا - مگر بات اس قدر جلدی کرتا تھا کہ بعض اوقات سمجھنا دشوار ہو جاتا - ۲۴۲؁ محمدی (۸۴۵ء)

مین چالیس ہی سال کی عمر تھی کہ دنیا سے رخصت ہوگیا - ابونہشل بن حمید طوسی نے اُسکی قبر پر ایک

مقبرہ بنوادیا جو مدت تک تمام مشاہیر کا مقبرہ کہلاتا تھا -

ابو الفرج اصفہانی المتوفی سنہ ۳۹۵ محمدی (سنہ ۹۶۶ء) نے اُن تمام عربی نغموں اور گیتون کے منتخب مجموعے مرتب کیے جو جاہلیت عرب مین یعنی حضرت سرورِ عالم سے پہلے مروج تھے - انکی مجموعی ضخامت دس جلدون کو پہونچ گئی - ابو الفرج اصفہانی نے .... اسکے علاوہ اپنی مشہور کتاب اغانی مین ان تمام گیتون اور نغمون کو بھی مرتب کر کے شایع کر دیا جو علی العموم عربون مین مروج و متداول تھے - اس ضخیم عربی کتاب کو یورپ مین کوسے گارٹن نے سنہ ۱۲۶۹ محمدی (سنہ ۱۸۴۰ء) مین نہایت خوبی و تحقیق سے چھاپ کے شایع کر دیا ہے - پھر اُس کی نقل دوبارہ مصر مین چھپی اور اب دُنیا کے تمام مشہور کتب خانون مین موجود ہے -

ان کتابون کے علاوہ عربی مین اور بہت سے اسی قسم کے مجموعے یعنی گلدستہ مین

عہ ابو الفرج علی بن حسین اُموی اصفہانی - یہ ادیب خاص خلفاے بنی اُمیہ دمشق کی نسل سے اور اُنکے آخری خلیفہ مروان بن محمد کا پرپوتا تھا - مگر باوجود بنی اُمیہ مین ہونے کے اسکا شمار شیعیان علی مین کیا گیا ہے - اُسکی کتاب اغانی جو اکیس جلدون مین ہے ادب و حالات عرب کی ایک ایسی عدیم المثال کتاب ہے کہ باتفاق علماے سلف اپنا جواب نہین رکھتی - صاحب علم فرمان رواے اسپین صاحب بن عباد کے ہمراہ سفر و حضر دورے مین تین سو اونٹون پر اُس کا کتب خانہ رہا کرتا تھا - اغانی تصنیف ہو کے اُسکے پاس پہونچی تو کہنے لگا "بس اب اتنے اونٹون کے رکھنے کی ضرورت نہین - اکیلی یہی کتاب اغانی کافی ہے" اسپین کے خلیفۂ اُموی حکم نے جو علم کا بڑا مربی تھا اس کتاب اور مصنف کی بڑی قدر کی - ہزارون دینار اُس کے پاس مشرق مین بھیجے - اور اُس کے کہنے سے اُس مصنف نے بنی امیہ کی تاریخ اُن کے خاندانون - نسبون - اور ہر قسم کے حالات کو - اور انکی شان مین نظمون اور قصیدون کو جمع کیا تھا - انکے علاوہ اور بہت سی کتابین تھین جو آج موجود ہوتین تو حالات عرب اور اُس عہد کی ترقیون کا کوئی ادنیٰ کرشمہ بھی ہماری نظر سے مخفی نہ رہ جاتا -

مگر وہ زندگی بھر وزیر مہلبی کی ذات سے وابستہ رہا - اُس کی شان مین قصیدے کہتا اور اُسی کی قدردانی و فیاضی پر بسر کرتا تھا - سنہ ۳۲۶ محمدی (سنہ ۸۹۷ء) مین پیدا ہوا تھا اور سنہ ۳۵۶ محمدی (سنہ ۹۶۶ء) مین خاص بغداد مین وفات پائی -

ہین جو عموماً پسند کی جاتی ہین مگر اُن مین سب سے بہتر اور نہایت مکمل وہ مجموعہ انتخاب ہے جس کو ثعالبی نے مرتب کر کے "یتیمۃ الدہر" کے نام سے شایع کیا ہو ثعالبی کی وفات کے بعد اور لوگون نے اُس کو اور بڑھایا۔ اور زیادہ مکمل کیا۔ جو آج تک موجود اور مقبول و مشہور ہے۔

لیکن عربون نے انتھالوجی (فن گلستان) مین کتابین تو لکھین مگر اُسکے یونانی نام کو نہین لیا، بلکہ ہر مؤلف نے اپنی کتاب کا ایک جداگانہ نام رکھ دیا۔

ع۔۵ ثعالبی کا پورا نام ابو منصور عبد الملک بن محمد بن اسمٰعیل ثعالبی تھا۔ اپنے عہد مین علم و ادب کے اُستاد بے ہمتا اور نظم و نثر مین مرجع عالم تھے۔ ان کے سیرت نگار اُنھین اپنے زمانے کے تمام مصنفون کا سردار اور سارے مؤلفین کا امام بتاتے ہین۔ زندگی ہی مین اُن کا نام ہر جگہ ادب و شعر مین ضرب المثل ہو گیا تھا۔ اور اُن کی زیارت کے شوق مین دُور دُور سے اونٹون کے قافلے برابر آتے رہتے تھے۔ اُن کے دیوان یکایک دنیا مین شایع ہوے تو تمام لوگون کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے افق مشرق سے ماہتاب اور تارون نے طلوع کیا ہے۔

ان کی کتابون مین سب سے زیادہ مشہور و مقبول "یتیمۃ الدہر" فی محاسن اہل العصر ہے۔ جس مین تمام شعراے عرب کا منتخب کلام جمع کر دیا ہے۔ یہ اس فن یعنی فن گلستان کی تمام کتابون سے بڑی۔ اچھی۔ اور بہت حاوی ہے اسکی تعریف مین ابو الفتوح نصر اللہ اسکندری نے جو ایک نازک خیال شاعر عرب تھا اور بہت مشہور تھا یہ دو شعر کہے ہین۔

ابیات اشعار الیتیمہ ابکار افکار قدیمہ

یتیمہ کے اشعار قدما کے ابکار افکار یعنی اُنکی طبعزاد دوشیزائین ہین

ماتو و عاشت بعدہم فلذاک سمیت الیتیمہ

قدماے سلف مر گئے اور وہ اُنکے بعد زندہ رہین اس سبب سے اُن کا نام یتیمہ پڑ گیا۔

ثعالبی کی اور بھی کتابین ہین جن سے اُن کی وسعت نظر کا پتہ لگتا ہے۔ ۳۵۰؁ محمدی (۹۶۱؁ع) پیدا ہوے اور ۴۲۹؁ محمدی (۱۰۳۸؁ع) مین سفر آخرت کیا۔ اُنکو ثعالبی اس سلیے کہتے ہین کہ ثعلب لومڑی کو کہتے ہین اور اُن کا اصلی پیشہ یہ تھا کہ لومڑیون کی کھالون کو بناتے اور درست کرتے اور پھر اُنکو سیتے تھے۔

عربون کے اثر اور اُنکی علمی تعلیم سے فارسی۔ ترکی۔ ہندوستانی اور دیگر السنۂ مشرق مین بھی اس قسم کی صدہا کتابین تصنیف ہوگئین۔ فارسی مین جتنے شعرا کے تذکرے ہین اُن مین زیادہ تر مقصود شاعرون کے حالات نہین بلکہ اُنکے کلام کا انتخاب ہوتا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو انتھالوجی یعنی فن گلستان کی کتابین ہین۔ سعدی نے اگرچہ دوسرون کے کلام یا دیگر شعرا کی نظمون کو نہین جمع کیا۔ مگر درحقیقت اُنکی کتابین مختلف واقعات عالم۔ تجربون۔ نصیحتون۔ اور اگلے کارنامون کا انتخاب ہین جو ہر اخلاقی اصول پر مرتب کیے گئے ہین۔ لہذا صحیح معنون مین اُنکی دونون کتابون گلستان اور بوستان پر "انتھالوجی" "خرمن گل" یا "گلستان" کے الفاظ صادق آتے ہین۔ اور یقیناً اُسی خیال سے اور اس فن کی حقیقت و تاریخ کو معلوم کر کے اُنھون نے یہ دونون نام اختیار کیے ہین جو اُنکو براہ راست تو نہین تو بواسطہ یونانی سے ملے ہین۔ فارسی مین کلام شعرا کو پھول سے تعبیر کرنے کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ اُردو مین مجموعۂ اشعار کا عام نام "گلدرہ" یا "گلدستہ" مشہور ہوگیا ہے۔ فارسی مین "گلستان مسرت" کے نام سے اس فن کی ایک اعلیٰ درجے کی مکمل کتاب مصطفائی مطبع نے لکھنؤ سے شایع کی تھی جو اب دستیاب نہین ہوتی۔

اُردو مین بھی اس فن نے بہت ترقی کی۔ جتنے گلدستے نکل رہے تھے یا اب نکلتے ہین سب اسی فن کی کتابین "خرمن گل" یا "گلستان" ہین مگر اُن کے علاوہ اور بھی بہت سے مجموعہ ہاے اشعار مختلف چمنون سے منتخب کیے گئے ہین۔ بعض مین عوام کے مذاق کی غزلین جمع کی گئی ہین بعض مین گانے کی غزلین اکٹھا کر دی گئی ہین۔ دو چار ایسے بھی ہین جن مین اچھا اور مقبول کلام چھانٹ لیا گیا ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ابھی تک اُردو مین کوئی ایسا مستند و مقبول عام انتخاب نہین شایع ہوا جو یونانی و عربی گلستانون کا جواب ہو سکے۔

مگر چینی زبان مین "نظمون کی کتاب" کے نام سے کنفیوشیس کی مرتب کی ہوئی ایک گلستان موجود ہے۔ جو ادب مشرق کا ایک قدیم ترین اور سب سے پہلا مجموعۂ انتخاب ہے۔ اس لیے کہ کنفیوشیس حضور سرور عالم سے تقریباً بارہ سو برس پیشتر تھا۔ لہذا اُس کی گلستان کی نسبت سمجھنا چاہیے کہ آج سے ڈھائی ہزار

سال پیشتر کی لکھی ہوئی ہے جبکہ بخت نصر ارض فلسطین اور بیت المقدس کو پامال اور بنی اسرائیل کو جلا وطن کرنے کے لیے اسیر کر رہا تھا۔ اہل چین اپنی اس قدیم گلستان کو ایک الہامی دآسمانی کتاب خیال کرتے ہیں اور اس کا بڑا ادب کرتے ہیں۔

افسوس کہ سنسکرت میں سب علم ہیں مگر تاریخ کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں کسی قدیم انتھالوجی (گلستان) کا بھی پتہ نہیں لگا۔

تاج

تاج کو بعض لوگ سر کا ایک زیور بتاتے ہیں۔ مگر اصل میں یہ زیور نہیں بلکہ ایک زیورنما مرصع و مکلل ٹوپی کا نام ہے جو امتیاز کے لیے پہنی جاتی تھی۔ ابتداءً فقط بادشاہوں کے ساتھ مخصوص تھی اور انکے سوا کوئی بھی اسکو نہ پہن سکتا تھا لیکن بعد کے زمانے میں بادشاہوں نے اپنی فیاضیوں سے شاہزادوں۔ امیروں۔ اور معزز و ممتاز لوگوں کو بھی حسب حیثیت تاج عطا کرنا شروع کر دیے۔ اس کا پتہ لگانا غیر ممکن ہے کہ تاج کا پہلا موجد کون تھا یا پہلے پہل کس قوم سے اس کا آغاز ہوا۔ ہر قوم اپنی تاریخ میں اپنے کسی قدیم بادشاہ کو اس کا موجد بتاتی ہے۔ ہندوؤں میں ہم راماین اور مہابھارت کے زمانوں میں بھی مکٹ (تاج) کا رواج پاتے ہیں۔ مگر توراۃ کی تاریخ سے چونکہ قدیم ترین تمدن اشوریا یعنی فرمان روایان نینوا کا ثابت ہوتا ہے اس وجہ سے مورخین نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ تاج کی ایجاد سب سے پہلے وہاں کے بادشاہوں سے ہوئی۔

علامہ مسعودی مروج الذہب میں کہتے ہیں "دنیا میں سب سے پہلے جسنے تاج پہنا وہ سریانی (یعنی اشوریا کا) بادشاہ سوسان تھا۔ اس نے پہلے پہل تاج کو ایجاد کیا۔ پھر مسعودی ہی کے مطابق ایران والے تاج کا موجد اور پہلا تاجدار کیومرث کو بتاتے ہیں۔

انسان ابتداءً پتوں سے ستر پوشی کرتا تھا۔ اُس وقت اور اُسکے بعد بھی یعنی کپڑے اور چمڑے کے لباس کے مروج ہونے کے بعد بھی مدتوں تک جسمانی آرائش و زیبائی پتوں اور پھولوں ہی سے ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ تاج کا پہلا نمونہ بھی پتوں

کا ایک ہار تھا جو سر میں لپیٹ لیا جاتا۔ یہی اور اسی شکل کا تاج پہلے پہل دنیا کی تمام قوموں میں مروج ہوا۔ اسکے بعد جب جواہرات اور سونے چاندی سے زیب وزینت کا کام لیا جانے لگا تو تاج میں بھی ان چیزوں نے پھولوں اور پتیوں کی جگہ لینا شروع کی۔ چنانچہ ہندوستان کے راجاؤں کے قدیم تاج اُنکی تصویریں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت ہی قیمتی۔ بھاری اور مرصع بہ جواہر تھے۔ یہی کیفیت ایرانی تاجداروں کے تاجوں کی بھی معلوم ہوتی ہے۔ مرصع تاجوں کی سب سے پہلی وضع یہ تھی کہ ایک پٹی میں ایک ہیرا نصب کیا جاتا۔ وہ پٹی سر میں لپیٹ کے پیچھے کی طرف باندھ لی جاتی۔ اور ہیرا پیشانی کے اوپر چمکا رہتا۔ یونان کے سب سے بڑے دیوتا جیوپٹر۔ مصر کے یونانی فرمان روا بطلمیوس اور شاہان شام کے بادشاہوں کی مورتوں کے سروں پہ اسی وضع کا تاج نظر آتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُن دنوں تاج کی خصوصیت بادشاہی کے لیے نہ تھی اور بہت سے معزز عہدہ دار و معتمدین دربار بھی تاج پہنا کرتے تھے۔ مگر بادشاہ کے تاج میں اور اُن لوگوں کے تاجوں میں نمایاں فرق ہوتا تھا۔ بادشاہوں کے تاج کی پٹی سنہری ہوتی اور دیگر عہدہ داروں کے تاجوں کی پٹی اور رنگ کی۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اس پٹی میں اور زیادہ کام ہونے لگا۔ اور دیگر اقسام کے بیش قیمت جواہرات بھی جڑے جانے لگے۔

ایرانیوں میں ساسانیوں کے آخر عہد تک ثابت ہوتا ہے کہ والیان ملک اور مخصوصین دربار کو خاص وضع اور خاص درجے کے تاج عطا ہوا کرتے جو نہایت ہی قیمتی ہوتے۔ عربوں سے اُن سے جب لڑائی ہوئی ہے تو بھی سردار اپنے تاجوں سے پہچان لیے جاتے تھے کہ وہ کس رتبے اور درجے کے امیر ہیں۔ چنانچہ سب سے اعلیٰ رتبے کا سردار ایک لاکھ دینار کا تاج پہنا کرتا جو خاص دربار خسروی سے عطا ہوتا۔ ان سرداروں کو قتل کرنے کی بدولت کئی صحابیوں کو اُنکے تاج ہاتھ لگے۔ جنھوں نے انکو دولت سے مالامال کر دیا۔ اسی قدر نہیں شاہان عجم نے تاج کی وضعوں اور اُسکے پہننے کے طریقوں میں طرح طرح کے اسرار و اشارات مقرر کر رکھے تھے۔ سب سے زیادہ قیمتی اور مرصع تاج ساسانی شاہ ایران کا تھا جسکی نسبت مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دربار کے مکان میں صدر مقام پر

تخت کے اوپر دو مرصع طلائی ستونوں کے درمیان سونے کی زنجیروں میں لٹکا رہتا۔ وہ اس قدر بھاری اور وزنی تھا کہ کسی انسان کا سر اُسکے بوجھ کا متحمل نہ ہو سکتا۔ مگر وہ تخت سے اتنا بلند رہتا کہ بادشاہ جب سریر خسروی پر جلوہ فرما ہوتا تو وہ تاج جو اوپر آویزاں ہوتا اُسکے سر میں پہن جاتا۔ اور اہل دربار کو نظر آتا کہ بادشاہ اُس کو پہنے ہوئے ہے۔

ایرانیوں ہی کو دیکھ کر یونانیوں میں یہ رواج ہوا کہ تاج عہدے کی علامت سمجھا جاتا۔ یونان میں یہ بھی رواج تھا کہ اُنکے قومی دنگلوں میں جو لوگ شہسواری، شہزوری، شمشیر زنی، نیزہ بازی یا دوڑ میں سب سے بازی لے جاتے اُن کو انعام میں بجائے تمغے کے ایک تاج دیا جاتا۔ اسی طرح یہ تاج اُن لوگوں کو بھی ملتا جنھوں نے اپنے ملک کی کوئی نمایاں خدمت انجام دی ہوتی۔ مگر یہ سب تاج پھولوں اور پتوں کے ہوتے۔ جن کی قیمت تو کچھ نہ ہوتی مگر عزت بڑی تھی۔

یونانیوں سے تاج کو رومیوں نے لیا۔ اور اُن میں اُس کا رواج زیادہ تقسیم کے ساتھ تھا۔ اُن میں سب سے زیادہ معزز و ممتاز تاج کورونا اوبسی ڈیونالیس کہلاتا یہ تاج کسی محصور شہر یا فوج کی طرف سے اُس سپہ سالار کو عطا ہوتا جس نے اُن کو دشمن سے نجات دلاکر آزادی دی ہوتی۔ یہ تاج فقط جنگلی پتیوں اور پھولوں سے بنایا جاتا۔ اور اُس بہادر و جانباز سپاہی کو مرحمت ہوتا جس نے کسی میدان جنگ میں کسی رومی باشندے کی جان بچائی ہوتی۔ جس شخص کو یہ تاج ملتا اُسکو اُسکے ساتھ اور بہت سے حقوق بھی مل جاتے۔

رومیوں میں ایک اور تاج تھا جو مورل کہلاتا۔ یہ سونے کا ہوتا اور اس پر قلعے کے برج اور دمدمے بنے ہوتے۔ یہ اُس سپاہی کو ملتا جو کسی محصور شہر کی فصیل پر لڑائی میں سب سے پہلے سیڑھی لگاکے چڑھ جاتا۔ اس کے علاوہ ایک اور تاج جو کرونا والاریس کہلاتا اُس شخص کو دیا جاتا جو کسی دشمن کے پڑاؤ یا مورچے میں سب سے پہلے گھس پڑتا۔ اسی طرح کرونا والیس اُس بہادر کو عطا ہوتا جو سب سے پہلے دشمن کے جہاز پر قدم رکھتا۔ ان مذکورہ تاجوں میں سے سومل اور سوک تاج آج بھی وہاں نقیبوں میں مستعمل ہیں۔

رومیون مین تین طرح کے اعزازی تاج تھے جو "فتح کے تاج" کہلاتے۔ یہ حسب رتبہ اُن سپہ سالارون کو ملا کرتے جو کسی مہم کے سر کرنے اور فتح حاصل کرنے کے بعد جلوس اور فوج کے ساتھ شان و شوکت سے رومۃ الکبریٰ مین داخل ہوا کرتے انھین پر منحصر نہین اور وضعون کے بھی مختلف تاج اہل روم مین مروج تھے جو مختلف درجون اور جداگانہ حیثیتون کے نامورون کو ملا کرتے۔ اُنھین مین چند مقدس تاج بھی تھے جو سونے کے ہوتے یا غلّہ کی بالیون یا زیتون کی پتیون سے بنائے جاتے۔ ان تاجون کو مقتدایان دین اور دیگر حاضرین چڑھاوے اور قربانی کے موقع پر پہن لیا کرتے۔ اور غالباً اُنھین سے پاپاؤن نے اپنے تہرے تاج اور اسقفون اور بشپون نے خاص خاص وضعون کے تاج حاصل کیے ہین جو کیتھولک مسیحیون مین آج تک مروج ہین۔

اہل روم مین ایک قسم کے ماتمی تاج بھی تھے جو معزز مُردون کو پہنائے جاتے اس تاج کا آغاز یونانیون سے ہو چکا تھا۔ چنانچہ اُنکے وہان بھی لاشون کو پہنانے کے تاج ایک قسم کی ہری خوش رنگ گھانس سے بنائے جاتے۔

رومی اپنی دلچسپی کی محفلون اور عیدون مین بھی ایک قسم کا تاج پہنا کرتے جو پھولون کے ہارون سے بنتا۔ اور اسی وضع کا تاج رومی دلھنین بھی پہنا کرتین۔ جسکے لیے وہ خود اپنے ہاتھون سے توڑ کر پھول جمع کرتین اور اُنکو گوندھ کے شادی و زفاف کے موقع پر پہن لیا کرتین۔ اسی قبیل کا ایک تاج زچگی کے لیے مخصوص تھا۔ یہ ہار کی وضع مین گوندھ کر اُس کمرے یا کوٹھری کے دروازہ پر لٹکا دیا جاتا۔ جس مین بچہ پیدا ہوتا۔ لیکن یہ شادی و زچگی کے تاج ہندوستانیون کے مذاق کے مطابق تاج نہین کہے جا سکتے۔ شادی والا تو ہمارے نزدیک سہرا تھا اور زچگی والے تاج کو بجاے تاج کے بندھنوار کہا جائے تو شاید زیادہ موزون ہوگا۔

عرب مین بعہد جاہلیت تاج کا ہونا یقینی ہے۔ اس لیے کہ قدیم شاہان یمن نے اشوریا اور عجمیون کے تعلقات سے بعد ازان والی حیرہ و کندہ کی ریاستون نے ساسانیون سے اور بنی غسان کی سلطنت نے رومیون سے صرف دیگر اوضاع و اطوار

شہریاری کے ساتھ تاج بھی حاصل کر لیے تھے - اس لیے کہ شاہان فرنگ و عجم مین
اُن دنون علی العموم تاجون کا رواج تھا - جاہلیت کا نامور شاعر عمرو بن کلثوم تغلبی
اپنے قصیدۂ معلقہ مین پہلے اس پر فخر کرتا ہے کہ ہم نے کبھی بادشاہ کی اطاعت
نہین کی - اور پھر کہتا ہے "و سید معشر قد توجوہ" (اور سردار جماعت جسے لوگون
نے تاج پہنایا) اور اسکے بعد کہتا ہے کہ اُس تاج پوش کو ہم نے قتل کر کے ڈال
دیا - اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ بادیہ نشین عربون کی آزادی اس سے
نفرت کرتی تھی کہ تاج کی اطاعت کرین مگر اُن مین بادشاہ کہلانے والے تاجدار
موجود تھے - لیکن یہ طلوع نیّر اسلام سے پہلے کی باتین ہین -

ظہور اسلام کے بعد چونکہ حکمرانی کا پہلا نمونہ اُس معصوم ناموس الٰہی نے دکھا
جو انوار قدس کا سرچشمہ تھا اس لیے شاہی و شہریاری انسانی آزادی پر قربان
کر دی گئی - اور حکمرانی و امارت محض چوپانی اور قوم کی خدمتگذاری کا نام رہ گ
اسی وجہ سے مسلمانون مین مدت ہاے دراز تک فرمان رواؤن کے لیے سو
خلیفہ و نائب رسول کے اور کوئی لفظ نہین تھا - خدا مراتب اعلیٰ کرے حضرت
عمر فاروق رض کے کہ انھون نے "امیر المومنین" کا ایک سادہ سا لقب بنا دیا جو ا
تک خلفا کا سرمایۂ ناز رہا - اس لیے کہ مسلمانون کا بادشاہ اور شہنشاہ صرف
خداوند کریم تھا - کئی صدیون تک یہی حالت رہی کہ "بادشاہ کے لقب سے
مسند آرایان خلافت باوجود ہر طرح کے کر و فر کے بُرا مانتے اور عوام اسلام ا
ان الفاظ کو خدا کے سوا کسی بندے کی طرف منسوب کرنا شرک اور ناجائز تصو
کرتے - یہان تک کہ خلافت کمزور پڑی - عربی معاشرت نسیاً منسیا ہو گئی - اور اسلا
وضعداریان اکاسرہ و قیاصرہ کی سنتین اختیار کر لینے کے باعث بالکل مٹ گئ
دیلمیون - آل بویہ - اور سلجوقیون کا زور ہوا جو خلیفہ تو نہ مانے جا سکتے تھے م
سطوت و جبروت مین خلفا سے بڑھے ہوے تھے - امیر المومنین اور خلیفہ کے
القاب مسند خلافت ہی مین لپٹ کے رہ گئے اور اُنکے لیے نئے معزز القاب
تلاش ہوئی - اس جستجو نے چند روز مین اُنکو سلطان و بادشاہ بنا دیا - آخر
بادشاہ - سلطان اور شہنشاہ کے لقب مسلمانون کو ایسے مانوس ہو گئے کہ

اُن کے استعمال کرنے مین نہ شرع کا پاس تھا اور نہ شرک کا اندیشہ۔ چنانچہ حکمرانانِ غزنوی۔ سلجوقی۔ زنگی و ایوبی سب سلطان کہے جانے لگے۔ اسپین و افریقہ مین تو البتہ جہان عربی معاشرت پر بیرونی اثر کم پڑا بادشاہ اور سلطان کے الفاظ کم استعمال ہوے باقی مشرق کے تمام مسلمان حکمران چھوٹے ہون یا بڑے سب کے سب سلطان۔ بادشاہ اور شہنشاہ کہے جانے لگے۔

ہندوستان مین اس مشرکانہ بے احتیاطی کو یہان تک ترقی ہوئی کہ ضعیف الاعتقاد اکبر نے اپنے سامنے رکوع و سجود کرانا شروع کر دیا۔ اور القاب مین تو ایسی ترقی ہوئی کہ خدا کے لیے کوئی نام اور لقب نہین باقی رہا۔ اور حضرت رب العزت کی شان مین جتنے القاب و صفات مستعمل ہوتے تھے سب سریر آرایان سلطنت کی شان مین استعمال ہونے لگے۔

خیر سلطان یا دوسرے الفاظ مین یون کہا جائے کہ فرعون بے سامان تو حکمرانان اسلام بن گئے مگر اس بات کو آج مسلمان حیرت سے دیکھین گے کہ قدیم تاج کو بہت کم لوگون نے اختیار کیا۔ وہی عربی عمامہ جو بادیہ نشینان عرب مین مروج تھا تھوڑی ترمیم و ترقی کے ساتھ خلفا مین اور اُنکے بعد سلاطین و شاہانِ اسلام مین تاج کا کام دیتا رہا۔ تاج کا جو خیالی خاکہ ہندوستانیون کے ذہن مین ہے یہ انگریزون اور مسیحیون سے ہوا ہے۔ خصوصاً جب انگریزون نے یہ تاج نواب مسند آرایان لکھنؤ کو دیا تو سارے ہندوستان مین یہ خیال پھیل گیا کہ تاج ایسا اور اس وضع کا ہوتا ہے۔ ورنہ مسلمانون مین کہین اور کسی جگہ سوا مقطع اور شاندار عمامون کے اس قطع کے تاجون کا رواج نہین رہا تھا۔ چند روز بعد اُن عمامون مین بڑے بڑے قیمتی موتی اور جواہرات لگائے جانے لگے۔ پھر اُس پر یہ ترقی ہوئی کہ ایک یا کئی کلغیان قائم کر دی گئین۔ کلغیون کا رواج خلفائے بنی اُمیہ و بنی عباس کے عہد تک ثابت نہین ہوتا۔

لیکن خلفا کے بعد جب مسلمانون مین سلاطین اور بادشاہون کی حکومت جاری ہوئی تو تاج کے عوض تاج کی کلغیان لے کے مرصع جیغون کے ساتھ شاہی عمامون مین لگائی جانے لگین۔ سلاطین آل عثمان۔ شاہان ہند۔ اور فرمان روایان

عجم سب کے تاج ہی کلغی دار عمامے تھے - ایران کے بادشاہون مین خصوصاً آخری
زمانے مین ایک لمبی اونچی اور کنگرہ دار ٹوپی کا رواج معلوم ہوتا ہے جو انکی تصویرون
کے سرون پر نظر آتی ہے - مگر یہ کلاہ پاپاخ تھی جس نے تھوڑی تبدیلی کے ساتھ موجودہ
ایرانی ٹوپی کو پیدا کیا ہے - اس ٹوپی کو اس لیے تو تاج کہہ سکتے ہین کہ شاہان ایران
کے سرون سے اس نے زینت و عزت پائی تھی مگر فی نفسہٖ اُسکو تاج سے کوئی تعلق
نہ تھا -

دنیا و آخرت

تہذیب و مذہب کا تقاضہ ہے کہ انجام کا خیال کرو اور دو روزہ عیش کی ہو
مین نہ پڑو - مگر دل کہتا ہے کہ لطف کی جو گھڑی نصیب ہو جائے اُسے بے مزہ ہاتھ
نہ جانے دو - رندون نے اس آخری مسلک کو اختیار کیا اور عیش پرستی کے پیچھے
دنیا و عقبیٰ دونون کو بھول بیٹھے - مگر صوفی ضرورت سے زیادہ عاقبت اندیش
تھے - دنیا کی تمام لذتون کو چھوڑا - عیش و عشرت سے دست بردار ہو گئے - اور ر
دانے عالم سرمدی کی مسرتون کے شوق مین دنیا سے متنفر رہے - دونون کے مخا
مذاقون کا ماحصل یہ ہے کہ ایک دنیا مین پھنسا ہے اور دوسرا آخرت کے شوق م
دنیا کو بھول بیٹھا ہے - ایک آج کی مقدوری پر کل کی اُمیدون کو اور دوسرا کل
مسرتون پر آج کی کامیابی کو قربان کر رہا ہے - دونون اپنے مقام پر خوش اور مطم
ہین اور دوسرے کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہین

لیکن غور سے دیکھو تو یہی نوع انسان کو دونون نقصان پہنچا رہے ہ
ایک اگر دنیا کے مزے لوٹ رہا ہے تو آخرت سے دست بردار ہوکر - دوسرا ا
فلاح آخرت کا شائق ہے تو دنیا کو ہاتھ سے کھوکر - یہ دونون غلطی پر ہین - ا
گھاٹے مین پڑے ہوے ہین - اور دونون اسی غلطی مین مبتلا ہین جس نے ہز
سال تک کھو گئے ہین رکھا اس لیے کہ اگلے تمام سلاطین و اہل مذاہب ا
مذاق مین ڈوب کر مسلسل نقصان اُٹھاتے رہے - بادشاہون نے رندانہ مشـ
اختیار کی تو چند اہل دل نے صوفی گری - پہلون کو دنیا سے غرض تھی تو دوسر

خارج تھے اور دوسرون نے عقبیٰ سے سروکار رکھا تو دنیا سے بے پروا ہو کر۔

اسلام کا دنیا مین آنا دراصل اسی غلطی کے مٹانے اور اسی نقصان کے دُور کرنے کے لیے تھا۔ اسلام نہ یہ کہتا ہے کہ عیش دوروزہ دنیا کو چھوڑو اور نہ یہ کہتا ہے کہ فلاح آخرت کی طرف سے بے پروا ہو جاؤ۔ اس کے اصول سے نہ دنیا آخرت کی ضد ہے اور نہ آخرت دنیا کے خلاف۔ اس کا دعویٰ ہے کہ "الدنیا مزرعۃ الآخرۃ" جس کے معنی اور کوئی چاہے کچھ سمجھے ہم تو یہ سمجھتے مین کہ اگر تم نے دنیا کی کھیتی درست کر لی تو آخرت مین بھی اچھے رہو گے۔ یا دوسرے الفاظ مین یون کہا جائے کہ "دُنیا اچھی ہے تو عقبیٰ بھی اچھی ہو گی"۔ خلاصہ یہ کہ اسلام دنیا اور آخرت دونون کے سدھارنے اور سنوارنے کو آیا ہے۔ اس کے فیصلے کے مطابق دنیا ہی کی اصلاح سے عقبیٰ کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور عقبیٰ ہی کی غرض سے دنیا درست ہوتی ہے۔ اس بات کو لوگ مدت تک نہین سمجھے مگر یہ کوئی عقل کی بات نہ تھی کہ خدا نے بھیجا تو دنیا مین ہے اور مقصد یہ ہے کہ اسکو چھوڑ دو۔ چھڑانا تھا تو پھر بھیجا کیون؟

مگر اگلے بزرگون اور آجکل کے بھی بہت سے مقطع و فرشتہ صورت صالحان کی سمجھ مین نہین آتا کہ دنیا و عقبیٰ کی اصلاح ایک ساتھ کیسے ہو سکتی ہے ظلمت و نور کا ساتھ کیسا؟ اور عالم ظلمت مین منہمک ہونے سے انسان عالم نور مین کیسے اچھا رہ سکتا ہے؟ یہ ظلمت و نور کے استعارے خود تم نے اپنے قدیم مذاق روحانی سے ایجاد کر لیے ہین ورنہ حقیقت و اقعیت کی نظر سے دیکھو تو وہی ٹھیک نظر آتا ہے جو ہم نے کیا اور جو اسلام کی اصلی تعلیم ہے۔

اسلام کیا کہتا ہے؟ اسلام کہتا ہے کہ دنیا مین جس طرح بنے اوج و عروج پیدا کرو۔ ہر طرح کی مسرتین حاصل کرو۔ ہر قسم کا لطف اُٹھاؤ۔ اور دوروزہ عیش کے مزے ہاتھ سے نہ جانے دو۔ دولت جمع کرو۔ سامان عیش فراہم کرو۔ سلطنت و حکومت حاصل کرو۔ ملکون اور قومون پر چھا دو اور فرماں روائی کرو۔ حسین سے حسین اور مہ جبین سے مہ جبین پریوشون کو اپنی معشوقہ و محبوبہ بناؤ۔ جادو نگاہ کنیزون اور حرمون سے اپنے کاشانۂ عیش کو رونق دو۔ لذیذ سے لذیذ غذا کو

قوت جان بناؤ۔ اور لطیف سے لطیف خوشبو سے دماغ کو تر و تازہ کرو۔ اور اگرچہ زندگی تھوڑی ہے مگر دو روزہ عیش کے سامانوں میں سے کوئی رہ نہ جانے۔ لیکن ان سب لذتوں اور عیش کے سامانوں کو خدا کی دی ہوئی نعمتیں تصور کر کے شکر اور خدا ترسی کے ساتھ برتو۔

شکر و خدا ترسی کیا ہے؟ یہ کہ شکریہ میں ہر روز تھوڑا مقررہ وقت خدا کی یاد میں صرف کرو۔ اور خدا کے خوف سے ہر لذت کے حاصل کرنے اور برتنے میں تمھارا قدم حد اعتدال سے باہر نہ ہونے پائے۔ تم سے کسی کو آزار نہ پہونچے۔ نعمتوں کو ناجائز یا ظالمانہ و غاصبانہ طریقوں سے نہ حاصل کرو۔ اور اُن سے لطف اُٹھاتے وقت شکستہ حال محتاجوں اور مصیبت زدہ ستم کشیوں کو نہ بھولو۔ آپے سے باہر نہ ہو کہ بُرے بھلے اور عدل و ظلم کا امتیاز نہ باقی رہے۔ اگر خدا ان نعمتوں سے محروم کر دے تو صبر و شکر سے کام لو اور حرف شکایت زبان پر نہ آئے۔ یہی صبر و شکر۔ یہی اعتدال و انصاف۔ اور یہی صبر و قناعت جنت کے دروازے کی کنجی ہے۔ اور ان احتیاطوں کے ساتھ تمھاری زندگی دنیوی کا عیش دو روزہ ہی آخرت کے ابدی عیش کا ذریعہ بن جائے گا۔

سچ یہ ہے کہ جو شعرا تصوف کے دعوے ترک دنیا سے دھوکا اُٹھا کر لوگوں کو لذت ہائے دنیوی سے روکنے لگے اُنھوں نے نجات کا سچا راستہ نہیں دکھایا بلکہ اور بھٹکا دیا۔ مگر ہاں جن فطرت پرستوں نے رندوں کی طرح یہ کہا کہ کوئی گھڑی بے عیش کے نہ گذرنے پائے۔ خوشیاں مناؤ اور مزے اُڑاؤ۔ وہی کچھ سیدھے راستہ پر تھے۔ مگر افسوس ہم نے اُنکی قدر نہ کی۔ یونانیوں کے فلسفیوں کا جو گروہ دنیا پرستی سکھاتا تھا وہ ان لوگوں سے اچھا تھا جو دنیا چھڑاتے تھے۔ اور آج بھی ہم میں جو لوگ رند مشربوں کی طرح عیش دُنیا سے بہرہ یاب ہونے کی تلقین کرتے ہیں اُن سے اچھے ہیں جو دنیا چھوڑنے کو کہتے ہیں۔

اس صحیح نتیجے تک نوع انسان کو سب سے پہلے اسلام نے پہونچایا تھا۔ مگر افسوس کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں عیسائیوں۔ ہندوؤں۔ اور پارسیوں کے فلسفۂ الٰہی نے انکی دینی تعلیم پر غالب آکر مسلمانوں کو اپنے اصلی دین

سے غافل کر دیا۔ اور مسیحیوں نے جو ترک دنیا کے تاریک سمندر میں غوطے کھا رہے تھے ہماری اُن تعلیموں کو اختیار کر کے ترقی دنیا کی طرف توجہ کی تو وہ حیرت انگیز کمالات دکھا دیے کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ یہ کلین، یہ ریلین، یہ ہوائی جہاز اور یہ سائنس کے معجزانہ انکشافات سب اُسی تعلیم کی برکت میں جس کا سبق تو قرآن کے مکتب نے دیا تھا مگر عمل کرنے والے انجیل کے پیرو تھے۔

مگر اس "وضع الشئ علیٰ غیر محلہ" سے دنیا والوں کو ایک بہت بڑا نقصان پہونچ گیا جو نہایت خطرناک ہے اور اب اس کا دُور ہونا بہت دشوار بلکہ غیر ممکن نظر آتا ہے۔ تعلیم چونکہ دراصل اسلام سے حاصل ہوئی تھی اس لیے اسکو اصول و عقائد اسلام سے فطری مناسبت تھی۔ اگر اصلاح عالم کی غرض پیروان اسلام کے ہاتھ سے پوری ہوتی تو لوگ پورے پورے دیندار اور خدا پرست رہ کر اس کام کو پورا کرتے۔ اور سائنس چاہے کیسی ہی کرامات و خوارق عادات دکھاتا خدا پرستی کا نقش دلوں پر سے نہ مٹتا۔ برخلاف اسکے مسیحیت چونکہ اصولاً روحانیت اور بت پرستوں کے فلسفۂ روحانی کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اس لیے اُسکو دنیا داری و دنیا دارانہ نفس پرستی کی باتوں سے کوئی ذاتی علاقہ نہ تھا۔ اسکے عقائد و اصول کا جوڑ ان چیزوں سے نہیں بیٹھتا۔ اور اس کا انجام یہ ہے کہ دنیا جس قدر ترقی کرتی جاتی ہے اور سائنس جو جو جدید انکشافات کرتا جاتا ہے اُسی قدر مذہب کمزور پڑتا جاتا ہے۔ مسیحیوں نے اصول اسلام سے سیکھ کر دنیا تو بیشک اچھی طرح سیکھ لی مگر اُنکا مذہب اُنکے دلوں پر اپنی گرفت نہ باقی رکھ سکا۔ چنانچہ تمام باکمالان یورپ اور اُن کے پیرو لا مذہب اور خدا کو بھولے ہیں۔

یہی کام اگر امت اسلام کے ہاتھ سے انجام پاتا تو یہ لامذہبی کا نتیجہ نہ پیدا ہوتا۔ اور جن معتدل خدا پرستی و تہذیب کی تعلیم اسلام نے دی ہے وہ سائنس کے مقابلہ میں ہرگز کمزور نہیں پڑ سکتی تھی۔

ہم کو مسیحیوں پر حسد نہیں۔ ان کی ترقیاں دیکھ کر خوش ہوتے بلکہ اُنکی پیروی کرنے کو تیار رہیں مگر یہ صدمہ ہمارے دل سے دور نہیں ہو سکتا کہ اُن کے ہاتھ سے دنیا کو جو ترقی حاصل ہو رہی ہے وہ مذہب کو مٹائے دیتی ہے اور وہ

یعنی الٰہی تہذیب جس کی گرفت دلون پر تمام دنیوی تہذیبون سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے صفحۂ زمین پر سے فنا ہونے کے قریب پہونچ گئی۔ لیکن اگر ہم مُرا ہی مین پڑکے اپنے فرض کو نہ بھولتے اور حضرت مخبر صادق صلعم کی ہدایت کے مطابق سرگرمی سے اس کام کو شروع کر دیتے تو دنیا بھی ترقی کرتی اور عقبیٰ بھی نہ خراب ہونے پاتی۔

علامات اوقاف

ہمارے فاضل دوست مولانا نظام الدین حسن صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ال۔ جج ہائی کورٹ دولت آصفیۂ نظام نے کمال ذکاوت و ذہانت اور نہایت ہی جستجو و دقیقہ سنجی کے ساتھ ایک بالکل نئی اور اچھوتی تحقیقات کی ہے جسکی طرف جہان تک ہم جانتے ہین اس سے پیشتر کسی کا خیال نہین کیا گیا تھا۔ اُنھون نے ایک مختصر رسالہ انگریزی مین ایک چھوٹے پمفلٹ کی شان مین شایع کیا ہے جو فلسکیپ کے تین صفحون سے کم پر ختم ہو گیا ہے۔ لیکن ان گنتی کے تین صفحون کی قدر و قیمت سچ یہ ہے کہ بڑی بڑی ضخیم کتابون سے بھی زیادہ ہے۔ ہمارے فاضل مولانا ثابت کرتے ہین کہ انگریزی خط مین جو مختلف علامتین طرز ادا ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہین نہ پُرانی انگریزی مین تھین، نہ یونانی مین، نہ لاطینی مین۔ اسکے ثبوت مین وہ انسائیکلو پیڈیا برٹانکا جلد ۱۸۔ صفحہ ۱۶۳ کی یہ عبارت پیش کرتے ہین کہ "جو علامات یورپ کی تحریرون مین مستعمل ہین ان کی اصلیت نہ یونانی الفاظ سے ہاتھ آسکتی ہے اور نہ رومی الفاظ سے۔" اسکے بعد اُنھون نے یہ بھی بوضاحت اور مستند طریقون سے بتا دیا ہے کہ جو چند علامات یونانی اور رومی تحریرون مین استعمال کیے جاتے تھے وہ موجودہ خط یورپ کی علامت سے بالکل جدا تھے۔ اور اُن کا ان مروجہ علامات سے کوئی تعلق نہین ثابت کیا جا سکتا۔

اور جب صاف ہو گیا کہ ان علامات کو یورپ کی قدیم زبانون سے کسی قسم کا تعلق نہین تو وہ دعوی کرتے ہین کہ یہ علامتین اُن علامتون سے لی گئی ہین جو سنہ ۷۱۱ء سے سنہ ۱۴۹۱ء تک مملکت ہسپانیہ مین عربی زبان کے طلبہ اور اہل علم مین

مروج تھین - وہ یہ بھی کہتے ہین کہ قاہرہ اور مصر کے عربی اہل علم مین بھی بعض علامتین مروج تھین مگر وہ ان سے جدا تھین مگر وہ ان سے جدا تھین اور اور قسم کی تھین

اب اسکے بعد مولوی نظام الدین حسن صاحب ان علامات اور انکے نشأ انتزاع کی تصریح فرماتے ہین - اور ہر ایک علامت کو جُدا جُدا یون بیان کرتے ہین۔

کاما comma جو انگریزی خط مین اس وضع مین (،) لکھا جاتا ہے۔ لکھا جاتا ہے عربی کے لفظ "وقف" سے نکلا ہے - جس کے معنی ٹھہرنے کے ہین لہذا وہ عربی مین اُس محل پر بھی استعمال کیا جاتا تھا جہان انگریزی مین اُلٹے کاما استعمال کیے جاتے ہین - انگریزی مین نہ اس حرف کے معنی "اور" کے ہین اور نہ کسی لفظ کا جز بنایا جا سکتا ہے - اور نہ اس کی کوئی ضرورت ثابت ہوتی ہے کہ یہ حرف کیون اُلٹ کے لکھا گیا - عربی مین ان علامات کے محل پر یہ کاما یعنی (و) ہمیشہ اُلٹا اور اس طرح (،) لکھا جاتا تھا اور یہ بھی مروج تھا کہ جب کسی اور کی یا اور جگہ کی عبارت نقل کی جاتی تو اُسکے دونون طرف دو دو اُلٹے واؤ (انورٹڈ کاما) لکھے جاتے - اور یہی طریقہ یورپ کے اہل علم کے عمل درآمد مین ہے - اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ (و) خواہ وقف کے محل پر استعمال کیا جائے یا عبارت نقل کرنے کے محل پر" دونون موقعون کے لیے عربی ہی سے لیا گیا ہے -

سمی کولن جو انگریزی مین یوں (؛) لکھا جاتا ہے یہ بھی عربی کے الفاظ "نصف وقف" سے لیا گیا ہے - نقطہ لفظ "نصف" کے نون کا قائم مقام ہے - اور "و" لفظ وقف کا پہلا حرف ہے - اور جن معنون اور جس محل پر عربی مین مستعمل تھا اُسی طرح انگریزی مین بھی نصف وقف کے محل پر استعمال کیا جاتا ہے -

کولن (:) البتہ ایک ایسی علامت ہے جس کا عربی مین پتہ نہین لگتا - اور یورپ کے موجودہ خط مین نیچے اوپر دو نقطے بنا کے قائم کی گئی ہے لیکن صاف نظر آتا ہے کہ عربی ہی کی علامات دیکھ کے مستنبط کی گئی ہے -

علامت فل اسٹاف انگریزی مین ایک گول نقطہ (۰)
کی وضع مین لکھی جاتی ہے یہ بھی عربی مین نہ تھی - اس جگہ عرب لوگ "بت" لکھا کرتے
تھے - جس کے معنی قطع کرنے کے ہین - لیکن اس مین شک نہین کہ کثرت تحریر مین
"بت" کی صورت ایک لکیر کی رہ گئی تھی اور انگریزی مین ڈیش (-) جو مختلف علامتو
کے ساتھ اور جا بجا بنائے جاتے ہین اصل مین عربی کی علامت "بت" ہی سے
ماخوذ ہین -

سوال کے محل پر انگریزی خط مین جو قریب قریب ساری یورپین زبانون کا
خط ہے علامت (؟) بنائی جاتی ہے - اس کو عربی مین علامت استفہام کہتے ہین
استفہام کا اصلی مادہ فہم ہے - اور اسی لفظ فہم کی قائم مقام علامت ہے جس مین
ابتدا کے دو حرف "ف" اور "ہ" اپنی اصلی صورت پر قائم ہین - اسکے سوا اور
کوئی بنیاد اس علامت کی بتائی ہی نہین جا سکتی -

پکارنے اور مخاطب کرنے کے محل پر انگریزی مین علامت (!) استعمال کی
جاتی ہے - یہ علامت بھی صاف طور پر بتا رہی ہے کہ عربی لفظ "ندا" کی قائم مقام
ہے جسکے معنی پکارنے کے ہین - نیچے نقطہ نون کی جگہ ہے - اور اُس پر الف قائم
کر دیا گیا جو اصلی لفظ کا آخری حرف ہے -

اسی طرح برکیٹ [ ] - ( ) جنھین عربی مین خطوط وحدانی اور قوسین
کہتے ہین - یہ بھی عربی ہی سے ماخوذ ہین -

مندرجۂ بالا اشارات و علامات اور اُن کا پتہ دیکھ کے لوگ اندازہ کر سکتے
ہین کہ مولوی نظام الدین حسن صاحب نے کیسا کام کیا ہے اور کس خوبی سے
ثابت کر دیا ہے کہ انگریزی رسم خط کی تہذیب بالکل عربی کی زیر بار احسان ہے - بہتر
ہو کہ اس مضمون کو جس کا نام "ڈرایویشن آف پنکچویشن مارکس" (تخریج علامات
رسم خط) ہے ہمارے ہمعصر اڈیٹران اخبار خصوصاً وہ جن کے ہاتھ مین انگریزی اخبار
ہین مولوی نظام الدین حسن صاحب سے منگوائین - اور اُن پر بحث کرکے اور
اور پوری کوشش کرکے انگریزی پبلک کو بتا دین کہ انگریزی تحریر عربی رسم خط
کی کس قدر خوشہ چین ہے -

ریختی گوئی

اُردو شاعری کو جس چیز نے سب سے زیادہ ناپاک بنایا اور اُس مین گندگی و نجاست کا ایک بہت بڑا دفتر پیدا کر دیا وہ ریختی ہے۔ شہوت پرست امیرون کی صحبتون مین مسخرہ پن کی صورت مین یہ بیہودگی و بے شرمی شروع ہوئی۔ اور آخر اسی طریقے سے اور ایسے ہی ناپاک مذاق والے رئیسون کی محفلون مین پرورش پا کے اس درجے کو پہونچی کہ اُس رنگ کے دیوان مرتب ہونے لگے۔ اور ہر صحبت مین اُس قسم کے شعرون کا چرچا ہونے لگا۔

اس سے بڑھ کے بیحیائی اور بے شرمی کا شاید کوئی نمونہ نہ نظر آئے گا کہ ایک مرد جو آپ کو شاعر کہتا ہے ڈاڑھی مونچھ لگا کے سر سے دوپٹہ اوڑھتا ہے اور عورتون کی تو سچی نقل کر نہین سکتا (کیونکہ عورتون کے جذبات مردون پیدا ہون یہ امر فطرت اور قانون قدرت کے خلاف ہے) ہان زنانون اور ہیجڑون کی طرح ناک پر اُنگلی رکھ رکھ کے اور تالیان بجا بجا کے زنانے لہجے اور بازاری عورتون کے نخرون کے ساتھ شعر پڑھتا ہے۔

ایسے اشعار کی بنیاد ہی چونکہ بدکاری اور بیحیائی سے پڑی ہے۔ لہذا عموماً اس قسم کے اشعار مین فحش اور ناپاک و ذلیل الفاظ بہت کثرت سے ہوتے ہین جنھین سُن سُن کے ہمارے بے غیرت امیرزادے خوش ہوتے اور کھلکھلاتے ہین۔ کاش عورتون ہی کا مذاق دکھانا تھا تو شریف بہو بیٹیون اور پاکدامن اور باعفت خاتونون کے مذاق کا لحاظ رکھا جاتا۔ مگر نہین۔ یہان تو اس سے غرض ہے کہ بیحیا اور بدکار عورتون کی ادائین اور اُنکی بداخلاقی و بد اطواری کی حرکتین دکھائی جائین

افسوس ہماری شاعری پر جو الہام ربانی کا نمونہ بتائی جاتی ہے ان ہرزہ سراؤن کے ہاتھون ایسا ظلم ہوتا ہے اور بد مذاق و بدکار امیرزادون کو اپنے نفسانی جذبات کے سامنے اس کی بھی تمیز اور حس نہین باقی رہتی کہ ایسے شرمناک کلام اور بیحیائی کے شعرون سے قوم اور ملک کو کتنا بڑا ضرر پہونچ رہا ہے۔ دوسرے ملکون اور دوسری قومون کے لوگ جب اس شرمناک کلام کو دیکھین گے تو انھین

۔۔ں کی تو مطلقاً حس نہ ہوگی کہ یہ بازاری عورتوں اور زنانوں کی زبان اور انھیں
۔۔ وضع ہے - بلکہ وہ یقین کریں گے کہ یہ شریف زادیوں کے حرکات اور چال
۔۔پن کا نمونہ ہے - اور پھر ایسا خیال قائم ہو جانے کے بعد اُردو بولنے والی عورتوں
۔۔ عصمت و عفت غیروں کی نظر میں کس قدر ادنیٰ اور ناقص ثابت ہو جائے گی -
جس قسم کا ظلم ریختی کی شاعری نے اُردو زبان اور اُردو شاعری پر کیا ہے
۔۔سا ظلم آج تک کبھی کسی قسم کے اشعار سے کسی زبان پر نہیں ہوا تھا - سلف
۔۔ے آج تک کسی زبان میں ایسی ناپاک شاعری نہیں پیدا ہوئی تھی جس سے
۔۔تہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج تک کسی قوم میں ایسے بیہودہ اور ایسے بیحیا شاعر
۔۔ہیں پیدا ہوئے تھے جیسے کہ اُردو میں پیدا ہوئے ہیں -

اکثر ترقی یافتہ قوموں اور مشہور و معروف زبانوں میں لائق عورتوں نے
۔۔پنے جذبات اور اپنے خیالات اپنی ہی زبان میں ضرور ظاہر کیے ہیں مگر نہایت
۔۔ہذیب و شائستگی کے ساتھ - اس میں کوئی شک نہیں کہ عورتوں کی زبان جو عموماً
۔۔سادی اور دلکش ہوتی ہے اور اکثر اُس میں ایک خاص قسم کا لوچ اور لطف
۔۔ہوتا ہے شاعری اور انشا پردازی کی جان ہے - مگر اُسی تہذیب کے ساتھ جس
۔۔ہذیب سے کہ کوئی پاکدامن اور عفیفہ عورت اپنے خیالات ظاہر کرے - یہ نہیں کہ
۔۔مرد عورتوں کا سا دوپٹہ اُوڑھ کے اور زنانی صورت بنا کے اپنی شہوت پرستی کی
۔۔رزو پوری کریں - اور اپنے ناپاک دل کا حوصلہ نکالیں -

انگریزی میں انشا پردازی کا بہت زیادہ حصہ خاتونان قوم ہی کے قلم سے
۔۔زینت پا رہا ہے - جو نیز شاعری کی حیثیت سے اور نیز ناول نویسی کے انداز سے
۔۔پنے پاکیزہ خیالات - اپنی ستھری زبان - اور اپنے مہذب و شریفانہ جذبات کو پبلک
۔۔کے سامنے پیش کر کے داد خواہ ہوتی ہیں - اور قوم اور زبان میں تہذیب و پاکبازی
۔۔کی روح پھونکتی ہیں - وہاں مرد بیحیائی کے یہ کرشمے نہیں کرتے کہ عورت بن کے
۔۔اور بھاؤ بتا بتا کے فحش بکنے لگیں -

یہی حالت عربی کی ہے جس میں ہزارہا شاعرہ عورتیں گذری ہیں - انھوں نے
۔۔اپنی پاک و صاف اور بقول زبان آور اور داد دینے والوں کے کوثر میں دھوئی ہوئی

زبان مین قصیدے بھی کہے ہین۔ مرثیے بھی کہے ہین۔ جوش دلانے والے اشعار بھی تصنیف کیے ہین۔ مگر کبھی یہ نہین کیا کہ ہیجڑون کی طرح نخرے کرنے اور تالیان بجانے لگی ہون۔ یا مَردون نے ان کا بہروپ بھر کے اُنکی نہایت ہی فحش اور شرمناک تصویر دکھائی ہو۔

افسوس بہت سے لوگ ہون گے جو جاَن صاحب کا دیوان پڑھ کے یقین کرتے ہون گے کہ لکھنؤ کے شریف زادیون کی یہی حرکتین۔ یہی ادائین اور اُن کے یہی الفاظ ہین۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ سوا بازاری رنڈیون کے شریف عورتون مین ان الفاظ اور حرکات کا کہین شان وگمان بھی نہین ہے۔

اگر عورتون کے کلام اور اُنکی سادی زبان کا لطف دکھنا چاہتے ہو تو اُنھین کو موقع دو کہ اپنے مہذب اور پاک وصاف خیالات کو اپنی زبان مین ادا کرین۔ ہمارے یہان ایک دوسرا ستم ہو گیا ہے کہ جو عورتین شعر کہتی ہین وہ مرد اُستادون کی تقلید اور موجودہ شعرا کے تتبع مین اپنے آپ کو مذکر کی ضمیرون سے یاد کرتی ہین۔ صرف اسی قدر نہین۔ وہ مَردون کے تیور اختیار کرتی ہین اور اُنھین کے دلی جذبات کو اپنی زبان مین ظاہر کرتی ہین۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورتین تو شاعری کی دنیا مین آکے مرد بنجاتی ہین۔ اور ریختی گو مرد شعر کہتے اور پڑھتے وقت عورت بنجاتے ہین۔ اور سچ پوچھیے تو دونون ناقص اور بیہودہ۔ کیونکہ جس طرح مرد کا عورت بننا بھی انتہا سے زیادہ خلاف نیچر اور نازیبا معلوم ہوتا ہے۔ فطرت ہی یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ مرد پر مردانگی ہی کی باتین پھبتی ہین اور عورت پر نسائیت ہی کی باتین۔ مگر اُردو شاعری نے واقعی یہ عجیب وغریب انقلاب پیدا کر دیا ہے کہ اسکی طرف توجہ کر کے عورتین مرد بن جاتی ہین۔ اور مرد عورتین۔

پاک سرزمین عرب مین جب کسی عورت نے شعر کہا ہے تو ہمیشہ اپنے آپ کو عورت ہی دکھایا ہے۔ مؤنث ہی کی ضمیر سے اپنے کو یاد کیا ہے۔ عورت ہی کے خیالات و جذبات باقی رکھے ہیں اور عورت ہی کے الفاظ۔ اور چونکہ وہ نیچرل ہین لہذا ان مین اثر بھی بلا کا ہے۔

عباسی خلیفۂ بغداد مقتفی باللہ کے عہد مین بغداد کی ایک حسین و صاحب

جمال پارسا و پاک دامن نازنین نے جس کا نام سلمیٰ بنت قراطیس تھا چند شعر کہے تھے

عیُونُ مہا الصّریم فِدَاءُ عینِي ۔۔۔ وَاجْیادُ الظِّبَاءِ فداءُ جِیدِي

اُزَیِّنُ بالعقود وَاِنَّ نحري ۔۔۔ لَاَزْیَنُ للعقودِ مِنَ العقودِ

ولا اَشکُو مِنَ الاوصابِ ثِقلاً ۔۔۔ وَتَشکُو قامتي ثِقلَ النُّهُودِ

یہ اشعار اس قدر دلچسپ اور پسندیدہ تھے کہ تصنیف ہوتے ہی سارے بغداد میں پھیل گئے۔ اور اکثر لوگوں کی زبان پر جاری تھے۔ ہوتے ہوتے خلیفۂ مذکور یعنی مقتفی باللہ کے گوش گذار ہوئے۔ اُس نے سُن کے اہل دربار سے کہا "ذرا دریافت تو کرو کہ یہ عورت ایسی ہی ہے جیسا کہ اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے یا یہ فقط مبالغۂ شاعرانہ ہے" لوگوں نے بخوبی معلوم کر کے عرض کیا کہ "حضور یہ نازنین جتنا کہ ان شعروں سے ظاہر ہوتا ہے اتنی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ صاحب جمال ہے۔ اس بات کا اطمینان ہو جانے کے بعد اُس نے کہا "اچھا اب تحقیق کرو کہ اس کا چال چلن کیسا ہے؟" یہ بھی دریافت کر کے دربار میں عرض کیا گیا کہ "نہایت ہی پارسا و پاکدامن ہے۔" جب یہ بھی معلوم ہو گیا تو مقتفی نے بطور انعام و اکرام کے بہت سا روپیہ اُسکو بھیجوایا اور کہلا بھیجا کہ "یہ رقم تمھیں اس غرض سے دی گئی ہے کہ اس سے اپنی عفت و پاکدامنی کے محفوظ رکھنے میں مدد لو۔"

یہ ہے شان سچی شریفانہ شاعری کی۔ اور چونکہ ایک شریف خاتون نے ان اشعار کے ذریعے سے اپنے دل کے سچے جذبات ظاہر کیے ہیں لہذا ان میں وہ اثر اور وہ لطف ہے کہ ریختی کے پندرہ ہزار دیوان انکے سامنے پھاڑ کے پھینکدیجیے۔ الغرض اگر اُردو کو فائدہ پہونچانا ہے تو یہ کوشش کی جائے کہ مرد و عورت جو کوئی شعر کہے اپنے اصلی جذبات و خیالات کو اپنے ہی لہجے اور اپنی ہی زبان میں ادا کرے

عہ جنگلی گاؤں کی کالی آنکھیں میری آنکھوں پر قربان۔ اور ہرنیوں کے گلے میرے گلے کے صدقے۔

عہ میں آرایش کے لیے موتیوں کا ہار پہن لیتی ہوں مگر جتنی زینت اُن ہاروں سے میرے سینے کو حاصل ہو سکے اُس سے زیادہ رونق وہ خود میرے گلے سے پاتے ہیں۔

سہ میں سُرینوں کی شکایت نہیں کرتی کہ بھاری ہیں۔ مگر ہاں میرا قد سینے کے اُبھار کا البتہ شاکی ہے۔ اس لیے کہ چھاتیوں کے بوجھ سے لچک لچک جاتا ہے)

تا کہ کلام مین پورا اثر ہو - اور اگر ایسا کرنا اُسے پسند یا گوارا نہ ہو تو شاعری کا نام نہ لے - اپنی حماقت پہ شاعری کے قربان کرنے سے کوئی نتیجہ نہین -

بد قسمت زبان اُردو

شاید ہی مصرعہ زبان حال سے آج کل اُردو زبان پڑھ رہی ہوگی - ایک مدت دراز تک مساعدت زمانہ کے مزے اُٹھا کے اب بظاہر اُسے ناسازی قسمت سے سابقہ پڑا ہے - کیونکہ بیرونی حملون کے ساتھ اُسکے دوستون نے باہمی اختلاف اور جھگڑے پیدا کر کے اُسے ایک سخت کشمکش مین ڈال رکھا ہے -

جب زمانہ اسکے موافق تھا اور نازبردارون کی گود مین پل پل کے یہ ترقی کر رہی تھی اُس وقت اس نے تھوڑے زمانہ مین بہت اچھا رنگ اور روپ نکالا - مختلف مذاق اور مختلف خیال کے صاحب کمال شعرا پیدا ہوے جنھون نے اسکو چمکا کے آسمان کا تارا بنا دیا - اُنھون نے اپنی جادو بیانیون سے زمانے کو اپنی طرف متوجہ کیا - اور اس مین کچھ ایسے جذبات بھر دیے کہ ہندوستان کے ہر کونے سے لوگ قدردانی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوے - نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز میں یہ زبان ہر جگہ پھیل گئی - اور سارے ہندوستان مین اُسے یہ مقبولیت اور تعمیم حاصل ہو گئی کہ غیر ملک کا جو شخص ہندوستان مین آئے اُسے صرف اسی زبان کے سیکھنے کی ضرورت ہوتی -

چونکہ تقدیر برسر یاری تھی لہذا برٹش گورنمنٹ نے بھی ہندوستان مین فروغ پاتے ہی اپنا مربی گری کا ہاتھ اسکے سر پر رکھدیا - سرکاری دفترون مین رواج پانے کے ساتھ ملکی آئین و قوانین بھی اسی زبان مین شایع ہونے لگے - پوسٹ آفس کی ترقی نے اسے اور آگے بڑھایا - اور تھوڑی ہی مدت میں یہ حالت کردی کہ ڈاک خانون کے ذریعے سے جتنی مراسلت ہوتی ہے اُس کا شاید دو ثلث حصہ صرف اُردو زبان مین ہوگا -

برٹش آزادی نے جب اخبارات جاری کرائے تو اُسکو اور فروغ ہوا - انشا پردازی کے مختلف رنگ پیدا ہوے - پرانی قافیہ بندی متروک ہو گئی - مرادف

الفاظ لانا بے مزہ سمجھا جانے لگا۔ اور انگریزی و عربی نیز سنسکرت سے مدد لی گئی۔ اور اس مین نئے نئے محاسن اور طرح طرح کی جدید خوبیان پیدا ہونے لگین۔ رہی یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ اُردو اخبارون کو اُتنی کامیابی نہین ہے جتنی کہ بنگالی یا مرہٹی اخبارون کو ہے۔ اس کا سبب یہ نہین ہے کہ اُردو زبان مین کسی قسم کا نقصان ہے یا اس مین کسی بات کی کمی ہے۔ بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اُردو مین ٹائپ کا رواج نہ ہوسکا۔ اور اب تک بعض لائق اور روشن خیال لوگ یہ سمجھ رہے ہین کہ لیتھوگراف اُردو کے لیے بمقابل ٹائپ کے زیادہ موزون ہے۔ حالانکہ یہ سخت غلطی ہے۔ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک ٹائپ کو عام رواج نہ دیا جائے گا اُردو لٹریچر پوری ترقی نہین کرسکتا۔ اور نہ اُردو اخبارات فروغ پاسکتے ہین۔

خیر اُردو زبان بہت تیزی کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کررہی تھی کہ بدنصیبی سے اُردو ہندی کا جھگڑا پیدا ہوا۔ اور ہندوستان کی شامت اعمال سے ہندو مسلمانون مین جو تعصب پیدا ہوگیا ہے اُس نے اس جھگڑے کو بڑھانا اور طول دینا شروع کردیا۔ ایک طرف ہندوؤن کی ایک جماعت یہ کوشش کرنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی کہ ہندی کو اُردو کا مقابل بنائے۔ اور اُسے جس طرح ممکن ہو ہندوستان مین فروغ دے۔ تاہم اس وقت تک خود ہندوؤن کی جماعت کثیر اُردو ہی کی طرفدار تھی۔ مگر اُس خاص جماعت نے اپنی کوششین برابر جاری رکھین کہ اسی اثنا مین سر انٹونی مکڈانل نے ہندی کو بھی سرکاری دفاتر مین داخل کرادیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان مین ہر طرف ایک آگ سی لگ گئی۔

مسلمانون کو جو اُردو کے طرفدار تھے ضرورت تھی کہ اس موقع پر نہایت ہوشیاری اور عاقبت اندیشی سے کام لیتے۔ مگر اُنھون نے انتہا درجے کی ناعاقبت اندیشی ظاہر کی۔ اُردو زبان کو اپنا مذہبی یا قومی ورثہ قرار دیا۔ اور اسی طرح اُردو زبان کے لیے لڑنے لگے جس طرح اپنے دیگر مذہبی حقوق کے لیے لڑتے تھے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اُردو زبان ہندوستان مین ہندو مسلمان دونون کے میل جول اور اختلاط و ارتباط کا نمونہ ہے۔ ان دونون

مذہبون کی بے تعصبی اور دونون کے باہمی میل جول اور اختلاط و ارتباط کا نمونہ ہے - ان دونون مذہبون کی بے تعصبی اور دونوں کے میل جول کی اگر کوئی زندہ یادگار دنیا مین بتائی جا سکتی ہے تو وہ صرف اُردو زبان ہے - اس سے جیسا تعلق عربی فارسی کو ہے ویسا ہی سنسکرت اور بھاشا کو ہے - بلکہ سچ پوچھیے تو سوا خاص الفاظ و لغات کے جو عربی و فارسی سے لیے گئے ہین عام بندشین - ضمائر و صفات، تذکیر و تانیث - اور افعال کے اشتقاق سب بھاشا سے اخذ کیے گئے ہین - ایسی صورت مین اُردو شایستہ، سلجھی اور زیادہ صاف کی ہوئی ملکی زبان ہے - اور اُس پر جتنا حق مسلمانون کا ہے اُتنا ہی ہندوؤن کا ہے جس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ جس طرح اس زبان مین مسلمان شعرا و مصنفین ہوے ہین اُسی طرح ہندو شعرا و مصنفین ہوے ہین - جب ہندوؤن مین دیا شنکر نسیم اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ایسے ہندو شاعر اور مصنف موجود ہین تو پھر کیا وجہ کہ اس زبان کو خاص مسلمانون کی زبان کہا جائے۔

باقی رہی یہ بات کہ شعرا و مصنفین اُردو مین مسلمانون کی تعداد زیادہ ہے - اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اگلے زمانہ مین مسلمانون کی حکومت تھی - لٹریری مذاق اُن مین زیادہ تھا اس لیے اُن مین ایسے لوگ زیادہ پیدا ہوے - اُردو پر کیا منحصر ہے ہندی زبان مین بھی ہندو شعرا کم گذرے ہین - جس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہین ہو سکتا کہ درباری تعلقات کم ہونے کی وجہ سے اُن مین تصنیف و تالیف اور شعر و سخن کا ذوق ہی کم تھا - بہر تقدیر اُردو کے ساتھ ہندو و مسلمانون کے تعلقات یکسان اور ایک ہی قسم کے تھے - اور اس پر اپنے حقوق ثابت کرنے اور اُسکو اپنا بنانے کا جیسا حق مسلمانون کو ہے ویسا ہی ہندوؤن کو ہے - مگر مسلمانون نے غلطی و نادانی سے اس زبان کو اپنی زبان بنایا اور اُن ہندوؤن کو بھی توڑ کے خلاف کر دیا جو اُردو کی ہمدردی و طرفداری کو تیار و آمادہ تھے - اور لطف یہ کہ اس غلطی کی آخر تک اصلاح نہ کی گئی - اور مسلمان اخبارات تین سال گذر جانے پر آج بھی اُسی طرح اس مسئلہ کو ایک قومی مسئلہ کی طرح چھیڑ چھیڑ کے لڑتے جاتے ہین - اور تعصب کو روز بروز بڑھا کے اُردو کو بجاے فائدہ

پہونچانے کے اور نقصان پہونچا رہے ہین۔
اب یہ ہندو مسلمانون کا اختلاف ایک طرف ڈال کے خود مسلمانون کی اندرونی حالت کو دیکھیے تو اور زیادہ افسوسناک حالت نظر آتی ہے۔ اُردو کے متعلق دہلی و لکھنؤ کے جھگڑے مدت سے چلے آتے تھے۔ دہلی والے اس کے پہلے موجد اور پہلے ترقی دینے والے تھے۔ اس پچھلی صدی مین جب لکھنؤ کا دربار زیادہ چمک گیا۔ دہلی کے تمام اساتذۂ زبان کھنچ کھنچ کے لکھنؤ مین چلے آئے۔ اور شاعرانہ مذاق نے لکھنؤ مین عروج حاصل کرتے کرتے ناسخ و آتش کے ایسے شعرا۔ انیس و دبیر کے ایسے مرثیہ گو۔ اور نواب مرزا شوق۔ و پنڈت دیا شنکر نسیم کے ایسے مثنوی لکھنے والے اور مرزا رجب علی بیگ سرور کے ایسے نثار خاک لکھنؤ سے پیدا کیے تو لکھنؤ والون نے اپنے آپ کو دہلی کی خوشہ چینی و تقلید سے آزاد کر کے خود اُستادی و ایجاد کا دعویٰ کیا۔ اسی وقت سے اُردو کے دو جداگانہ اسکول قرار پا گئے۔ ایک دہلی کا پُرانا اسکول اور دوسرا لکھنؤ کا نیا اسکول۔ لکھنؤ سے پورب کی طرف جہان تک چلے جائیے تمام شعرا عموماً لکھنؤ کے اسکول کے مقلد ملین گے اور مغرب کی طرف جہان تک بڑھیے دہلی کے اسکول کا اثر بڑھتا ہوا نظر آئیگا۔ مگر باوجود اس اختلاف کے ہندوستان کے دیگر شہر والون کو اس قدر ضرور تسلیم کر لینا پڑا کہ اُردو کا ایک اسکول لکھنؤ بھی ہے عام اس سے کہ وہ اس کے پیرو ہون یا نہ ہون۔

اس اختلاف نے ابتدائی بڑے بڑے جھگڑے پیدا کیے۔ اور ایک مدت سے عام طور پر یہ حالت چلی آتی ہے کہ چاہے ہندوستان مین کوئی شہر ہو اگر وہان دو چار شاعر بھی موجود ہین تو لکھنؤ اور دہلی کی رقابت کا جھگڑا سخت تعصب کی شان سے ضرور چھڑ گیا۔ اور شاعرے کشتی کے دنگل بن گئے۔ یہ اختلاف شعر و سخن کی ترقی اور زبان کے زیادہ سنجھنے اور زیادہ شایستہ بننے کے لیے شاید کسی حد تک مفید ثابت ہوتا۔ مگر اس سے خود دہلی اور لکھنؤ والون مین ایک نہایت ہی سخت عیب پیدا ہو گیا۔ جو زبان اُردو کو بجائے ترقی دلانے کے مٹا کے خاک کر دینے والا ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح کوئی کمظرف آدمی تھوڑی سی دولت ہاتھ آ جانے پر

آپے سے باہر ہو جاتا ہے اُسی طرح ان لوگون نے اپنی اس فوقیت پر اسقدر ناز کرنا، بلکہ یہ کہون گا اترانا شروع کیا کہ سمجھنے لگے گویا ساری دنیا نشیب مین ہے اور یہ کسی اونچی جگہ پر بیٹھے ہوے ہین۔ انگریزی زبان خاص انگلستان اور اُس مین بھی لندن کی ہے مگر کبھی لندن والون نے امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ کے مصنفون کا کبھی ایسا ناطقہ بند کیا ہوگا جیسا کہ ان لوگون نے ہندوستان کے اُردو والون اور اُردو لکھنے والون کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ عرب مین اہل حجاز اور خاصتہً قریش کو فصاحت و بلاغت کا دعویٰ تھا۔ مگر جاہلیت اور اسلام دونون زمانون مین شعرائے عرب کے لیے یہ قید نہ تھی کہ صرف قریش یا اہل مکہ مین سے ہون۔ ان مین مضری و نزاری شعرا بھی تھے اور یمانی شعرا بھی تھے۔ کوئی بنی طے مین سے تھا، کوئی بنی شیبان مین سے۔ کوئی یمن کا تھا اور کوئی نجد کا۔ کوئی بنی کندہ سے علاقہ رکھتا تھا اور کوئی آل غسان سے۔ وہ عموماً ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے، اپنی اور اپنی قوم کی فوقیت جتاتے تھے مگر یہ نہ کہتے تھے کہ چونکہ فلان شاعر قریشی نہین ہے لہذا اُسکے کلام کا اعتبار نہین۔ اب اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ قرآن اگرچہ قریش کی زبان مین اُترا تھا مگر دیگر قبائل کی زبانون کے بھی مستند مانے جانے ہی کی وجہ سے قرآن کی مختلف قرائتین ہو گئین۔ یہی حال فارسی کا ہے۔ پہلے شیراز فصاحت کا سرچشمہ تھا اور اب طہران کو اُس کی رقابت کا دعویٰ ہے۔ مگر شعرائے ایران نے سارے ملک کے شعرا کو بلا استثنا و امتیاز اُن کی لیاقتون کے اعتبار سے مستند و معتبر مانا ہے۔ اور کبھی یہ بات زبان سے نہ نکالی کہ چونکہ فلان شاعر شیراز یا طہران کا نہین ہے لہذا اُس کا اعتبار نہین کیا جا سکتا۔

یا تو مذکورۂ بالا ترقی یافتہ زبانون کے شعرا اور سخن سنجون کی یہ وسیع الخیالی ہے یا ہمارے دہلی اور لکھنؤ کے شاعرون کی یہ تنگ نظری ہے کہ اُنکے شہر کی چاردیواری سے جو باہر ہو وہ چاہے محنت کرتے کرتے مرجائے اور چاہے زبان ہی کی تحصیل مین جان دیدے مگر اُنکے نزدیک وہ اس قابل ہی نہین کہ اُس کا کلام دیکھا جائے یا اُس پر اعتبار کیا جائے یا زبان پر اُس کا کوئی حق سمجھا جائے۔

ان کے خیال مین بسی ہوئی ہے کہ انکے شہر کا جاہل بھی دیگر مقامات کے اُن شاعرون سے بدرجہا بہتر ہے جو اپنی ساری زندگی شعر و سخن کی نذر کر دین۔

اسکے ماننے مین کسی کو عذر نہین ہو سکتا کہ یہ لوگ ایک فصیح و شایستہ زبان آغوش مادر مین سیکھ لیتے ہین اور انکو ایک خاص لب و لہجہ حاصل ہو جاتا ہے جو دوسرون کو نہین نصیب ہو سکتا۔ مگر الفاظ کی تحقیق اور بندش۔ خیالات کے عمدگی سے ادا کرنے کا سلیقہ اُسی شخص کو آئے گا جو محنت کرے گا اور اُسی حد تک آئے گا جہان تک محنت کرے گا عام اس سے کہ وہ دہلی کا ہو یا لکھنؤ کا۔

انگریزی زبان کی آمیزش، عام صاحبان علم مین انگریزی مذاق کے پیدا ہو جانے۔ کتب قانون کے اُردو مین ترجمہ ہونے اور اخبارات کے مختلف شہرون مین جاری ہونے کا اب یہ نتیجہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اُردو زبان بدل گئی اور بدلتی جاتی ہے۔ جو زبان اب رواج پا گئی ہے اور جس کو ترقی ہو رہی ہے وہ سچ پوچھیے تو نہ لکھنؤ کی ہے اور نہ دہلی کی۔ بلکہ وہ ایک عجیب ملی جلی اور نئی ترکیبون اور نئی بندشون کی زبان ہے۔ اُسکے لکھنے کے لیے بغیر جدید مذاق کی تعلیم پائے نہ دہلی والے قلم اُٹھا سکتے ہین اور نہ لکھنؤ والے۔ بلکہ میرا تو یہ تجربہ ہے کہ یہ لوگ اس زبان سے بمقابل دیگر مقامات کے لوگون کے زیادہ نا آشنا ہین۔

وہ دہلی اور لکھنؤ کے پُرانے شاعرانہ اور لٹریری دنگل فنا ہو گئے۔ یہ شہر نہ علم و فضل کے مرکز رہے اور نہ تعلیم و ترقی کے۔ دہلی ایک محدود درجے کی تجارت کا مستقر بنا ہوا ہے لکھنؤ کو یہ بھی نہین نصیب۔ اب تو علمی مرکز حیدرآباد اور علی گڑھ وغیرہ ہین۔ یا اخبارات کی ترقی اور پنجاب یونیورسٹی کی اورینٹل شاخ کی وجہ سے لاہور ہے۔ اور انھین شہرون مین علم و فضل کو ترقی ہو رہی ہے حیدرآباد اگرچہ پہلے بہت پیچھے تھا مگر اب شاعرانہ مذاق کے بڑھنے اور اکثر اُردو جاننے والون کو اطمینان و فارغ البالی حاصل ہونے کی وجہ سے بہت ترقی کر رہا ہے۔ اور ادھر آخری چند برسون مین وہان شاعری کا بہت اچھا ڈولیمنٹ ہوا ہے۔ مولانا شبلی کی کوشش سے انجمن ترقی اُردو کا مستقر وہی قرار پا گیا ہے۔ جن

مین یہ نہین کہتا کہ ان شہرون کی زبان دہلی اور لکھنؤ کی زبان سے فصا

اور صحت مین بڑھ گئی ہے۔ لیکن اگر زمانہ کا یہی رنگ اور زبان کی یہی رفتار رہی تو پوری طرح پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ عنقریب کسی زمانے مین حیدرآباد، علیگڑھ اور لاہور زبان کی ترقی کے مرکز بنین گے اور یہی شہر صحیح و فصیح زبان کے معیار ہون گے۔

لیکن ابھی تک زبان کے مرکز دہلی اور لکھنؤ ہی بنے ہوے ہیں۔ اور اُنکو یہ فوقیت اور فخر حاصل ہے کہ صحت مین انکی سند مانی جاتی ہے۔ اور جب کوئی مسئلہ زبان کے متعلق پیدا ہوتا ہے تو عموماً انھین شہرون کے شعرا کی جانب لوگ رجوع کرتے ہین۔ ان شہرون کے لوگون کا فرض تھا کہ اپنی اس فضیلت پر خوش ہو کے کوشش کرتے کہ زبان کو ہر جگہ وسعت اور ترقی حاصل ہو اور اُردو سارے ہندوستان کی زبان بنتی جائے۔ مگر بجاے اسکے جانتے ہین کہ دہلی و لکھنؤ کے باہر جو کوئی اُردو مین گفتگو کرتا ہو اُس پر ہنسین۔ قہقہے اُڑائین۔ اور زور چلے تو اُسکی زبان بند کر دین۔ اور دعوی کرین کہ سوا اُنکے اور کوئی اُردو مین شعر و سخن کہنے کا مجاز ہی نہین ہے۔ کیونکہ جب یہ ہر شہر والے کی نسبت خیال رکھتے ہین کہ اسے کبھی اُردو آ ہی نہین سکتی تو پھر ظاہر ہے کہ گویا اُس کی زبان بند کرنے ہی کی کوشش کر رہے ہین۔

افسوس کہ یہ مضمون ناتمام رہ گیا۔ آیندہ نمبر مین ہم یہ بھی بتائین گے کہ اختلاف مذاق اور لٹریچر کے مختلف اغراض کے مصنفون نے اسے کس طرح کشمکش مین ڈال رکھا ہے۔ اور ترقی کی اصلی تدبیر کیا ہے۔

اُردو و لٹریچر

انگریزی دانون یا اُن لوگون کو جو آج کل کی اصطلاح مین تعلیم یافتہ تسلیم کیے جاتے ہین، اپنی مادری زبان اُردو کے متعلق سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ بہت ہی محدود زبان ہے۔ اور نازک خیالات یا اعلیٰ مضامین اُس مین نہین ادا کیے جا سکتے۔ اور انشا پردازی جیسے کمالات اور جیسی خوبیان انگریزی یا دیگر زبانون مین پیدا کر سکتی ہے اُردو مین نہین پیدا کر سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اُردو باوجود ان ترقیون کے جو اُسے اگلے اور پچھلے دورون مین حاصل ہوتی رہین نہایت ہی بدنصیب زبان ہے۔ پچاس سال پہلے جب ہندوستان مین عربی و فارسی کا نہ دور دورہ تھا خود اُردو بولنے والون اور صاحب علم اہل زبان کا یہ خیال تھا کہ عربی و فارسی کے سامنے اُردو کوئی وقعت نہین رکھتی۔ فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ عربی ہے اور اُس سے تھوڑا بہت فیض قابلیت اگر کسی زبان کو حاصل ہوا ہے تو وہ فارسی ہے جس کے لٹریچر مین غیرمعمولی شیرین زبانی۔ اور جس کی نظمون مین بہت ہی اعلیٰ درجے کی نازک خیالی و بلندپروازی موجود ہے۔ غرض اُنکے مذاق مین جو کچھ خوبیان تھین عربی و فارسی کے لٹریچر مین تھین۔ اُردو کوئی چیز نہ تھی۔

اب عربی و فارسی مذاق کے ختم ہونے کے بعد جب انگریزی کا دور شروع ہوا اور ہمارے تعلیم یافتہ مغربی مذاقِ سخن سے آشنا ہوے تو اُنھون نے عربی و فارسی کو تو یہ کہہ کے خارج از بحث کر دیا کہ ہم اُن زبانون سے واقف نہین۔ مگر بمقتضائے "مادہ بر عضوِ ضعیف می ریزد" اُن کی اعلیٰ تعلیم اور مسلم الثبوت قابلیت کا سارا بار بھی غریب اُردو ہی پر پڑنا شروع ہوا۔ اور ہر طرف سے یہ صدا بلند ہوئی کہ اردو نہایت ہی ناقص زبان ہے۔ اس مین نہ انگریزی کی سی فصاحت و بلاغت ہے اور نہ مغربی مذاق سخن کی سی دلفریبیان۔

خلاصہ یہ کہ بدنصیب اُردو جس طرح پہلے دور مین بدنام تھی اُسی طرح اِس دَور مین بھی بدنام ہے۔ جیسے اگلے دنون صدہا شعرائے سخن سنج پیدا ہو جاتے۔ گھر گھر مشاعرون کی گرم بازاری ہوتے۔ میر۔ سودا۔ اور غالب و ذوق کے ایسے پیغمبرانِ سخن کے غزل سرائی کرتے۔ اور سرور کے ایسے جادو بیان نثار نے داد فصاحت دیتے پر بھی اُردو کوئی عمدہ اور قابل توجہ زبان نہ سمجھی گئی۔ ویسے ہی اب باوجود اس کے کہ دولت برطانیہ کی توجہ سے اُردو عدالت پر حکومت کر رہی ہے۔ تمام ملکی مراسلت اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ اُردو مین جاری ہے۔ آزاد۔ مولوی نذیر احمد۔ اور سرسید کے سے جادو بیان نثار۔ حالی کے سے معجز نما شاعر۔ مولوی شبلی کے سے مورخ اپنے زور قلم کے جادو دکھا رہے ہین۔ شہر شہر اور قصبے قصبے مین اُردو کے مدارس

جاری ہین - اور کوئی فن نہین جس کے متعلق کوئی نہ کوئی کتاب اُردو مین نہ شایع ہو گئی ہو- تعلیم یافتہ جماعت یہی کہہ رہی ہے کہ اُردو کی کچھ ہستی نہین - نہ اُسکی نظم مین کوئی مزہ ہے نہ اُس کی نثر مین کوئی خوبی ہے -

الحاصل اُردو پہلے بھی مظلوم تھی اور اب بھی ہے - اور اُس پر ظلم کرنے والے خود وہ لوگ ہین جو اُردو کے اہل زبان ہونے کے مدعی ہیں -

ہر کس از دست غیر نالہ کند سعدی از دستِ خویشتن فریاد

لیکن اس کا سبب کیا ہے کہ اُردو پبلک کو دنیا بھر کی زبانون مین مزہ آتا ہے اور نہین آتا تو خود اپنی زبان مین - اس راز کا پتہ لگانے کے لیے ہم نے اکثر تعلیم یافتہ دوستوں سے سوالات کیے ہین - معلوم کرنا چاہا کہ آخر وہ کون سی خوبی ہے جسے یہ لوگ اُردو مین ڈھونڈھتے ہین اور نہین پاتے ؟ ہمین اپنے سوالون کے جواب مین جو کچھ معلوم ہو سکا وہ اسی قدر ہے کہ بعض حضرات کو تو انگریزی سے اُردو ترجمہ کرتے وقت ویسے جامع اور صحیح مفہوم ادا کرنے والے الفاظ نہین ملے جیسے انگریزی مین تھے - بعض حضرات انگریزی کے سے اشعار اُردو مین ڈھونڈھتے ہین اور وہ اُردو مین معدوم ہین - اور جن چند انگریزی نظمون کے ترجمے اُردو مین کردیے گئے ہین اُن میں وہ انگریزی کی سی بات نہین - غالباً اسی قسم کے نقصانات عربی مذاق رکھنے والے سلف صالح کو ہون گے کہ عربی سے اُردو مین ترجمہ کیجیے تو ویسے جامع و حاوی الفاظ نہین ملتے - اور اُردو شاعری مین عربی شعر و سخن کی خوبیان نہین ہین -

لیکن اگر یہی اعتراضات ہین اور اسی قسم کی رائین قائم کرنے کی بنیاد اسی قدر ہے تو میرے خیال مین اُردو زبان تو اتنی تنگ اور محدود نہین - مگر خود اُنکے خیالات مین تنگی اور کج فہمی ہے - اور اس کا الزام بجاے اسکے کہ زبان اُردو کو دیا جائے خود اُنکی لیاقت و قابلیت پر عائد ہوتا ہے -

دنیا کی ہر زبان کا قاعدہ ہے کہ اُس مین گرد و پیش کی چیزون - بولنے والون کی صحبتون - اور اُنکے عادات - اطوار - معاملات کے لحاظ سے اس قسم کے خاص الفاظ ہوا کرتے ہین جو تمام پہلوون اور جملہ مفہوماتِ متعلقہ کے اعتبار سے بےمثل و نظیر

ہوتے ہین اور اُنکے مماثل الفاظ جو تمام جہتوں اور کل حیثیتون سے اُنکے مماثل ہون دنیا کی کسی دوسری زبان مین نہیں مل سکتے۔ ایسے ہی الفاظ ہین جن کی مناسبتون اور خوش ترکیبیون سے اُس زبان کا لٹریچر بنتا ہے۔ اُنھین کے ضمنی اشارون اور اُنھین کے لوازم و تعلقات سے شاعرانہ خوبیان پیدا ہوتی ہین اور فصاحت و بلاغت کا جوہر جمکتا ہے۔

یونانی۔ لاطینی۔ سنسکرت۔ عربی۔ فارسی۔ فرانسیسی۔ یا انگریزی کی تخصیص نہین۔ ہر معمولی سے معمولی زبان مین بھی اس قسم کے الفاظ کثرت سے موجود ہوتے ہین جن کے تناسب سے کبھی رعایت لفظی کی خوبیان پیدا ہوجاتی ہین اور کبھی رعایت معنوی کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ کسی زبان کے اعلیٰ درجے کے اشعار اور عمدہ نثرون کا ترجمہ کسی دوسری زبان مین (چاہے وہ کوئی ہو) نہین ہو سکتا۔

موجودہ مذاق کے جو تعلیم یافتہ حضرات اُردو کی بے مایگی کے اس لیے قائل ہوگئے ہون کہ اُنھین کسی انگریزی فصیح و بلیغ کتاب کا ترجمہ کرنے مین دشواریان پیش آئین (گو ہمین اُن کی مصیبت سے پوری ہمدردی ہے۔ اور افسوس کہ اُن کی اس مشکل کو ہم دُور بھی نہین کر سکتے مگر اُس کی غلط خیالی کی اس طرح اصلاح ضرور کرسکتے ہین کہ) اگر اُن مین قابلیت ہو تو کسی با محاورہ اور فصیح اُردو عبارت کا ترجمہ انگریزی مین بھی کرکے دکھین۔ اور انصاف سے بتائین کہ اُردو زبان مین ترجمہ کرنا مشکل ہے یا انگریزی زبان مین؟ جتنی دشواریان اُردو ترجمہ کرتے وقت پیش آیا کرتی ہین اُن سے زیادہ یا کم از کم اُتنی ہی انگریزی ترجمہ کرنے مین بھی پیش آتی ہین یا نہین؟ یہ امر سب کو گران گذر رہا ہے کہ شیکسپیر کے کسی ڈراما کا ویسا ہی بامزہ ترجمہ اُردو مین باوجود متواتر کوششون کے نہ ہوسکا۔ مگر اسکی طرف کسی کا خیال نہین گیا، کہ مثنوی میر حسن، اور مثنوی گلزار نسیم کے دو چار شعرون۔ یا فسانۂ عجائب کی چند سطرون کا انگریزی ترجمہ کرنے کی کسی کو جرأت بھی ہوسکی یا نہین؟ مگر افسوس تعلیم یافتگی کا موجودہ مذاق ایسا ہے کہ کیا عجب جو یہ بھی کوئی اُردو ہی کا عیب نہ تصور کرلیا جائے۔ اور صاف الفاظ مین کہہ دیا جائے کہ اُردو ایسی بیہودہ اور ناقص زبان ہے کہ اُس مین انگریزی لٹریچر کی خوبیان نہ پیدا

ہو سکنے کے علاوہ یہ بھی عیب ہے کہ اُس کی بیوہ گیان انگریزی الفاظ مین کسی طرح نہین ادا ہو سکتین۔

الغرض یہ جتنے اعتراضات ہو رہے ہین اور اُردو کے جتنے عیوب بتائے جا رہے ہین خود معترضون کے نقصانات اور اُنکی خام خیالیان ہین۔ اور موجہ طور پر اُردو کا کوئی سچا عیب نہین بتایا جا سکتا۔ مگر ہمین ابھی یہ معمہ حل کرنا باقی ہے کہ اگلے دنون خود اُردو کے اہل زبان عربی دانون کے خیال مین اُردو اس قدر حقیر کیون تھی؟ یا آج کل ہمارے اہل زبان انگریزی دانون کے نزدیک وہ اس قدر بے مایہ اور ناقص کیون ہے؟

اصل یہ ہے کہ لٹریری ذوق بھی منجملہ اُن مذاقون کے ہے جن کو انسان کوشش کر کے اپنی طبیعت مین پیدا کیا کرتا ہے۔ جیسے کہ حقّے اور تمباکو کا ذوق ہے کہ فطرۃً انسان اُسکو پسند نہین کرتا۔ مگر چند روز تک اپنے آپ کو اُس کا عادی بنا لینے کے بعد پھر اُسے معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان چیزون مین کیا ذوق ہے۔ صرف اسی تنبا کو پر موقوف نہین۔ غور کیا جائے تو انسان کے تمام ذوق اُسکے کسبیہ ہوا کرتے ہین اور اسی کسب نے مختلف ممالک مین اختلاف مذاق پیدا کر دیا ہے۔ ہر قوم اور ہر ملک کی لذیذ غذائین۔ دماغ معطر کرنے والی خوشبوئین۔ نظر فریب خوبصورتیان۔ سامعہ نواز آوازین۔ اور اسی کے ساتھ وضع قطع۔ لباس۔ اور سامان معاشرت کی سب چیزین بدلی ہوتی ہین۔ جو غذا مغرب مین لذیذ ہے، مشرق مین بدمزہ۔ جو عطر مشرق مین دماغ کو تازہ کر دیتا ہے اُسی کی خوشبو پر مغرب مین ناکین بند کر لی جاتی ہین۔ حتیٰ کہ ایک ملک کی معشوقۂ دلربا دوسرے ملک کی بدشکل اور بدقطع عورت ہے جسکے سایہ سے بھی لوگ بھاگتے ہین۔ اسی طرح ہر قوم اور ہر زبان کا لٹریچر بھی ایک نیا ذوق رکھتا ہے۔ اور ذوق صرف حاصل کرنے اور کوشش کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

اور اسی ذوق کے پیدا کرنے کے لیے ہر ملک مین پہلے خود وہان کی مادری زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور طلبہ جب اُس مین پختگی حاصل کر لیتے ہین تو اُن اعلیٰ درجے کی زبانون کی طرف متوجہ کیے جاتے ہین جو کلاسیکل سمجھی جاتی ہین اور علمی اور تاریخی عظمت رکھتی ہین۔ بخلاف اسکے ہندوستان کو بدنصیبی سے شاید ہی

ی وہ زمانہ نصیب ہوا ہو جبکہ ابنائے وطن کو وہ زبان سکھائی جاتی ہو جو وہاں
ی جاتی تھی۔

شاید کبھی ہندوستان میں ایسا ہو کہ سنسکرت بولی بھی جاتی ہو اور پڑھائی بھی
تی ہو۔ مگر خود ہندوؤں کو اس سے انکار ہے۔ اس لیے کہ اُنکے خیال میں سنسکرت
وتاؤں کی زبان ہے۔ اور کبھی انسان کی مادری زبان نہ تھی۔ جن انگریزی مورخین
ے اُسے آریہ فاتحین کی زبان ثابت کیا ہے اگر اُنکی تحقیق مان لی جائے تو تاریخی
ہد سے پیشتر اُس قدیم متبرک زمانے میں بھی صرف فتحیابوں اور حاکموں کی زبان
ی۔ ہندوستان کے لوگوں کی کوئی اور زبان ہوگی۔ جس سے نتیجہ نکل سکتا ہے کہ
س عہد میں بھی تعلیم سنسکرت کی ہوتی تھی۔ جو ملکی زبان نہ تھی۔ اور جس وقت مسلمانوں
ہندوستان کو فتح کیا ہے اُسوقت تو اس میں شک نہیں کہ مادری زبان اور تھی اور
لیمی زبان اور۔ کیونکہ سارا لٹریچر سنسکرت یا ماگدھی میں تھا جو کہ ملکی زبانیں نہ تھیں۔

مسلمانوں کا عہد شروع ہونے کے بعد پہلے سے زیادہ خرابیاں پیدا ہوئیں
ی ہندوؤں کی تعلیمی زبان تو سنسکرت رہی۔ اور مسلمانوں کی تعلیمی زبان بلحاظ
ہب عربی اور بلحاظ حکومت فارسی ہوگئی۔ مگر وہ زبان جو ملک میں بولی جاتی تھی
ے تعلیم گاہوں میں ہرگز جگہ نہ مل سکی۔ یہاں تک کہ بازاری میل جول اور ہندو مسلمانوں
ے امتزاج نے اُردو زبان پیدا کی۔ لیکن تعلیم آخر تک فارسی و عربی ہی میں ہوتی رہی۔
ی کیفیت تھی کہ انگریزی عہد شروع ہوا اور فارسی کی جگہ انگریزی کی تعلیم ہونے لگی۔
ب یہ ہوا کہ مذہبی اور قومی ضرورتوں کے لیے مسلمانوں نے فارسی۔ اور عربی کو اور
ہندوؤں نے ہندی و سنسکرت کو اختیار کیا۔ اور حکومت کی زبان انگریزی ہوگئی۔
ردو جو ملک کی مادری زبان ہے اُسکی طرف سے اب بھی بے پروائی رہی۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برٹش گورنمنٹ نے اُردو زبان کو ممالک متحدہ
غیرہ کی مادری زبان تصور کر کے ہندوستان کے قدیم رواج کے خلاف سرکاری اور دفتری
زبان بنا دیا۔ جس کی وجہ سے عام طور پر خط و کتابت اُردو میں ہونے لگی۔ اخبارات
بھی اُردو میں جاری ہوئے اور تصنیف و تالیف کے لیے بھی اُردو ہی اختیار کی
جانے لگی۔ سرکار نے اُس کا یہ فروغ دیکھ کے دیہات اور قصبات میں اُردو کی

تعلیم بھی جاری کر دی - مگر اول تو وہ تعلیم اس قدر ناقص اور ناتمام درجے تک تھی
کہ اُس سے طلبہ مین کوئی لٹریری ذوق نہین پیدا ہو سکتا تھا - دوسری طرف ہندو
مسلمانون مین ایسا اختلاف ہوا کہ ہندوون نے ہندی کو اپنی مادری زبان بتایا جو
اگرچہ بھی تھی تو چند روز کی کوششون سے اُن کی مادری زبان بن گئی - اور اُردو
صرف مسلمانون کی زبان سمجھی جانے لگی - ان دونون باتون کا یہ نتیجہ ہے کہ اُردو کی
تعلیم کی طرف جو عام رجحان تھا اُسے نقصان پہونچنے لگا - ہر حال اُردو کی جیسی
تعلیم ہونی چاہیے تھی نہین ہوتی - اور اُردو خوانون مین کسی قسم کا ذوق انشاپردازی
پیدا ہونے نہین پاتا

علاوہ برین محض اُردو خوان ایک طرف انگریزی دانون کے مقابل ہین اور
دوسری طرف عربی فارسی جاننے والون کے مقابل اس قدر کم حیثیت تصور کیے
جاتے ہین کہ اُنکی راؤن - اُنکے خیالون اور اُنکے مذاق کی ذرا بھی وقعت نہین ہوتی
جاہلون سے وہ کچھ یون ہی سے ممتاز خیال کیے جاتے ہین جنھون نے ابتدا سے
انتہا تک انگریزی یا عربی و فارسی لٹریچر کی باضابطہ طریقے سے تعلیم پائی ہے - اور
جنھون نے اپنے دل و دماغ مین انگریزی یا عربی کے مذاق سخن کو پرورش کر کے خوب
راسخ کر لیا ہے -

یہ لوگ ابتدا ہی سے انگریزی اور عربی کی نحو و صرف اور فصاحت و بلاغت کو
محنت اور توجہ سے حاصل کر لیتے ہین - اور علوم پڑھتے ہین اُن سب کو انھین زبانو
مین سیکھتے اور درجۂ کمال حاصل کرتے ہین - جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ [illegible] انگریزی
لٹریچر کے دلدادہ ہو جاتے ہین یا عربی لٹریچر کے - اپنی مادری زبان [illegible]
کے زمانے مین کوئی اُنس نہین پیدا ہونے پاتا - اگر کبھی [illegible]
زبان کی طرف توجہ بھی کرتے ہین تو چاہتے ہین کہ اُس مین بھی اُنکو وہی لطف آئے
جو انگریزی یا عربی و فارسی مین آتا تھا مگر وہ لطف نہین حاصل ہو سکتا - کیونکہ اُنکو جو
لیاقت و قابلیت پیدا ہوئی ہے یا جس زبان مین اُنھون نے لیاقت و شائستگی کو
دیکھا وہ عربی ہے یا انگریزی - لہذا خواہ مخواہ اپنی مادری زبان یعنی اردو ہی کو الزام
دینے لگتے ہین کہ بہت ناقص زبان ہے اور اس مین کسی قسم کے علمی مضامین نہین

ادا ہو سکتے -

خلاصہ یہ کہ اُردو زبان کو جو صحیح ترقی نہین ہوتی اور خود اپنے اہل زبان کاملین مین اسے مقبولیت نہین حاصل ہوتی اُس کا اصلی سبب یہی ہے کہ ابنائے وطن بجائے مادری زبان کے کسی اور زبان کے لٹریچر کو خوب پرورش کرکے اپنا اصلی مذاق بنا لیا کرتے ہین - یورپ مین جو تم دیکھتے ہو کہ ہر ملک اور ہر قوم کا لٹریچر روز افزون ترقی کرتا جاتا ہے اور انگریزی - فرانسیسی - جرمنی - اور اٹیلی زبانون کا لٹریچر بڑھتے بڑھتے ساری دنیا پر چھایا جاتا ہے - اور دنیا کی دوسری قومین اُن کی خوبیون کے مقابل خود اپنی زبانون کو بھولی جاتی ہین - اس کا اصلی باعث یہی ہے کہ اُن ممالک کے باشندے پہلے خود اپنی زبان کے لٹریچر مین کمال حاصل کرلینے کے بعد دوسری زبانون کی طرف توجہ کرتے ہین - وہان بڑے بڑے لنگوسٹ (ماہرین السنہ) اور اورینٹلسٹ (مستشرقین) اور فائلالوجسٹ (علم السنہ کے جاننے والے) پیدا ہوتے ہین - جو تحقیق کے ساتھ دنیا کی تمام زبانون پر اجتہادی نظر ڈالتے ہین - مگر یہ سب کمالات اُسوقت پیدا کرتے ہین جب اپنی زبان مین باکمال بن لیتے ہین اور اپنی زبان کے نحو و صرف اور علم ادب کا ذوق اُنکے دل و دماغ پر پوری طرح حاوی ہو چکتا ہے -

اس کا علاج یہ تھا کہ سررشتۂ تعلیم کے اُردو مدارس کی اصلاح کی جاتی - مگر افسوس کہ یہ غیر ممکن ہے - اُردو مدارس کی حالت سُدھارنے مین نہ آج تک کامیابی ہوئی اور نہ کامیابی کی اُمید ہے - اس لیے کہ سررشتۂ تعلیم ترقی تعلیم کا ذریعہ ہونے کے عوض اپنے خود غرض عہدہ دارون کے ہاتھون ایک اعلیٰ درجے کی تجارت گاہ بنگیا ہے اور اُنھین لوگون کی کتابین داخل درس کی جاتی ہین جو اپنے نفع مین عہدہ دارون کو شریک کرین - دکھانے کے لیے ایک بورڈ ہے - مگر بورڈ کے نفس ناطقہ ڈائرکٹر صاحب ہین جن کے اشارون پر بورڈ چلتا ہے اور ڈائرکٹر صاحب کی رائے دراصل اُنکے کسی معتمد علیہ ماتحت عہدہ دار سررشتۂ تعلیم کی رائے ہوتی ہے -

گو ہندو خود کہ رہے ہین کہ اُردو ہماری زبان نہین - وہ مسلمانون کی زبان ہے - مگر باوجود اسکے اکثر یہی نظر آیا کرتا ہے کہ سررشتۂ تعلیم کی اُردو کتابون کے مصنف و مولف ہندو ہی ہوتے ہین - یا کبھی مسلمان بھی ہوئے تو وہ جو سوا اسکے کہ سررشتۂ تعلیم

مین کسی خدمت پر ممتاز ہین - ملک مین اُنھین کوئی لٹرری وقعت نہین حاصل ہوتی - اسی خرابی کی وجہ سے اُردو نصاب تعلیم سے بدتر شاید کسی زبان کا نصاب نہ ہوگا - نحو وصرف اور معانی و بیان کے مفید رسالون کا تصنیف ہونا درکنار یہ سچ یہ ہے کہ آج تک اُردو کی الف بے بھی صحیح اصول پر مرتب نہ ہو سکی -

ایسی صورت مین اُردو کے درست ہونے کی کیا اُمید ہو سکتی ہے اور کس طرح سے ملک مین ملکی زبان کا سچا مذاق پیدا ہو سکتا ہے - بہر حال اُردو ایک فلاکت زدہ قوم کی مصیبت زدہ زبان ہے - اور جس حال مین اپنی قوم کو پاتی ہے اُسی کے مناسب طریقے سے نباہ رہی ہے -

اُردو لٹریچر

ایک بہت بڑی کمی ہمارے لٹریچر مین یہ بتائی جاتی ہے کہ اُردو مین اسوقت تک علمی مصطلحات کی بہت کمی ہے - اور ہم جس وقت کسی علمی مسئلہ کے متعلق یا کسی فن کے مسائل پر بحث کرنا چاہین تو مجبور ہین کہ اگر وہ کوئی قدیم علم و فن ہو تو عربی کی اصطلاحات اختیار کرین اور اگر کوئی نیا علم و فن ہو تو انگریزی کی اصطلاحات - کہا جاتا ہے کہ اہل عرب نے جب ان علوم کو لیا ہے تو خاص اپنی زبان مین سے اصطلاحی الفاظ تراش لیے تھے جسکی یہ برکت تھی کہ غیر زبانون کی غلامی سے آزاد ہو گئے - اور عربی بجائے خود ایک علمی زبان بن گئی - مگر ہم سوا دوسری زبانون کی خوشہ چینی کے اور کچھ نہین کر سکتے -

یہ کمی اس قدر محسوس کی جا رہی ہے کہ ہندو مسلمان دونون اس فکر میں ہین کہ اپنے اپنے مذاق کے مطابق علمی اصطلاحات تصنیف کرین - ہندو چاہتے ہین کہ ہندی مین کھپنے والے اصطلاحات ہون اور اُنکا ماخذ سنسکرت قرار دی جائے - مسلمان چاہتے ہین کہ اُردو کی مناسبت کے لیے عربی زبان ماخذ قرار دی جائے - اور جتنے اصطلاحات لیے جائین عربی سے لیے جائین - اسی دُھن مین دونون گروہ طرح طرح کی کوششین کر رہے ہین - کوئی چاہتا ہے کہ اصطلاحات کی ایک جدید کتاب لغت تصنیف کر کے شایع کر دی جائے - کوئی تھوڑے تھوڑے اصطلاحات

بنا کے اخباروں اور رسالوں مین شایع کر دیتا ہے تاکہ عام لوگ انکو اختیار کر لین اور وہی مصطلحات آیندہ علمی کتابون مین اختیار کیے جائین۔

جدید علوم جو اب نئے نئے یورپ مین پیدا ہوے ہین انکی اصطلاحون کے ترجمہ کی کوشش چندروز ہوے مصر مین بھی ہو رہی تھی۔ اور متعدد علمانے اپنی متحدہ کوشش سے اس قسم کے نئے عربی اصطلاحات تراش تراش کے وہان کے رسالون اور اخبارون مین شایع کرنا شروع کیے تھے۔ مگر سچ یہ ہے کہ سب لوگ عام اس سے کہ مصر کے ہون یا ہندوستان کے اور ہندو ہون یا مسلمان سب غلطی پر ہین۔ اور انکی یہ سب کوششین نقش بر آب ہین۔ نہ انکے تراشتے ہوے الفاظ زندہ رہ سکتے ہین اور نہ ان سے انکے لٹریچر کو کسی قسم کا نفع حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ ایک سامنے کا اور کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ لغت زبان کا تابع ہے نہ یہ کہ زبان لغت کے تابع ہو۔ جو الفاظ کسی زبان مین پیدا ہو چکے ہین عام اس سے کہ اس زبان کے اصلی الفاظ ہون یا کسی دوسری زبان سے لیے ہوے اُن کا استقرا اور استقصاء کر کے لغت مدون کیے جاتے ہین۔ مگر آج تک دنیا مین کبھی یہ نہین ہوا کہ الفاظ عام اس سے کہ مصطلحات ہون یا عام قسم کے کتب لغت سے لے کے تحریر و تقریر مین شامل کیے جائین۔ اصطلاحون کی تصنیف و ایجاد کا صحیح محل یہ ہے کہ ہر فن پر ایک کتاب تصنیف کی جائے اور اُس مین ضرورت کے مطابق نئے اصطلاحی الفاظ تراش کے کام مین لائے جائین۔ اور جب وہ کتابین اُس فن کے نصاب مین شریک ہو جائین تو اُن سے لیکے وہ مصطلحہ الفاظ لغت مین اضافہ کیے جائین۔

لیکن یہان ایسا نہین ہوتا اور نہ اس قسم کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسوقت تک جتنی کتابین علوم قدیمہ و جدیدہ کی اُردو مین لکھی گئین اُن سب مین عموماً یہی طریقہ اختیار کیا گیا کہ بجاے اسکے کہ اصطلاحات کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈھے جاتے عربی و انگریزی کے الفاظ بجنسہ نقل کر دیے گئے۔ جن سے صرف اردو جاننے والے نہ مانوس ہین اور نہ اُنھین صحیح طور پر زبان سے ادا کر سکتے ہین۔ اُن اصطلاحون کی غیر مانوسی کی وجہ سے علوم و فنون کی تعلیم ہندوستان مین کسی طرح عام نہین ہو سکتی۔ اور اُردو لٹریچر کے حامیون کو اپنے سامنے ایک ایسی دشواری نظر آتی ہے جو کسی طرح

ہٹائے نہیں ہٹتی۔

اس مشکل کا اصلی راز وہی ہے جو اسی مضمون کے پہلے حصہ مین بیان کر چکے ہین یہی اُردو تعلیم کا ناقص ہونا۔ اُردو مذاق کا مغلوب رہنا۔ خود اہل زبان کا اپنے وطنی لٹریچر سے مطمئن نہ ہونا۔ اور خاص اُردو زبان کے متعلقہ مسائل مین بھی اُردو دانون کے مقابل عربی و انگریزی جاننے والون کا اثر زیادہ ہونا۔ ہمارے سامنے سب سے آخری مثال عربون کی ہے۔ اُنھون نے جسوقت یونانی و رومی اور دیگر السنہ کے علوم و فنون کو اپنی زبان مین لیا ہے اُسوقت چند محدود مترجمین علوم تھے اور جس پبلک کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ کتب علوم کا ترجمہ کرتے اُسپر عربیت کا ذوق غالب تھا۔ اُس مین صرف اپنی مادری زبان کا جاننے والا دیگر السنہ کے ماہرین کے سامنے ذلیل و کم وقعت نہین تصور کیا جاتا۔ بلکہ وطنی لٹریچر کا اثر اس قدر غالب تھا کہ مترجمین اگر اُسکے خلاف یا اُس سے نامناسب روش اختیار کرتے تو اپنی کوشش مین سرسبز نہ ہوسکتے۔ اس لیے وہ مجبور تھے کہ ہر اصطلاح کے مقام پر کوئی عربی ہی لفظ اختیار کرین بلالحاظ اسکے کہ لغتہً وہ اصلی یونانی و رومی الفاظ کا پورا پورا ہم معنی ہو یا نہ ہو۔ جب وہ ایسے الفاظ کو اختیار کر لیتے تو کتاب کے مشہور ہوتے ہی وہ علمی دنیا مین مقبول ہو جاتے۔ اور اصل مین نہ بھی ہوتے تو اصطلاح قرار دیے جانے کے بعد اُن یونانی و رومی اصطلاحی الفاظ کے ہم معنے بن جاتے۔

خود اُردو زبان مین بھی ہمارے سامنے ایک اسی قسم کی نظیر موجود ہے۔ تعزیرات ہند اور دیگر کتب قوانین کا ترجمہ جب اُردو زبان مین کیا گیا اور گورنمنٹ نے چند قابل بزرگون کو اس خدمت پر مامور کیا تو اُنھون نے تمام قانونی مصطلحات کے لیے جو الفاظ مناسب معلوم ہوے تراش کے قائم کر دیے۔ گو ان الفاظ سے اُس سے پہلے کبھی اصطلاحون کا کام نہین لیا گیا تھا۔ اور پہلے پہل جب کام مین لائے گئے ہین بعض لوگون کو بھدے۔ گران۔ اور غیر مانوس معلوم ہوے ہونگے۔ مگر جیسے ہی وہ قانونی کتابین ملک مین پھیلین۔ عدالتون نے اُنکی طرف توجہ کی۔ وکلا اور اہل مقدمہ اُن سے کام لینے پر مجبور ہوے۔ وہ اصطلاحین بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئین۔

اور اُن میں نہ کسی قسم کی گرانی تھی اور نہ کسی طرح کی نامانوسی۔ اور چند روز بعد وہی الفاظ قانون کی کتابوں سے لیکے کتب لغت میں بھی درج کر دیے گئے۔

لہذا یہ کمی یون نہین پوری ہو سکتی کہ ان اصطلاحات کی ایک کتاب لغت تصنیف کر کے شایع کر دی جائے بلکہ انجمن اُردو یا دیگر حامی زبان انجمنوں کا کام بجائے لغتوں کے تصنیف کرانے کے یہ ہونا چاہیے کہ جن علوم و فنون کے اصطلاحات بنانا منظور ہون اُنھین کے متعلق جامع و مانع اور مختصر رسالے تصنیف کرا کے شایع کیے جائین اور اُن مین اصطلاحات کا ترجمہ مناسب الفاظ مین کیا جائے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مصطلحات کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہین بلکہ عربی سے علوم قدیمہ کے جو پُرانے اصطلاحات اُردو مین لیے جا چکے ہین وہ تو وہی برقرار رکھے جائین اور علوم جدیدہ اور خاصۃً سائنس کے لیے نئے اُردو یا عربی اصطلاحات پیدا کرنے کے بجاے انگریزی مصطلحات بجنسہ اُردو مین نقل کیے جائین۔ لیکن اس سے نہ اُردو کوئی علمی زبان بن سکتی اور نہ اُردو لٹریچر اپنی کوئی وقعت قائم کر سکتا ہے۔

علم طب کے متعلق کون کتاب یا کون سا مسئلہ ہے جس کا ترجمہ فارسی یا اُردو مین نہین ہو گیا۔ بلکہ مفردات اور نیز قرابادینون کے لحاظ سے دیکھو تو فارسی و اُردو کی تو تصنیف کتابین زیادہ حاوی اور جامع ہین۔ لیکن محض اس وجہ سے کہ طب کے تمام مصطلحات عربی کے ہین اس فن مین فارسی اُردو دونون عربی کی غلامی سے آزاد نہ ہو سکین۔ جو طبیب عربی زبان نہ جانتا ہو مستند اور با وقعت نہین مانا جاتا۔ حتی کہ یہ خیال ہر شخص کے ذہن نشین ہے کہ بغیر عربی پڑھے طب آ ہی نہین سکتی۔

اسی طرح اگر آپ سائنس کے متعلق اصطلاحات کو انگریزی سے بجنسہ نقل کر لین گے قطع نظر اس کے کہ علوم سائنس اُردو دان طلبہ کے لیے بالکل غیر مانوس اور ناقابل فہم رہین گے محض اُردو مین سائنس کی تعلیم پانے والون کا علمی دنیا مین کوئی اعتبار نہ قائم ہو سکے گا۔ اور ہمیشہ یہی سمجھا جائے گا کہ بغیر انگریزی پڑھے سائنس آ ہی نہین سکتا۔

بہر تقدیر حامیان اُردو کو اگر اُردو سے کسی قسم کا اُنس ہے تو اُن کا فرض ہے

کہ اُردو میں سائنس کے فنون کا ترجمہ کریں اور مصطلحات کے مفہوم کو خوب سمجھ کے اُنکی جگہ مناسب الفاظ عام اس سے کہ وہ اُردو کے ہوں یا فارسی کے یا عربی کے استعمال کریں۔ اگر اُن کتابوں کو ذرا بھی مقبولیت حاصل ہوئی (اور ضرور حاصل ہوگی) تو ہم کو یقین ہے کہ اچھے خاصے اصطلاحات بن جائیں گے اور اُردو چند ہی روز میں ایک علمی زبان بن جائے گی۔

ایسے مصطلحات کے کام میں لاتے وقت اس بات کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ الفاظ خوبصورت۔ موزون اور پوری طرح ہم معنی ہیں یا نہیں کیونکہ ابتداے استعمال کے وقت ہر خوبصورت سے خوبصورت لفظ بھی اس قدر پھوہڑا اور اُکھڑا ہوا معلوم ہوگا۔ اور یقین کرلو کہ یہ مصطلحات جس زبان میں قائم کیے گئے ہونگے پہلے پہل ایسے ہی بھونڈے اور غیر مانوس نظر آئے ہونگے۔ الفاظ و مصطلحات کو صرف استعمال مانوس اور خوبصورت بناتا ہے۔

عذر گناہ بدتر از گناہ (جون ۱۹۱۱)

آزادی۔ کج خلقی کا نام نہیں ہے۔ اور حق چاہے تلخ ہی ہو کوئی قابل تعریف نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی کی نسبت کوئی کلمہ نیر از دھوکے ہی میں سہی) زبان سے نکل گیا ہو تو اول تو ہمارے نزدیک اُسکے واپس لینے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہو سکتی اور اگر فرض کیجیے کہ واپس لینے کی ضرورت ہو بھی تو بڑی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے تاکہ کسی کی دلشکنی نہ ہونے پائے۔

مارچ کے رسالہ "الندوہ" میں الہ آباد کے نئے اور اعلیٰ درجے کے رسالہ "ادیب" کی نسبت یہ الفاظ شایع ہوگئے تھے کہ "سال میں الہ آباد سے نئے پرچے ادیب ظاہری شکل و صورت میں اس آب و رنگ کے ساتھ نکلا کہ تمام لوگ پکار اٹھے کہ ع اس طرح کا جمال ہو ایسا شباب ہو! ادیب کی ظاہری حالت۔ اسکی خوبصورتی، اور اُسکی تصویروں کے لحاظ سے یہ کوئی نامناسب الفاظ نہ تھے اور اسپر شبہہ ہوا کیا لوگوں کو یقین تھا کہ یہ الفاظ مولانا شبلی کے خود لکھے ہیں لیکن اصل میں مولانا کے نہ تھے۔ اور اُنکی جانب منسوب ہو جانے سے ان کے

معصومی کے دامن میں ایسا دھبّا لگ گیا تھا جس کا دھویا جانا نہایت ضروری تھا
چنانچہ اپریل کے الندوہ میں وہ دھبّا دھویا گیا۔ دُھل تو کیا سکتا تھا ہاں یون
کہنا چاہیے کہ اُسی دھبّا پڑی ہوئی عبا کو مولوی عبد السّلام صاحب ندوی سب اڈیٹر
الندوہ نے مولانا کے جسم اطہر سے اُتار کے خود پہن لیا۔ اور فرماتے ہین کہ مولانا
کی ذات اس سے ارفع ہے کہ اُن کے قلم سے عام رسالون کے متعلق ایسے مبالغہ آمیز
الفاظ نکلین" اس خیال کے اظہار کے ساتھ عام رسالون پر عام حملہ کر دینے
اور اپنے شرمناک تبختر کے الم نشرح کرنے پر بھی الندوہ کو چین نہ آیا اور یہ بھی
نہ گوارا ہوا کہ اُس کا سب اڈیٹر بھی "ادیب" کی اتنی تعریف کرے۔ چنانچہ مولانا
ندوی مولانا شبلی کی پاکدامنی کی شہادت دینے کے بعد اپنی سابقہ فیاضی کے
ایک بڑی حد تک واپس لینے کی غرض سے فرماتے ہین "ہم نے بھی جو کچھ لکھا تھا
اُس کا تعلق رسالہ کی مادّی حالت سے تھا۔ مضامین کے لحاظ سے ہم اُردو کے
کسی رسالہ کو وقیع نہین سمجھتے"

کیون حضرت؟ ادیب کی تو خیر یہ خطا تھی کہ آپ کے قلم سے اُسکی تعریف
نکل گئی ع اس پہ بگڑے ہین کہ کوئی مجھے کیون یاد آیا۔ مگر اُردو کے اور سب
رسالون نے کون سا قصور کیا تھا جو آپ سب پر مُنہ آ گئے؟

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے مین ۔ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے مین

اچھا صاحب ہم نے مانا کہ آپ اُردو کے کسی رسالہ کو وقیع نہین مانتے۔ لیکن الندوہ
کو تو وقیع مانتے ہونگے یا اُسے بھی نہین؟ بیشک اُسے آپ کی نظر مین وقیع ہونا
چاہیے۔ کیونکہ وہ وقیع نہ ہوگا تو اور رسالون کے غیر وقیع بنانے کے فتوے کی کیا
وقعت رہے گی؟ اور ادیب کی طرف پیار کی نگاہون سے دیکھتے ہوئے آنا اور آنے
کے بعد ٹھکرا دینا ناز معشوقانہ کے بجائے ایک مجنونانہ فعل تصور کیا جائیگا۔ لیکن سچ
یہی ہے کہ جب اُردو کے سب رسالے بے وقعت ہو گئے تو اکیلے ایک الندوہ کے سر پر
فضیلت کی پگڑی بندھی بھی رہی تو کیا۔ لہذا اورون کی پگڑی اگر مولانا الندوہ نے
اُتار دی تو ان کی پگڑی ہم اُتارے لیتے ہین۔ اور دعوی کرتے ہین کہ الندوہ اُردو
کے بد ترین رسالون مین ہے۔ اور رسالون سے تو خیر دُنیوی حیثیت سے اسلامی پبلک

تو کچھ فائدہ بھی پہونچ جاتا ہے مگر الندوہ سوا اسکے کہ مسلمانون کے عقائد کو بگاڑے اور تقدس آبی کی عبا پہن کے اعتزال کی تعلیم دے اسوقت تک کوئی اچھا کام نہین کر سکا۔

لٹرری دنیا مین آنے کے بعد ہر طرف سے تحسین و مرحبا کی آوازین کان مین آنے لگتی ہین - ایسی آوازین ان گذشتہ پچیس تیس سال مین اکثر ہمارے کانون مین بھی آتی رہی ہین - اور اپنی تعریف کے ہزارہا سرٹیفکٹ جو پبلک سے ملے ہین ہم بھی پیش کر سکتے ہین - مگر وہ لوگ قوم مین نہایت ہی برا اور ناپاک نمونہ ہین جو اُن تعریفون پر پھول کے سمجھنے لگتے ہین کہ "ہمچو من دیگرے نیست" افسوس عوام کی تو تھوڑی بہت اصلاح ہو بھی جاتی ہے مگر علماے کبر و نخوت اور خود پرستی کا مرض نہ جانا تھا نہ گیا

علم سے ہمارے نزدیک صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ اپنے عجز اور اپنی لاعلمی کی حد معلوم ہو جاتی ہے - لہذا ضرور ہے کہ علم علما مین انکسار پیدا کرے - کیونکہ اُن سے زیادہ کوئی اس بات کو نہین جان سکتا کہ فضول دعوے کس قدر بے بنیاد ہوا کرتے ہین - اس لیے جن علما مین تجبّر و خود پرستی کا مادّہ ہو وہ یقیناً نہایت ہی جاہل بلکہ جاہلون سے بدتر ہین -

الندوہ مین ادیب کی تعریف مین جو چند الفاظ لکھے گئے تھے وہ خود پکار کے کہ رہے ہین کہ مولوی ندوہ صاحب نے صرف ادیب کی ظاہری صورت کی تعریف کی تھی - اور فضیلت مآبی کی سنت قدیم کے مطابق خالی صورت پر فریفتہ ہو گئے تھے - کیونکہ فرماتے ہین "انڈین پریس سے ادیب ظاہری شکل و صورت مین اس آب و رنگ کے ساتھ نکلا کہ تمام لوگ پکار اُٹھے ع اس طرح کا جمال ہوا ایسا شباب ہو" ان الفاظ کو پڑھ کر کس کے دل مین اس بات کا ذرا بھی شبہہ ہو سکتا تھا کہ جناب قبلہ نے اُسکے مضامین کی تعریف فرمائی ہے - اور جب یہ پہلے ہی سے آشکارا تھا تو اس منطق کے معنی ہی کیا کہ "ہم نے جو کچھ لکھا تھا اُس کا تعلق رسالہ کی مادی حالت سے تھا - اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ ادیب کی محبت سے باز دعوے دینے پر بھی مولانا الندوہ اپنے کو پاکدامن نہین ثابت کر سکے - کیونکہ ادیب کی

ہادی یا دوسرے الفاظ میں یون کہیے کہ سفلی دلربائی کے اب بھی قائل ہین۔ پبلک کے دربار مین تو یہ نامہ داخل کرکے مولانا درحقیقت اپنے بطلے ہوئے کسی جزو کو بھی واپس نہین لے سکے۔ ہان اپنے تجبّر کا اضافہ البتہ ہوگیا کہ مولانا کی شان اس سے ارفع ہے اور الندوہ کی نظر مین اُردو کا کوئی رسالہ وقیع نہین" اس سے زیادہ صحیح نمونہ عذرگناہ بدتر ازگناہ کا نہین ہو سکتا۔

خلیفہ ہارون رشید نے ایکبار کہا تھا کہ یہ "عذرگناہ بدتر ازگناہ" کا مقولہ نعوذ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ گناہ کی عذرخواہی کی جائے تو وہ گناہ سے بھی بڑھ جائے؟ دربار کے شوخ طبع شاعر ابونواس نے عرض کیا کہ مین کسی وقت اس کی صحت کا یقین دلا دون گا۔ اسکے بعد شام کو ابونواس زنانی ڈیوڑھی کے پردے کے پاس چھپ کے کھڑا ہو رہا۔ اور جب خلیفہ محل مین جانے لگا تو دوڑکے لپٹ گیا اور اُس کا مُنہ چوم لیا۔ خلیفہ گھبرا کے اور بہت طیش کھا کے کہا "آین یہ کیا؟" ابونواس گھبرا کے بولا "حضور ہیں، مین سمجھا تھا زبیدہ خاتون (رشید کی خاص محل) ہین" یہ جواب سُنتے ہی رشید اور برافروختہ ہوا۔ اور ابونواس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "حضور عذرگناہ بدتر ازگناہ اسی کو کہتے ہین"۔ اس بدتر ازگناہ معذرت کی عربی لٹریچر مین بڑی شہرت ہے مگر ہمارے خیال مین مولانا الندوہ کی یہ بدتر ازگناہ معذرت اس سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ وہان تو اکیلی زبیدہ خاتون پر حملہ ہوا تھا یہان ایک سرے سے سب ہی کی پگڑی اُتار لی گئی۔ مگر مولانا۔ ہم تو بے پگڑی کے بھی جی لین گے آپ اپنی پگڑی سنبھالیے۔

ناول

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران   گفتہ آید در حدیثِ دیگران

ہندوستان مین ناول نویسی ایک بالکل نئی چیز تھی۔ اور اُن نئی دلچسپ چیزون مین جنھین مغربی تہذیب نے ہماری زبان سے لا کے انٹروڈیوس کیا ہے۔ انگریزی معاشرت اور لٹریچر سے جتنی نئی چیزین ہمارے ملک مین آئین اُنکے قبول کرنے کے وقت ابتدا مین اپنی عادت کے موافق ہندوستانیون نے ناک بھون ضرور چڑھائی۔ مگر ناول ایک ایسی دلچسپ اور بامزہ چیز تھی کہ ابتدائی زمانے مین اسے

سب نے اسے ہنسی خوشی سے قبول کر لیا - اور کیونکر قبول نہ کرتے وہ چیز ہی ایسی تھی مگر چند روز بعد جب دوسرے مذاق اور دیگر علوم و فنون کے مصنفون نے دیکھا کہ ہماری تصانیف کی قدر گھٹی جاتی ہے اور جو ہے کسی نہ کسی ناول کو ہاتھ مین لیے ہوے ہے تو اُنھین ناولون کی کثرتِ اشاعت اور اپنی کتابون کی کساد بازاری پر حسد معلوم ہوا - اور جب کوئی زور نہ چلا تو خواہ مخواہ ناول نویسون اور ناول کے شایقین کو کوسنا شروع کر دیا - اور جس قسم کا لٹریری حربہ اُنکے ہاتھ مین آ گیا اُسی سے ناولون پر حملہ کرنے کو تیار ہو گئے - تاکہ اُنکی اشاعت کم ہو اور ملک مین جو اُنکا مذاق بڑھتا جاتا ہے وہ گھٹے - چنانچہ جن حضرات کے سرون پر تفضیلت کی پگڑی رکھی ہے جس کی وجہ سے وہ قوم کے حق مین ایک غیر قابل برداشت بار بن گئے ہین، اُنھون نے فتوے دینے شروع کر دیے کہ ناول نہایت ہی مخرب اخلاق چیز ہین - اور جس طرح ناسمجھ یونانیون نے تعلیماتِ سُقراط کی نسبت کہا تھا کہ وہ نوعمرون کے اخلاق بگاڑتی ہین - اُسی طرح ہمارے ہندوستان کے یہ ناعاقبت اندیش ریفارمر ناولون کو مخرب اخلاق بتاتے ہین - اور محض اس لیے کہ اُن مین حسن و عشق کے افسانے درج ہوتے ہین - اور اُن کے مطالعہ سے اگر براہِ راست نہین تو عموماً پڑھنے والون مین بد اخلاقی کے جذبات پیدا ہوتے ہین -

لیکن اگر بد اخلاقی کا یہی معیار ہے تو اُن بزرگون کے نزدیک سب سے پہلے بد اخلاقی کی تعلیم قرآن مجید سے ہوئی ہوگی - جس مین حضرت یوسف اور عزیز مصر کی بی بی کا قصہ عجب دلکش الفاظ مین مذکور ہے - پھر اُسکے بعد بڑی مخرب اخلاق حدیث و فقہ کی کتابون کو ہونا چاہیے جن کی کتاب الطہارت اور دیگر بحثون مین اُن شرمناک باتون کو جائز کر لیا گیا ہے جو اگر یہی معیار قرار دیا جائے جو ہمارے ان تفضیلت مآبون اور ناسمجھ ریفارمرون نے قرار دے رکھا ہے تو کسی حال مین جائز نہین قرار دی جا سکتیں -

سچ یہ ہے کہ حسد اور خود غرضی ہمیشہ لوگوں کو گمراہ کرتی اور بڑون بڑون کی آنکھون پر پٹی باندھ دیا کرتی ہے - ان سادہ لوح بزرگون کی سمجھ مین اتنا بھی نہین آتا کہ ناولون مین تعلیم اخلاق کا وہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو قرآن مجید مین اختیار کیا گیا تھا کہ واقعاتِ عالم کو دکھا کے اُنکے بُرے یا بھلے انجام کے متعلق علماء کے

فتوؤن کی طرح حکم نہ لگایا جائے بلکہ اُنکے ہر قسم کے انجام کی تصویرین دکھادی
جائین اور اُن کا مشاہدہ کرادیا جائے - اور یہی تعلیم اخلاق کا وہ طریقہ ہے جو ناولون
مین اختیار کیا جاتا ہے -

یورپ مین جو ہر قسم کی اخلاقی - مذہبی اور نیز پولیٹکل اصلاح کا ذریعہ ناول
قرار دیے گئے تو یہ کوئی بے عقلی کا کام نہین کیا گیا - اور نہ یورپ ایسا بے عقل اور
ناعاقبت اندیش ہے کہ کسی فاش غلطی مین مبتلا ہو جائے - اصل یہ ہے کہ ناول سے
زیادہ کوئی موثر پیرایہ کسی مسئلہ یا کسی تہذیب کے ذہن نشین کرنے اور لوگون کو پابند
بنا دینے کا ہو سکتا ہی نہین - ناول کا اسلوب وہ شکر ہے جو ہر کڑوی دوا کے خوشگوار
بنانے کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے - طبیب اگر چاہتا ہے کہ مریض اُسکی مجوزہ
دوا کو بے تکلف پی جائے اور وہ دوا ہزار بے مزہ ہو مگر مریض کو استفراغ نہ ہو تو
سوا شکر اور مصری سے کام لینے کے وہ اور کوئی تدبیر نہین اختیار کر سکتا - اسی طرح
جو معلم اخلاق یہ چاہتا ہے کہ لوگ اُسکے اصول اخلاق پر کاربند ہون تو اُسے سوا
اسکے کہ ناولون کے اسلوب کو اختیار کرے اور کسی طرح کامیابی نہین ہو سکتی -

ناول چونکہ ایک دلچسپ مذاق اور سلجھے ہوے مذاق مین لکھے جاتے ہین
اور اُن کا لٹریچر وہ ہوتا ہے جسے انگریزی مین لائٹ لٹریچر کہتے ہین - اسلیے اُنھین
ادنیٰ و اعلیٰ - تھوڑی قابلیت رکھنے والا بھی - اور زیادہ لیاقت رکھنے والا بھی -
یکسان دلچسپی کے ساتھ پڑھتے اور مزہ لیتے ہین - اور یہی سبب اُن کی اشاعت کے
بڑھنے اور اُن کی طرف لوگون کے عام طور پر متوجہ ہو جانے کا ہوتا ہے - قابل اور
صاحب علم لوگ بھی جس آسانی سے تفریح اور بیکاری کے اوقات مین بغیر اسکے کہ
دماغون پر کسی قسم کا بار پڑے ناولون کا مطالعہ کر سکتے ہین نہ کسی تاریخ کا کر سکتے ہین
اور نہ کسی اخلاقی کتاب کا - اور اُنکی کثرت اشاعت اور عام دلکشی ہی اس بات
کا اصلی سبب ہے کہ اُنکے ذریعہ سے ضمنی طور پر ہر قسم کی تعلیم دینے کو دیگر طریقون پر
ترجیح دی گئی ہے -

یہ بزرگ اس مصلحت پر تو نظر نہین ڈالتے ہین اور خواہ مخواہ اس حسد مین
جلے مرتے ہین کہ ہماری عالمانہ کتابون کو تو کوئی پوچھتا نہین اور یہ بازاری مذاق کی

کتابین بڑے شوق کے ساتھ لی اور پڑھی جاتی ہین - اس شرمناک جوش نے اُن کے پُرانے طرز عمل "لِمَ تقولونَ ما لا تفعلونَ" کو تازہ کر دیا - اور ریاکاری کی جو پُرانی عادت پڑی ہوئی ہے اُس مین ایک حد تک اور ترقی ہو گئی - یعنی جس طرح اور سب اخلاقی امور مین "چون بخلوت می روند آن کار دیگر می کنند" کی شان فضیلت مآبی نمایان ہوا کرتی ہے ناولون کے معاملہ مین بھی ظاہر ہونے لگی - یعنی ہوس پرستی کے ذاتی شوق مین مبتلا ہو کے - اور رون سے چھپا کے - اور کمرے کے دروازے بند کر کے خود تو ناولون کو بڑے لطف سے اور مزے لے لے کے پڑھا کرتے ہین - مگر باہر نکلتے ہی لڑکون کو تعلیم دی جاتی ہے کہ "خبردار ناول نہ پڑھنا - پڑھا اور غارت ہوے"۔

اسی سلسلے مین ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہین کہ ناولون نے اُردو دان پبلک کو اس وقت تک کس قدر فائدہ پہونچایا ہے - گو ابھی تک ایسے عمدہ اور اعلیٰ درجے کے ناول اُردو مین بہت کم موجود ہین جو انگریزی کے اعلیٰ ناولون کا مقابلہ کر سکین - مگر اس بے مایگی پر بھی موجودہ ناول ہمین اسلوب زندگی کے جتنے نمونے دکھا چکے ہین گذشتہ صدہا اور ہزارہا سال کا لٹریچر نہین دکھا سکا تھا - اور آج کل کے معیار تعلیم کے اعتبار سے یہی سب سے بڑی تعلیم ہے - اسکے علاوہ تاریخ کا مذاق ملک مین بہت ناولون نے پھیلایا ہے - موجودہ سررشتۂ تعلیم مین اگرچہ تاریخ داخل نصاب کر دی گئی ہے - مگر اول تو صرف تعلیم یافتہ گروہ اور طلبہ تک محدود ہے - دوسرے ہندوستان اور انگلستان کی تاریخ کے علاوہ اور کسی حصہ ملک کی تاریخ سے سررشتۂ تعلیم کو بہت کم علاقہ ہے - ناولون نے اکثر مختلف اقوام و ممالک کی تاریخ کو ایسے دلچسپ عنوان سے شایع کیا کہ معمولی قابلیت کے لوگ حتیٰ کہ عورتین تک تاریخ کو ایک نہایت دلچسپ فن خیال کرنے لگین - مگر افسوس کہ اُردو مین جن حضرات نے تاریخین لکھی ہین ایسی بے مزہ اور بے لطف زبان مین اور کچھ ایسے بھونڈے عنوان سے لکھی ہین کہ لوگون کے دلون مین تاریخی ناول پڑھ کے تاریخ کا جو شوق پیدا ہوتا ہے وہ تاریخون کو پڑھ کے جاتا رہتا ہے - انگریزی مین اول تو عموماً تاریخین نہایت ہی اعلیٰ درجے کے دلکش رنگ عبارت مین لکھی جاتی ہین - اور اگر بالفرض وہ بھی کسی کو بے مزہ معلوم ہون تو "اسٹوری آف دی نیشن سیریز" کا ایک سلسلۂ تاریخ

مرتب ہوگیا ہے جس مین کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ مین پورا پورا وہی لطف پیدا کر دیا جائے جو ناولون مین ہوتا ہے۔ بخلاف اسکے ہمارے اُردو زبان کے مصنفان تاریخ اگر انشا پردازی کی طرف توجہ کرتے ہین تو پرانے مذاق کی عبارت آرائی کے خیال مین اپنے مذاق کے مناسب لفظون اور فقرون کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کر دیا کرتے ہین جن مین لفاظی بہت ہوتی ہے اور مطلب بہت کم۔ بلکہ بعض جگہ نادر و نا تاریخ اور اگر انھین تحقیق و تنقید کی طرف توجہ ہوتی ہے تو واقعات اور مواد تاریخ کا ایک خشک و بے مزہ ذخیرہ محض نقل کی حیثیت سے جمع کر دیتے ہین جس کی ترتیب ناقص ہوتی ہے اور واقعات کی نتیجہ خیزی کے متعلق نہایت بے سلیقگی ظاہر ہوتی ہے۔ حالانکہ جس طرح طبیب ایک نسخہ تجویز کرتے وقت مختلف اجزا کو اس خوبی سے ترکیب دیتا ہے کہ اُن سے ایک نیا۔ موثر۔ اور نفع بخش مزاج پیدا ہو۔ بعینہ یہی کام اک ایک مورخ کا ہونا چاہیے کہ واقعات کو وہ محض غلط روایات کی حیثیت سے جمع کر کے صرف اس کوٹھی کے دھان اُس کوٹھی مین نہ کر دے۔ بلکہ اُن کی نئی ترکیب سے نیا رنگ اور نیا مزاج پیدا کرے۔ اور اُس کے تازہ منافع و فوائد سے لوگون کو فائدہ پہونچائے۔ اور اس سے ہمارے تمام مورخ بے بہرہ ہین۔ اور یہی سبب ہے کہ ناولون کے ذریعے سے ہم تاریخون کا جو مذاق ملک مین پیدا کرتے ہین وہ ان بزرگون کی تاریخین پڑھ کے بالکل تشریف لے جاتا ہے۔

آج کل اُردو پبلک کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ ہر طرف سے لوگ تاریخون کو مانگ رہے ہین۔ مصنفین کو خطوط لکھ لکھ کے دریافت کرتے ہین کہ کوئی اچھی تاریخ بتایئے تاکہ ہم مختلف ممالک و اقوام کے حالات معلوم کر سکین۔ مگر جب انھین کوئی تاریخ بتائی جاتی ہے تو اُسے پڑھ کے انکی تسلی و تشفی نہین ہوتی۔ پیاس لگتی ہے مگر بجھتی نہین۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ناول نویسون نے اپنی خدمت پوری ادا کر دی۔ کیونکہ یہ پیاس انھین کی لگائی ہوئی ہے۔ مگر افسوس کہ مورخ اپنا فرض منصبی بالکل نہین ادا کر سکے۔ اس لیے کہ وہ پیاس اُنکے بجھانے سے نہ بجھ سکی۔

یہ اُمید رکھنا کہ ناولون کے مذاق پر کوئی اور مذاق غالب آسکے گا ہو

محال ہے - چنانچہ اسی وجہ سے ناول ہر ملک اور ہر قوم مین دیگر قسم کی کتابون سے زیادہ شایع ہوتے ہین - ہان اگر تاریخ لکھنے والے اپنے فن کو اچھے سلیقے سے ترتیب دے سکین گے اور لوگون کی خواہش کے مطابق تاریخی تصانیف مرتب کر سکین گے تو بیشک یہ ہو سکے گا کہ مورخین کو اپنی کساد بازاری کی شکایت نہ باقی رہے - اور اُنکی کتابین بھی ہر گروہ اور ہر طبقہ مین دلچسپی کی نظر سے دیکھی جانے لگین - مگر یہ سمجھنا کہ خالی ناولون کے خلاف فتوے دینے اور ناول لکھنے یا پڑھنے والون کو کوس لینے سے کام نکل جائے گا - این خیال است و محال است و جنون -

عربی زبان اور اُسکی نحو و صرف

آج کل دنیا کی مشہور و متداول زبانون مین سے اکثر یا تو خالص آریہ قوم کی زبانین ہین یا آریون کی زبان سے نکلی ہین - مگر دنیا مین روز بروز ثابت ہوتا جاتا ہے کہ آریہ قوم کے عروج سے پہلے ساری مہذب دنیا مین بنی سام کا دور دورہ تھا - اور انھین کی زبان اطراف عالم پر چھائی ہوئی تھی -

اُنکی زبانین سُریانی - کلدانی - عبرانی - اور غالباً قبطی تھین - اور مشرق مین بابل نینوا کا زور و شور رہا اور مغرب میں فراعنۂ مصر کا - تو یہی سامی زبانین ساری دنیا کی تہذیب و تمدن کا مرکز بن گئین اور انھین کے علم و ہنر کے باغ سے آکے یونانیون نے خوشہ چینی کی -

مگر ان سلطنتون اور قوتون کے فنا ہوتے ہی آریہ قوم اور اُس کی زبان کا عروج شروع ہوا - اور بنی سام کی اور زبانین تو سب مٹ گئین یا مٹنے کے قریب ہین - اور اگر ہین بھی تو گمنام اور بے نشان - فقط ایک عربی زبان باقی ہے جو سب کی وارث ہے اور جس نے آریون کے غالب آنے کے بعد اُنکو مغلوب کیا - اور اُن سب پر اپنا سکہ جما دیا - یہی حضرت سلیمانؑ کے جاہ و جلال اور حضرت یوسفؑ کے حسن و جمال کو یاد دلاتی ہے - اور یہی بابل و اسیریا کے دربارون کی یادگار ہے - یہی ملک سبا اور تبابعۂ یمن کی ترقیون اور عالمگیریون کا افسانہ سُناتی ہے - اور یہی صابئین کے علم و فضل اور کمالات روحانی کی خبر دے رہی ہے - اس بحث سے بھی قطع نظر کیجیے

کہ یہ عبرانی سے نکلی ہے یا عبرانی اس سے - اور اس ذکر کو بھی جانے دیجیے کہ عبرانی زیادہ قدیم ہے یا عربی (جس میں کہ فاضل زمانہ جسٹس مولانا سید کرامت حسین صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد نے بہت کچھ بحث کی ہے) مگر یہی کیا کم ہے کہ جو اثر دنیا اور دنیا کی زبانوں پر عربی زبان نے ڈالا اور جیسا بقائے دوام عربی کو حاصل ہو گیا ہے نہ کسی اور سٹمک زبان کو نصیب ہوا تھا اور نہ کسی آرین زبان کو -

عربی کے مقابلہ کی زبانیں صرف سنسکرت - یونانی - اور لاطینی ہیں جو آرین اسٹاک کی زبانیں سمجھی جاتی ہیں - مگر وہ سب دوسری نوزائید زبانوں میں اپنے الفاظ پریشان چھوڑ کے دنیا سے رخصت ہو گئیں - سنسکرت کے اثر کا حلقہ سرحد چین سے لے کے ایران کی مغربی سرحد تک ہے - جس میں بیسیوں زبانیں ہیں - اور سب سنسکرت کی بیٹیاں ہیں - کیونکہ وہ ہر صوبہ کے اصلی باشندوں کی زبان اور سنسکرت کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہیں -

ایران سے حدود شام تک بابل و نینوا کی قدیم سٹمک زبانوں کا حلقہ تھا اور وہاں سے آگے بڑھ کے انتہائی حدود مغرب تک یعنی مغربی حصہ ایشیا اور سارے یورپ میں یونانی اور لاطینی زبانوں کا عمل دخل تھا - جہاں کے لوگوں کی اصلی زبانوں پر ان دونوں زبانوں نے حکومت کر کے نئی زبانیں مروج کیں - جو آج کل یورپ کی ترقی کے ساتھ اوج کمال پر پہونچ رہی ہیں - ان دونوں زبانوں نے جو آرین اسٹاک کی زبانیں تھیں بحیرۂ روم کے جنوبی سواحل پر اتر کے افریقہ پر بھی اپنا اثر ڈالا جہاں کہ فراعنہ کی قدیم قبطی زبان کا اثر پڑا ہوا تھا -

غرض دنیا کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ مشرق میں سنسکرت اور اسکی سگی بہن پہلوی زبانیں اپنی نو عمر بیٹیاں چھوڑ کے مر چکی تھیں - بابل اور اسیریا کی زبانوں کا بھی چراغ گل ہو چکا تھا - جنوب میں فراعنہ کی زبان کا نام و نشان بھی نہیں باقی رہا تھا - مغرب میں یونانی اپنے مصنفوں کے ساتھ قبر میں دفن ہو چکی تھی - اور لاطینی دین عیسوی کی مقتدائی کا عصا ہاتھ میں لے کے بڑھاپے اور کمزوری کی گھڑیاں پوری کر رہی تھی کہ عربی اپنے وطن کے پہاڑوں اور بالو کے ٹیلوں سے نکل کے متمدن دنیا میں آئی اور چند روز میں اقوام عالم کے ساتھ السنۂ عالم پر بھی چھا گئی -

اسلام سے پیشتر عربی زبان جزیرہ نماے عرب کی حدون کے اندر بند تھی۔ اگرچہ جنوبی عرب کی حمیری زبان جو عربی ہی کی ایک شاخ تھی کسی قدر متمدن زبان تھی اور قدیم الایام کے بڑے بڑے کارنامون اور حیرت انگیز ترقیون کی خبر دیتی تھی۔ یہان تک کہ اُسی کی برکت سے ارض حبشہ کی موجودہ زبان پیدا ہوئی ہے مگر شمالی عربی یعنی ارض حجاز کی لغت قریش نے یہان تک دینی و دنیوی عروج حاصل کیا کہ اُسے بھی مغلوب کر کے اپنا بنا لیا۔

نیر اسلام کے طلوع سے پہلے عربی زبان مین بہت سے اختلافات تھے بلکہ یون کہنا چاہیے کہ ہر بڑے قبیلے اور ہر حصۂ عرب کی زبان جداگانہ تھی۔ مگر یہ اختلافات صرف محاورات یا بعض حروف کے مخارج اور طرز ادا مین تھے یعنی یہ نہین کہا جا سکتا تھا کہ کوئی دوسری زبان عرب مین بولی جاتی تھی۔ یا اتنا فرق تھا کہ ایک صوبے کی زبان کو دوسرے صوبہ والے سمجھ نہ سکین۔ اس زبان مین فصاحت بھی تھی بلاغت بھی۔ مگر عالم کی نظر سے چھپی ہوئی۔ اپنی لسانی خوبیون کی قدر کرنے والے وہ خود آپ ہی تھے۔ دوسری قومین ہنوز تیار نہ تھین کہ انکی فصاحت اور جادو بیانی کی داد دے سکین۔ اُن کو اظہار فصاحت کے میدان یا چند میلے اور بازار تھے جہان قبائل عرب تمدنی اغراض سے جمع ہو جاتے تھے۔ یا عرصہ ہاے کارزار تھے جہان وہ اپنی شجاعت و جوانمردی کا نغمہ خود ہی سُناتے اور خود ہی سر دھن لیتے اور اپنی پُر اثر رجز خوانی سے اپنے رگ حمیت کو جوش مین لاتے۔ یا شاہان یمن و حیرہ و بلقاء کے دربار تھے جہان قصیدہ خوانی کر کے وہ کچھ دولت حاصل کر لیتے۔ یا کسی عزیز و قریب کے دوست کی لاش تھی جس پر کھڑے ہو کے مرثیہ خوانی کرتے۔ یہ وہ مقامات تھے جہان اُن کی نظمین سُنی جاتین۔ رہی نثر اُس مین اُنکے کمالات کبھی تو کسی کاہن یا کاہنہ کی گفتگو مین نظر آتے کبھی کسی اخلاقی حکیم کے پند و نصائح مین۔ اور کبھی کسی خطیب کے برجستہ خطبون مین۔

مگر یہ لٹریری خزانہ ابھی تک صرف دماغون اور حافظون مین محفوظ تھا۔ کیونکہ کوئی خط نہین ایجاد ہوا تھا۔ صرف ایک حمیری خط جنوبی عرب مین تھا۔ جس سے تصنیف و تالیف کا کام نہین لیا گیا۔ اس سے اگر مدد لی جاتی تھی تو صرف

خط و کتابت اور نامہ و پیام میں۔ قریش میں آنحضرت صلعم کی ولادت سے چند ہی روز پہلے ارض حیرہ یعنی ایران کے سرحدی صوبۂ عرب سے ایک رسم خط حاصل کیا گیا تھا جس کے جاننے والے چند گنتی کے اہل مکہ تھے۔ آپ کی تعلیم نبوت کے ساتھ ہی ساتھ اس خط کو فروغ ہوا جسکے دو ایک نمونے یورپ کے عجائب خانون مین موجود ہین اور اُنکے فوٹو جا بجا مل سکتے ہین۔ اس مین شک نہین کہ موجودہ عربی رسم خط کا نقش اولین وہی تھا۔ مگر اس قدر ناقص اور غیر مکمل کہ نہ نقطہ ہین اور نہ اعراب۔

اب قرآن نازل ہوا۔ اور اُسکے لکھنے اور نیز تعلیم و تلاوت کی لازمی ضرورت سے اِس رسم خط نے خود بخود ترقی کرنا شروع کی۔ ابتدائی فتوحات کے وقت جب عرب۔ ایران۔ شام۔ روم اور مصر وغیرہ کی فتوحات و ملک گیری مین مشغول تھے انھین سوا اعلاء کلمۃ اللہ کی دُھن کے اور کسی بات کا خیال نہ تھا۔ رجز خوانی اور مرثیہ گوئی تو البتہ تھی باقی اور سب طرح کی نظمون کا بازار سرد تھا۔ ہان افسران فوج سے خط و کتابت کرنے کی ضرورت سے ایک خاص قسم کی سادی انشا پردازی ترقی کرنے لگی تھی جس کی فصاحت و بلاغت کا معیار صرف نظم قرآنی کا تتبع تھا۔

فتوحات کے بعد ضرورت ہوئی کہ شرفائے عرب جو مدت دراز تک جہاد مین مصروف رہ کے رٹائر ہوے تھے اور صحرائے عرب کی تلخی و ترشی کی معاشرت سے ناآشنا ہو گئے تھے ایسے مقامات پر آباد کیے جائین جو نہ عرب سے باہر اور دور ہون اور نہ دشت عرب کے اندر واقع ہون۔ اور جہاد و فوج کشی کی ضرورتین بھی اِس بات کی متقاضی تھین کہ نو مفتوح ممالک کی سرحدون پر عربون کی نو آبادیان قائم کر دی جائین تاکہ ضرورت کے اوقات مین بہت جلد اسلامی لشکر مرتب کر لیے جا سکین۔ اور وہ چند ہی منزلون کی مسافت طے کرکے رزمگاہ مین پہونچ جایا کرین۔ خصوصاً جب عرب خاندان بلاد دور و دراز مین جا جا کے آباد ہونے لگے تو اسکی ضرورت اور زیادہ محسوس ہوئی۔ اسی ضرورت سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے مین عراق کی سرحد پر کوفے اور بصرے کی نو آبادیان قائم ہوئین۔ جہان اُن تمام شرفائے عرب نے جو ایران سے لے کے سندھ اور ترکستان تک جوہر سپہ گری دکھا چکے تھے سکونت اختیار کی اور اپنے گھر بنا کے رہنے لگے۔ ایسی ہی عربی بستیان

دمشق اور اسکندریہ کے پاس بھی قائم ہوگئی تھیں۔ مگر اطمینان سے بیٹھنے کا جیسا موقع کوفے اور بصرے والوں کو ملا کہیں کے عربوں کو نہیں ملا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ مشرق کی طرف کوئی ایسی سلطنت نہیں باقی رہی تھی جو اسلامی سلطنت کے مقابل صف آرا ہونے کی جرأت کر سکتی۔ بخلاف اسکے دمشق روم کی مشرقی سلطنت کی سرحد پر تھا۔ جس سے چھ سات سو برس تک اسلامی سلطنتوں سے لڑائیاں ہوتی رہیں اور اسکندریہ کے عربوں کا رُخ افریقہ کی طرف تھا جہاں روز نئے فتنے پیدا ہوتے تھے اور جدھر آبنائے جبرالٹر کا نالہ پھاند کے اُنھوں نے گاتھک سلطنت کا خاتمہ کیا اور یورپ کے جنوب و مغربی حصے میں اپنی سلطنت قائم کرلی۔

عراق یعنی کوفہ و بصرہ کے عربوں کی فارغ البالی کا ایک بڑا سبب حضرت علیؓ اور جناب معاویہؓ کی لڑائیاں بھی ہوئیں۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں کوفہ والوں نے کبھی پورے جوش اور سچے دل سے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔ اور آپ کی شہادت کے بعد جب بنی اُمیہ کی سلطنت قائم ہوگئی تو اُنھوں نے اُن لوگوں کو فطرۃً بیوفا خیال کرکے یا یہ سمجھ کے کہ یہ لوگ ہمارے سچے دوست نہیں ہوسکتے ان سے لشکرکشی اور معرکہ آرائی میں بہت کم کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوفہ اور بصرہ والوں کو میدان جنگ کے شغلوں سے فراغت ہوتے ہی زبان عرب کے قواعد منضبط کرنے اور لٹریری مشاغل میں مصروف ہوجانے کا پورا موقع مل گیا۔ چنانچہ سب سے پہلے جو شہر عربیت کے مستند اسکول بنے یہی دونوں شہر کوفہ اور بصرہ تھے جن پر مباحث نحوی و صرفی اور فصاحت و بلاغت کے مسائل میں آج تک استناد کیا جاتا ہے۔

سب کے پہلے ابوالاسود دوئلی نے علم نحو کی تدوین کی بنیاد ڈالی جو بصرے میں اقامت گزین تھے۔ ابوالاسود حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کے صحبت یافتہ، آپ کے شاگرد اور کبار تابعین میں تھے۔ حضرت علیؓ نے اُنکو زبان عرب کے چند قواعد کی تعلیم دی تھی۔ ان قواعد کو ضروری اور قیمتی خیال کرکے ابوالاسود نے جناب امیر کی خدمت میں عرض کیا کہ "اصنع نحو ما صنعت" نحو کے معنی مثل کے ہیں۔ مطلب یہ کہ "اجازت ہو تو جیسے قواعد آپ نے بنائے ہیں ویسے ہی میں بھی بناؤں" حضرت علیؓ نے اجازت دی اور ابوالاسود نے چند اور قواعد بنائے اور اُسی لفظ نحو کی رعایت سے اُس کا نام نحو رکھدیا۔

ابو الاسود ابتداءً ان قواعد کو لوگوں سے چھپاتے اور قیمتی جواہرات کی طرح پوشیدہ رکھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ زیاد نے جو ابو الاسود کی زباندانی سے واقف تھا اپنے عہد حکومت عراق میں انھیں بلا کے کہا "آپ کچھ ایسی باتیں قلمبند کر دیجیے جن سے لوگوں کو کتاب اللہ کی تعلیم میں مدد ملے۔ ابو الاسود نے صاف جواب دیا کہ "مجھے معاف رکھیے" اور اپنے گھر چلے آئے۔ لیکن اسکے چند ہی روز بعد دو ایسے واقعے پیش آئے کہ انھیں اپنی ضد چھوڑنی پڑی۔ ایک مرتبہ یہ ہوا کہ کسی قاری قرآن کو تلاوت کرتے سنا جو آیۂ کریمہ اِنَّ اللّٰہَ بَرِیٔ مِنَ المُشرِکِینَ وَرَسُولُہٗ" میں "رسولُہٗ" کی جگہ "رسولِہٖ" پڑھ گیا۔ آیت کا اصل مطلب تو یہ تھا کہ "خدا اور رسول مشرکوں سے بری الذمہ ہیں"۔ مگر اعراب کی اس غلطی سے یہ مطلب ہو گیا کہ "خدا مشرکوں اور اپنے رسول سے بری الذمہ ہے"۔ سنتے ہی ابو الاسود کانپ گئے۔ اور کہا میں یہ نہیں سمجھا تھا کہ لوگوں کی یہ حالت ہو گئی ہے"۔ دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ سعد نام ایک فارسی الاصل شخص نو مسلم نے ابو الاسود کے کسی سوال کے جواب میں ایک ایسا فقرہ کہا جس میں "اِن" کی خبر کو بجائے پیش کے زیر دے دیا۔ جس پر تمام گرد و پیش کے ہنس پڑے۔ اور ابو الاسود نے کہا "ان غلاموں نے دین اسلام اختیار کیا اور ہمارے بھائی بن گئے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ ہم انھیں زبان کی تعلیم دیں"۔

اہل زبان و زباندان کا فرق اور زبان اردو کا معیار

یہ سچ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے بعض شعرا اور مدعیان زباندانی نے دوسرے شہروں کے شعرا اور انشا پردازوں کے ساتھ اکثر بے رحمی کا سلوک کیا ہے۔ اور ان لوگوں کے اس قسم کے دعوے ہم بارہا سن چکے ہیں کہ ہمارے سوا کسی کو زبان آتی ہی نہیں۔ اور غیر شہر والوں کے کلام کو محض اس بنا پر الگ ڈال دیتے ہیں کہ کہا ہے کہ یہ اہل زبان کا کلام نہیں۔ اب اردو ترقی کر رہی ہے اور دہلی و لکھنؤ سے زیادہ شاعر اور ادیب دیگر بلاد و ممالک ہند میں پیدا ہوتے ہیں۔ جو بڑی محنتوں اور کوششوں سے تیار ہوتے ہیں۔ ایسے قابل لوگوں کی محض بے پروائی سے یہ کہکر تحقیر اور سُبکی کر دینا کہ وہ اہل زبان نہیں ہیں انتہا درجے کی بے انصافی ہے۔

دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان مین جب وہ دور دور تک پھیلتی ہے بہت سے مختلف لغات (ڈایالکٹ) پیدا ہو جاتے ہین۔ گر کسی زبان کے شعرا اور ادیبون نے اُن مختلف لغات کے ساتھ ایسا سلوک نہین کیا جیسا کہ اُردو کے شعراے اہل زبان کر رہے ہین۔ قرآن پاک کی تدوین کے وقت اگرچہ لغت قریش کو ترجیح دی گئی ہے مگر یہ کبھی کسی کی زبان سے نہین نکلا کہ یمنی۔ عراقی۔ شامی۔ مصری یا تونسی و مراکشی شاعرون کی زبان قابل لحاظ نہین۔

انگریزی مین بھی اگرچہ بہت سے لغات اور "ڈایالکٹ" پیدا ہو گئے ہین۔ اور جزائر برطانیہ والون کو اُس کے اہل زبان ہونے پر بہت کچھ فخر و ناز بھی ہے مگر یہ کبھی نہین دیکھا گیا کہ لندن کے سخت تنقید کرنے والے اخبارون یا وہان کے جادو بیان مضمون نگارون۔ اعلیٰ ادیبون۔ اور نازک خیال شاعرون نے امریکہ اور دیگر مقامات کے مصنفون اور شاعرون کی محض اس بنیاد پر تحقیر کی ہو کہ وہ اہل زبان نہین یا قابل استناد نہین ہین۔

اس نزاع کے دُور کرنے کے لیے پہلے اس بات کا تصفیہ کرنا چاہیے کہ "اہل زبان" کون لوگ ہین اور "زباندان" کا لفظ کن لوگون کی نسبت استعمال کیا جانا چاہیے۔ لوگون کی جو مادری زبان ہو اُسکے وہ اہل زبان ہین۔ مقامات اور ڈایالکٹ کے بدل جانے سے اُن کے اہل زبان ہونے مین فرق نہین آسکتا۔

ہندوستان کے جن حصون یا لوگون مین عورتون کی زبان اُردو ہو عام اس سے کہ وہ چاہے کیسی ہی بگڑی ہوئی اُردو ہو اُردو کے اہل زبان ہین۔ لہذا اُردو کے اہل زبان لکھنؤ کے حدود میونسپلٹی اور دہلی کی چار دیواری مین بند نہین بلکہ تمام قطاع ہند مین پھیلے ہین۔ اور ہمین ہرگز یہ حق نہین ہین کہ انھین اُن کے اِس حق سے محروم کرین۔

زبان دان کا لفظ بالکل اس سے متغائر ہے۔ کیونکہ بعض حیثیتون سے وہ خاص ہے اور بعض حیثیتون سے عام۔ "زباندان" ہر اُس شخص کو کہین گے جس نے کسی زبان کے لٹریچر اور شعر و سخن کی طرف توجہ کر کے اُس مین بصیرت حاصل کی ہو۔ اور اُس زبان مین علمی حیثیت سے ترقی کی ہو عام اس سے کہ وہ اہل زبان ہو یا نہ ہو۔ لہذا بہت سے

اہل زبان خاص دہلی اور لکھنؤ کے رہنے والے جہلا گو کہ بہت فصیح زبان بولتے ہون "زبان دان" نہین ہین۔ اور بہت سے وہ لوگ جن کی مادری زبان اُردو نہین ہے مگر اُنھون نے اُردو زبان مین ترقی کی ہے وہ صحیح معنون مین "زبان دان" کہے جانے کے مستحق ہین۔

ہم سمجھتے ہین کہ "اہل زبان" اور "زبان دان" کے اِس مفہوم کے طے ہو جانے کے بعد ہمارے نوعمر جھگڑنے والون کا جھگڑا بہت کچھ طے ہو جائے گا۔

لیکن اس کے مقابل ایک اور بات کا خیال رکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ زبان محض ایک نقلی فن ہے۔ اُس کا استناد صرف سماع پر ہوتا ہے عقلی احتجاج سے اسے مطلقاً علاقہ نہین ہے۔ اور فلسفہ و منطق کے چون وچرا کو عالم لسان مین مطلقاً دخل نہین۔ کسی لفظ یا محاورہ کی صحت کے لیے سوا اسکے کہ اہلِ زبان یونہین بولتے ہین اور اِن معنون مین استعمال کرتے ہین کوئی عقلی اور منطقی دلیل ہرگز نہین قائم کی جا سکتی۔

لہذا ہر نقلی فن کے لیے لازمی ہے کہ کوئی خاص چیز محل استناد قرار دے لیجائے جیسے علوم نقلیۂ دینیہ مین قرآن و حدیث ہین۔ ورنہ قلمرو سخن مین بربادکن طوائف الملوکی پیدا ہو جانے سے زبان کے غارت ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ الفاظ و محاورات کی صحت کے لیے ہم کو معیار کے مقرر کرنے کی لازمی ضرورت ہے۔ اور وہ حیثیت ہمارے خیال مین دہلی و لکھنؤ کی زبان نے حاصل کر لی جس سے انکار کرنا لٹریری بغاوت ہے۔

بہر تقدیر ہمارے نزدیک یہ فیصل شدہ امر ہے کہ اگر دہلی و لکھنؤ والے کسی اُردو بولنے والے گروہ کو اہل زبان ہونے کے حق سے محروم کرین تو ظلم ہے۔ اور اگر کوئی گروہ اِن شہرون کے معیار صحت ہونے سے انکار کرے تو باغی اور زبان کی قلمرو مین امن و امان کا دشمن ہے۔

اُردو اور ہندی

یہ جھگڑا کسی طرح طے ہونے کو نہین آتا۔ اور اہل ملک کی جو حالت ہو رہی ہے اُسکے دیکھتے امید نہین کہ کبھی بھی طے ہو۔ اگر زمانہ کا یہی رنگ رہا اور ہندوستان مین

یہ جو ہیل و نہار ہے تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہندوستان میں نہ اردو ہوگی نہ ہندی بلکہ سب کی مادری زبان انگریزی ہوگی مگر زندگی کی تھوڑی مدت جو باقی ہے اُس میں بھی ملک کے بیوقوف وکلا اُسے چین نہیں لینے دیتے۔ اگر کسی گروہ کا یہ خیال ہو کہ وہ ہندوستان کی اس رفتار کو بدل دیں گے یا برٹش گورنمنٹ کے سوا یہاں اور کوئی حکومت ہوگی وہ بے وقوف اور عقل کا دشمن ہے۔ برٹش سطوت روز بروز بڑھے گی اور اُن تمام کوششوں اور قوتوں کو پامال کر ڈالے گی جو اُسکے خلاف ہیں۔ اور دُنیا کے اُن تمام مقامات میں جہاں جہاں انگریزی حکومت ہے ایک متحد المذاق والاغراض قوم تیار ہوگی جس کی کاروباری اور معاشرتی زبان انگریزی ہوگی۔

اُردو ہو یا ہندوستان کی کوئی اور زبان یہ سب مٹنے والی چیزیں ہیں جو اپنی اپنی عمریں پوری کر کے صرف کتابوں میں رہ جائیں گی اور زبانوں پر فقط انگریزی ہوگی۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ انگریزی کو قوت کے ساتھ اُٹھایا اور شوق سے حاصل کیا جائے۔ اور ان زبانوں کی جتنی عمر باقی ہو اُس میں اُنھیں موقع دیا جائے کہ امن و امان کی زندگی بسر کریں۔ اور ایک دوسرے کے آزار کے درپے نہ ہوں۔ مگر نہیں۔ ہم اپنی بدقسمتی اور بے عقلی سے اُنکی اس چند روزہ زندگی کو بھی بے مزہ کیے دیتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو زبان خودرو طور پر پیدا ہوئی۔ اور خود ہی بغیر کسی کوشش کے سارے ہندوستان پر چھا گئی۔ اور اسکو یہ حیثیت حاصل ہے کہ کسی غیر ملک کا آدمی ہندوستان میں آئے اور ہندوستان کے لوگوں سے ملنے جلنے اور اُن سے گفتگو کرنے کے لیے جس زبان کو سیکھتا ہے وہ اُردو ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اُردو کو مسلمانوں سے کوئی خصوصیت نہیں اس لیے کہ اسکی ترکیب اور اسکی پیدائش میں جتنا دخل عربی یا فارسی کو ہو سکتا ہے اُس سے زیادہ بھاشا اور سنسکرت کو ہے دراصل یہ اُس سوسائٹی کی زبان ہے جو ہندو مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی۔ اور سچ پوچھو تو ہندو مسلمانوں کے سابقہ اتحاد اور باہمی ربط و ضبط کی ایک یادگار ہے۔ مگر ہندوستان کی پھوٹ مشہور ہے۔ وہ اتحاد کا دشمن ہے۔ اور نہیں چاہتا کہ دوستی و اتحاد کی کوئی یادگار بھی باقی رہے۔

مسلمانوں نے حماقت سے روز بروز تسلیم کیا کہ یہ خاص ہماری زبان ہے۔ اور ہندوؤں نے

حماقت سے سمجھ لیا کہ یہ حقیقت میں ہماری زبان نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں گروہوں کی باہمی عداوت و منافرت سے غریب اُردو عجب کشمکش میں پڑ گئی۔ ہندوؤں نے اس مالیخولیا میں مبتلا ہو کے کہ اُردو ہماری زبان نہیں "ہندی زبان" کا ایک نیا لفظ اختیار کیا جو دراصل ایک اسم ہے جس کا کوئی مسمّٰی نہیں۔ اس جھگڑے سے پہلے ہندی کا لفظ صرف کاتھی اور ایک خاص قسم کے رسم خط کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جو اکثر جاہل اور اَن پڑھ دکان داروں میں مروج تھا۔ ہندی نام کی کوئی زبان ہندوستان میں نہ تھی۔ مگر قومی اور مذہبی سرگرمی کا جوش دکھانے کے لیے ایک "ہندی زبان" بنائی گئی جو کہ فی الاصل موجود نہ تھی۔ اور نہ اسوقت تک ہے۔

لیکن جب ایک نام اختیار کیا گیا تو اُسکے لیے کوئی مفہوم مقرر کرنا ضروری تھا لہٰذا ایک نئی زبان کے پیدا کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ اور اسکے لیے ایک عجیب طریقہ اختیار کیا گیا۔ پڑھے لکھے لوگوں کا دستور ہے کہ جس زبان کے لٹریچر کو حاصل کرتے ہیں اُسکے اکثر الفاظ اپنی گفتگو میں شامل کر لیتے ہیں جیسے کہ فی الحال انگریزی دانوں کی زبانوں پر کثرت سے انگریزی الفاظ ہوا کرتے ہیں۔ چونکہ پیشتر فارسی تعلیم عام تھی اور پڑھنا لکھنا ہندوستان میں فارسی ہی پڑھنے کا نام تھا۔ اس لیے تمام تعلیم یافتہ لوگوں کا قاعدہ تھا کہ اُردو میں روز بروز فارسی اور عربی کے الفاظ زیادہ شامل کرتے جاتے تھے۔ اگرچہ اب فارسی کی تعلیم موقوف ہو جانے سے اُردو میں نئے فارسی الفاظ کے آنے کا سدباب ہو گیا ہے مگر اُردو کے دشمنوں کو اس پر اطمینان نہیں ہوا۔ اور بلا لحاظ اسکے کہ زبانوں پر کون لفظ چڑھے ہوئے ہیں اور بے پڑھے بچوں اور عورتوں تک کی زبان پر جاری ہیں۔ یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ اُردو میں سے فارسی و عربی کے مانوس الفاظ سب نکال ڈالے جائیں اور ان کی جگہ بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ عام اس سے کہ وہ بولے جاتے ہوں یا نہ بولے جاتے ہوں داخل کر دیے جائیں۔ اس طریقہ سے ایک نئی زبان تصنیف کی گئی اور اُس کا نام "ہندی" قرار دیا گیا۔ جو دراصل نہ کسی ملک کی زبان ہے نہ کسی مذہب کی۔ نہ کسی قوم کی اور نہ کسی گروہ کی۔ مگر زور و شور سے دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ سارے ہندوستان کی زبان یہی ہے۔

دنیا کے تمام ممالک کی طرح ممالک متحدہ میں بھی یہ نظر آئے گا کہ شہر والوں کی زبان

پر جو عموماً فصیح و بلیغ اور لٹریری زبان ہوتی ہے اُن زبانوں کے الفاظ زیادہ ہیں جنکی تعلیم کے اثر سے زبان اُردو بنی تھی - کیونکہ چند روز پیشتر کیا معنی آج بھی اعلیٰ سوسائٹی کی زبان یہی ہے - اسکے مقابل دیہات میں ایک گنواری زبان مروج ہے جس میں الفاظ تو قریب قریب وہی ہیں مگر افعال کے اشتقاق کی صورت بدلی ہوئی ہے اور فارسی کے بعض حروف اپنے مخارج سے نہیں ادا ہوتے ہیں - مثلاً "آتے ہیں" "کھاتے ہیں" "جاتے ہیں" "سوتے ہیں" اور "آتے تھے" "جاتے تھے" "سوتے تھے" کے مقام پر وہ لوگ "آوت ہیں" "کھات ہیں" "جات ہیں" "سووت ہیں" اور "آوت ہتے" "جات ہتے" "سووت ہتے" بولتے ہیں - اور حرف ژ - ذ ز - ض - ظ کو "جیم" "شین" کو "سین" غ کو "گاف" "ف" کو "پھے" اور ق کو "کاف" کی آوازوں سے ادا کرتے ہیں - بس اُردو اور اُس گنواری زبان میں یہی فرق ہے -

نئی ہندی کی مصنفوں نے اُس گنواری زبان کو بالکل نہیں اختیار کیا ہے - کیونکہ ناگری خط کے اخبارات اور اُن کی تمام کتابوں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے اُس میں نہ یہ دیہاتی افعال کے اوزان اختیار کیے گئے ہیں اور نہ مذکورہ بالا حروف کے مخارج کا اتنیاز دُور کیا گیا ہے - کیونکہ ناگری کا حرف "جا" نیچے ایک نقطہ دے کے ز - اور "پھا" نقطہ دے کے ف بنا دیے گئے ہیں - لہذا اس میں ذرا بھی شک و شبہہ نہیں کہ جس زبان کو فی الحال ہندی کہا جاتا ہے وہ یہاں کی دیہاتی زبان نہیں ہے - بلکہ ایک تو تصنیف زبان ہے جو صرف لڑنے اور دعویٰ کرنے کے لیے ہے - کوئی ایسی زبان نہیں جو کہیں بولی بھی جاتی ہو -

مگر فی الحال مردم شماری کے موقع پر ایک بڑی بھاری غلط فہمی یہ پیدا کرائی جاتی ہے کہ دیہات کی گنواری زبان کو ہندی بتایا جاتا ہے - اور شہر کی فصیح زبان کو اردو - اور سکے ذریعہ سے اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ملک میں زیادہ تعداد ہندی بولنے والوں کی ہے - کیا دنیا میں کوئی اور زبان بھی ہے جس میں گنواروں اور دیہات کی خراب زبان بولنے والوں سے فصیح زبان بولنے والے پڑھے لکھوں کی تعداد زیادہ ہو ؟ اگر یہی اصول ہے تو انگریزی، فارسی، عربی اور میں کہتا ہوں کہ دنیا کی ساری زبانوں کا لٹریچر دریا بُرد کر دینے کے قابل ہے - کیونکہ وہ چند فاضل پڑھے لکھے منشی

شہر کی زبان ہے جن کی تعداد غلط اور گنواری زبان والون کے مقابل مین بہت ہی کم ہے۔ دیہات کی زبان اُردو کے سوا ہرگز کوئی اور زبان نہین ہے - مگر ہان ہر ملک اور ہر قوم کے دیہاتیون کی طرح وہ ایک خراب اور غیر فصیح زبان یا یون کہیے کہ بگڑی ہوئی اُردو ہے - چونکہ آج کل باہمی اختلافات اور تعصب نے لوگون کو سچائی اور حقیقت سے ہٹادیا ہے لہذا یورپین حکام سے جو زبان کے مسئلے کو بخوبی نہین سمجھ سکتے "سمجھا بجھا کے ایسے احکام بھی جاری کرادیے گئے ہین کہ دیہاتی زبان کو ہندی لکھا جائے - اور اُنھون نے بغیر اسکا اندازہ کیے کہ جس زبان کو ہندی کہا جاتا ہے اور جو ناگری کے اخبارون اور رسالون اور تحریرون مین برتی جاتی ہے وہ بھی دیہاتی زبان ہے یا نہین ایسے احکام بھی جاری کردیے ہین لیکن ایسے غلط احکام کے جاری ہونے کے بعد مردم شماری کی رپورٹ کا ہرگز اعتبار باقی نہ رہیگا - اور ہرگز اس مردم شماری سے اس کا سچا اندازہ نہ ہوسکے گا کہ ملک مین کتنے اُردو اور کتنے ہندی بولنے والے ہین -

یہی مسئلہ آج کل سررشتۂ تعلیم مین بھی چھڑا ہوا ہے - اور چونکہ اُسکے ارکان مین زیادہ تر تعداد اُن ہندوؤن کی ہے جو ہندی زبان کے حامی ہین - لہذا مشکل سے امید کی جاسکتی ہے کہ کوئی صحیح فیصلہ ہوسکے - ضرورت ہے کہ مسلمان اِس جانب فوراً توجہ کرین - ورنہ اگر اُردو زبان کے خلاف کوئی فیصلہ ہوگیا تو اُردو کی ترقی کے لیے گورنمنٹ اور اہل علم گذشتہ دو تین سو سال مین جو کچھ کوششین کی ہین سب بیکار ہوجائین گی - مسلم لیگ کو اس موقع پر اُٹھ کے یورپین حکام کی غلط فہمیون کو دُور کرنا چاہیے - اور چونکہ مسلم لیگ زبان اُردو کی ترقی کو منجملہ اپنے فرائض کے تسلیم کرچکی ہے لہذا اُسے اس موقع پر غفلت نہ کرنی چاہیے - اور اگر اُس نے کچھ نہ کیا تو پھر مسلمانون کو آیندہ مسلم لیگ سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا -

خوشی کی بات ہے کہ "مسلم کانفرنس بدایون" نے اس جانب بڑی مستعدی سے توجہ شروع کی ہے - مسلمانون اور عموماً تمام اُردو کے حامیون کو کانفرنس مذکور کا پورا ساتھ دینا چاہیے - خاصتہً اُسے روپے سے فوری مدد دینے کی ضرورت ہے - تاکہ وہ اس کام مین ویسی ہی کوشش کرسکے جیسی کہ ایک ایسے اہم کام کے لیے ضروری ہے - مین ایک بار پھر یاد دلاتا ہون کہ یہ موقع مسلمانون کے غافل بیٹھنے کا نہین ہے - بہتر ہو کہ حامی قوم مسلمان

آنریری سکرٹری صاحب اُردو کانفرنس سے مراسلت کرکے "رسالۂ اُردو ہندی نمبر ا" منگوا کے دیکھیں اور امکانی اعانت و کوشش میں دریغ نہ فرمائیں۔

مصحف عثمانی

قرآن مجید کی نسبت لوگوں میں عموماً مشہور ہے کہ اسے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمع فرمایا ہے۔ اس معاملہ کے متعلق علما اور مورخین میں بہت کچھ اختلافات پڑے ہوئے ہیں۔ خصوصاً شیعہ و سُنّی کے شرمناک جھگڑوں نے اسے اور زیادہ اُبھارا اور یہاں تک نوبت پہونچی کہ دشمنان اسلام علی الخصوص عیسائیوں کو قرآن پاک کی تحریف کے متعلق کچھ کہنے اور جھگڑنے کا موقع مل گیا۔

اس واقعہ کی اصلیت اسی قدر ہے کہ عرب کے مختلف حصوں اور صوبوں میں مختلف لغات بولے جاتے تھے۔ یعنی زبان ایک ہی تھی مگر لہجے میں اور بعض حرفوں کے مخارج اور تلفظ میں فرق تھا۔ جس سے یہ خطرناک نتیجہ ظاہر ہوا کہ اُن صوبجات عرب میں لوگوں نے اپنے تلفظ ہی کے مطابق قرآن کو لکھنا بھی شروع کر دیا۔ اسکی مثال آج کل کے اعتبار سے یوں سمجھیے کہ اکثر مقامات کے عرب حرف "ق" کا تلفظ گاف اور حرف "ث" کا "ت" کرتے ہیں۔ اب یہی لوگ اپنے لہجے اور تلفظ کے مطابق "ق" کی جگہ گاف اور "ث" کی جگہ "ت" لکھنے بھی لگیں گے تو خواہ مخواہ زبان کے بگڑ جانے اور قرآن میں اختلاف پڑ جانے کا اندیشہ ہوگا۔ اسی اندیشے سے محفوظ رکھنے کے لیے حضرت عثمانؓ نے یہ کارروائی کی کہ صحابہ میں سے جو جو بزرگ قرأتِ قرآن میں کمال رکھتے تھے اور جن کی قرأت پر بھروسا تھا اُن کو جمع کرکے خاص قریش کے لہجے اور تلفظ کے مطابق املا کو مدون کر دیا۔ تاکہ پھر کوئی جھگڑا نہ باقی رہے۔ یا اس واقعہ کو آج کل کی زبان میں زیادہ صحیح طور پر یوں کہا جائے کہ حضرت ذی النورین نے "قرآن مجید کا ایک مستند ایڈیشن" دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور عربوں کے اختلافات لغت سے الفاظ کے بگڑنے یا بدل جانے کے جو اندیشے تھے مٹا دیے۔ اسی اعتبار سے حضرت عثمانؓ جامع قرآن کہے جاتے ہیں ورنہ قرآن کی ترتیب و تہذیب تکمیل دین ہی کے ساتھ ہو چکی تھی۔ سورتوں میں آیات کی ترتیب۔ اور سورتوں کی باہمی ترتیب سب حضرت رسالتؐ کے سامنے کی باتیں ہیں۔ ان کو ترتیب عثمانی سے کوئی علاقہ نہیں۔ اور

نہ کسی کو ایسی جرأت ہو سکتی تھی کہ آنحضرتؐ کی ترتیب میں کسی قسم کا دخل دے

تتبع روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اپنے اس مستند ایڈیشن کے پانچ نسخے تیار کرائے تھے جن میں سے ایک مکہ معظمہ میں بھیجدیا۔ ایک بصرہ میں بھیجا۔ ایک کوفے روانہ کیا ایک شام (دمشق) میں۔ اور ایک اپنے پاس مدینۂ طیبہ میں رکھا۔

علامہ ابو القاسم تجیبی سبطی (جو اسی شہر سبطہ کے رہنے والے تھے جسکا سین ہم اپنے ناول فتح اندلس میں دکھا چکے ہیں اور جہاں کے حاکم جولین سے مل کے مسلمانوں نے اسپین کے فتح کرنے کا ارادہ کیا تھا) بیان کرتے ہیں کہ "شام والا قرآن (مصحف عثمانی) دمشق کی جامع بنی اُمیہ میں اُس کی محراب کے اندر رکھا ہوا ہے۔ جس کی میں نے ۶۵۷ھ میں تو واپنی آنکھوں سے زیارت کی۔ اور مکہ معظمہ والے قرآن کو میں نے قبۂ یہودیہ (ہم نہیں بتا سکتے کہ یہ قبہ کون اور کہاں تھا) میں دیکھا تھا۔" اُن کے ایک صدیق عبدالملک اور مصنف جن کا نام عبدالملک ہے فرماتے ہیں کہ "میں نے اُن دونوں قرآنوں کی اور نیز مدینہ والے مصحف عثمانی کی ۶۳۵ھ میں زیارت کی تھی۔"

ان میں سے ایک مصحف خدا جانے کیونکر ارض اندلس میں پہونچ گیا جو وہاں قرطبہ کی جامع مسجد میں ایک مدت تک ادب و تعظیم سے رکھا رہا۔ لوگ ذوق و شوق سے اسکی زیارت کرتے اور اُس سے فیض و برکت حاصل کرتے رہے۔ علامہ عبدالملک جنھوں نے ۶۳۵ھ میں مکہ اور مدینہ والے قرآنوں کو دیکھا تھا، فرماتے ہیں کہ "اندلس والے اور مدینہ والے قرآن کا خط ایک ہی تھا۔" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک ہی شخص کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔

بعض عوام یہ تصور کرتے ہیں کہ اِن قرآنوں کو حضرت عثمانؓ نے خاص اپنے دست مبارک سے لکھا تھا۔ مگر اسکی کوئی اصلیت نہیں۔ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی قرآن نہ تھا۔ لیکن جس ہاتھ سے وہ لکھے گئے ہوں گے وہ یقیناً برکت کا ہاتھ تھا۔ کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ معزز ین صحابہ میں سے کسی بزرگ کے ہاتھ سے لکھے گئے ہوں گے۔ جن علمانے ان مصاحف عثمانی کی زیارت کی تھی وہی اپنے معائنہ اور مشاہدہ سے بیان کرتے ہیں کہ مدینہ والے قرآن کی پشت پر یہ عبارت لکھی تھی "یہ وہ (قرآن) ہے جس پر اصحاب رسول اللہ صلعم کی ایک جماعت نے اتفاق کیا۔ منجملہ اُنکے زید بن ثابت۔ عبداللہ بن زبیر اور سعید بن عاص

ہین - اور اسی سلسلے مین اُن تمام صحابہ کے اسمائے گرامی لکھے ہوئے ہین جنھین حضرت عثمان رضؓ نے اس اہم کام کے لیے جمع فرمایا تھا -

اہل اندلس کا اپنے قرآن کی نسبت یہ خیال بھی تھا کہ یہی وہ قرآن ہے جس پر شہید ہوتے وقت حضرت عثمانؓ کا خون گرا تھا - مگر اسکو علامہ مقری اپنی کتاب "نفح الطیب" مین (جس سے اخذ کر کے ہم یہ واقعات ناظرین ولگداز کے سامنے پیش کر رہے ہین) بعید از قیاس بتاتے ہیں اور فرماتے ہین کہ وہ ہوگا بھی تو شام والا قرآن ہوگا -

لیکن ہمارے نزدیک اگر اُس قرآن مین خون کے دھبے موجود ہون تو اندلس والون ہی کا خیال ٹھیک ہے - کیونکہ شام کا قرآن جس کی ۵۷۸ھ مین ابوالقاسم تجیبی نے زیارت کی تھی وہ ہوگا جسے حضرت عثمانؓ نے اپنی زندگی ہی مین ارسال فرمایا تھا اور جس پر آپ کا خون گرا وہ آپ کے کُرتے اور آپ کی بی بی نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیون کے ساتھ دمشق مین آپ کے بعد بھیجا گیا ہوگا - اور غالباً وہ آپ کا خاص قرآن ہوگا جس مین آپ خود تلاوت فرمایا کرتے تھے - اور اہل مدینہ کی عام نفع رسانی کے لیے ایک دوسرا نسخہ ہوگا جو آپ کے بعد صدیون تک وہان موجود رہا - تاہم ہمین ابھی تک اسکا پتہ نہین چلا کہ اندلس مین وہ قرآن کس زمانے مین اور کیونکر ہونچا -

لیکن اس مین شک نہین کہ اہل اندلس اُسکی نہایت ہی قدر و منزلت اور تعظیم و تکریم کرتے تھے - یہان تک کہ اندلس کی سلطنت مین کمزوری پیدا ہوئی اور مراکش مین سلاطین موحّدین کا دَور شروع ہوا جنھون نے سارے اسپین کو مغلوب و مقہور کر دیا تھا -

اس خاندان کے بانی اور پہلے تاجدار ابو محمد عبد المومن بن علی کو اس مستند اور متبرک نسخۂ قرآن کے اپنے دار السلطنت مراکش مین لے جانے کا بیحد شوق تھا - اُسی کے وزیر عبد المومن ابو بکر محمد بن عبد الملک بن طفیل کا بیان ہے کہ "اس قرآن کے اصلی صحیفۂ عثمانی ہونے مین کسی کو شک نہ تھا" - چنانچہ خلفائے اندلس اور سلاطین اسپین نسلاً بعد نسل اُسکی حفاظت کرتے آئے تھے - بادشاہ عبد المومن کو بڑی آرزو تھی کہ اُسے قرطبہ سے منتقل کر کے مراکش مین لے آئے - مگر محض اس خیال سے اس کی جرأت نہ کرتا تھا کہ مسلمانان قرطبہ کو اس کا بڑا ملال ہوگا - اور اُن کی دلشکنی کرنا اچھا نہین - مگر خدا نے خود ہی یہ بات قرطبہ والون کے دل مین ڈال دی اور وہ آپ ہی آمادہ ہوگئے کہ اس دولت گران بہا کو عبد المومن

کے حوالے کرکے حق کو حقدار کے پاس پہونچا دیں۔ چنانچہ قرطبہ کے دو رئیس زادے ابو سعید اور ابو سعید ۵۵۲ھ میں اُس قرآن مجید کو لے کے مراکش میں آئے جس کا استقبال وہاں بڑی دھوم دھام اور بڑے تزک و احتشام سے کیا گیا۔ بادشاہ عبدالمومن کو اس نعمت عظمیٰ کے ملنے کی بڑی خوشی ہوئی اور اُس نے اس مصحف کی حفاظت اور اسکی زیارت کے لیے جو اہتمام کیا حیرت انگیز ہے۔ چنانچہ اس کا مفصل حال ہم اسی مضمون میں آگے چل کے بیان کریں گے۔

عبدالمومن کے عہد سے اس ودیعت ربانی کے حامل سلاطین موحدین ہوئے جو علی العموم اُس کی بے انتہا قدر کرتے تھے۔ اور حصول برکت کے لیے سفروں اور لڑائیوں میں اُسے اپنے ساتھ لیجایا کرتے تھے۔ انھیں میں سے بادشاہ منصور نے اس قرآن مجید کی جلد پر سونے کے حرفوں میں چار شعر لکھوا دیے تھے جن میں سے آخری شعر یہ تھا۔

والبسہٗ الیاقوت والدر حلیۃ و غیرک قد روّاہ من دم صاحبہ

(تو نے تو اُسے یاقوت اور موتیوں کا زیور پہنایا۔ اور دوسروں نے اسے خود اُن بزرگ (حضرت عثمانؓ) کے خون سے سیراب کیا جن کا یہ تھا)

انھیں موحدین میں سے معتضد یعنی سعید علی بن مامون ۶۴۵ھ میں جب تلمسان کے سفر پر روانہ ہوا تو عادت کے موافق اس قرآن مجید کو اپنے ہمراہ لیتا گیا تھا۔ تلمسان کے قریب وہ اور اُس کا بیٹا ابراہیم دونوں لڑائی میں مارے گئے اور بدوی عربوں اور دیگر افریقی قبائل نے جہاں شاہی لشکرگاہ کی اور سب چیزیں لوٹیں اس مصحف عثمانی کو بھی لے گئے۔

اب چند روز تک یہ قرآن مجید گمنامی میں رہا۔ مگر بعض کہتے ہیں کہ "نہیں۔ شاہان تلمسان کے خزانہ میں تھا"۔ یہاں تک کہ آخر ماہ رمضان ۷۳۷ھ میں بادشاہ ابوالحسن نے جو بنی مرین میں سے تھا تلمسان کو فتح کرکے یہ مصحف عثمانی اپنے قبضے میں کیا۔

اب بادشاہ ابوالحسن نے اسے ذریعۂ برکت قرار دیا۔ اور یہود کے تابوت سکینہ کی طرح لڑائیوں اور جہاد کے سفروں میں اُسے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ اُس نے اتفاقاً افریقہ کے شہروں پر یورش کی جس میں وہ دشمنوں کے نرغہ میں پڑکے مارا گیا۔ اور یہ قرآن اُسکے دشمنوں کے ہاتھ لگا۔ ایک تاجر نے حسن تدبیر سے اُسکو اُن لوگوں سے حاصل کیا۔ اور ۷۴۵ھ میں پھر مراکش میں لاکے شہر فاس کے خزانے میں رکھ دیا۔

بس اس کے بعد ہم نہیں جانتے کہ وہ قرآن کہاں ہے۔ آیا وہ محترم نسخہ آج بھی

شہر فاس مین ہے یا نہین - فی الحال ایک قرآن مجید اور وہی خاص جس پر حضرت عثمان کا خون گرا تھا قسطنطنیہ مین دولت عثمانیہ کے قبضے مین بتایا جاتا ہے، ممکن ہے کہ یہ وہی قرآن ہو اور کسی ذریعہ سے سلاطین آل عثمان کے قبضے مین آ گیا ہو۔

لیکن ہمین ابھی اتنا بتانا باقی ہے کہ پہلے فرمانروائے موحدین عبدالمومن بن علی نے اس کی قدردانی و حفاظت کے لیے کیا انتظامات کیے تھے۔ اُسے اس قرآن کے ملتے ہی اِس بات کی فکر ہوئی کہ جیسا یہ معجز نما کلام ہے ویسی ہی اسکی رحل اور اسکے رکھنے کا تابوت (صندوق) بھی ہو۔ جن سے ایک طلسم اور معجز نمائی کی شان نمایان ہوتی ہو۔

چنانچہ اِس غرض کے لیے اُس نے اپنے دارالسلطنت مراکش (جو اُن دنون ایک بڑا ترقی یافتہ اور متمدن شہر تھا) کے اور نیز اپنی قلمرو کے بلاد دور و دراز کے بڑے بڑے مہندسون۔ نقاشون۔ معمارون۔ نجارون۔ سادہ کارون نگینہ جڑنے والون اور صحافون غرض ہر قسم کے کاریگرون کو بلا کے شہر مراکش مین جمع کیا۔ اور اُن کو حکم دیا کہ تم سب مل کے باہمی مشورے سے اس قرآن کی جلد بناؤ۔ اُس مین جواہرات جڑو۔ اور اُسکے لیے اعلیٰ درجے کا ایک جزدان بناؤ۔ اور یہ سب چیزین ایسی ہون جو اعجوبۂ روزگار ہون۔ پھر اُس کے لیے ایک کرسی اور ایک رحل اور ایک ایسا تابوت تیار کرو جس مین اپنی ساری صناعی صَرف کر دو۔ اور ایسا کمال دکھاؤ کہ یہ سب چیزین ایک طلسم معلوم ہون اور اُن سے ایسے عجائبات ظاہر ہون جن کے اسباب نظر سے پوشیدہ رہین۔

یہ ایک دینی کام تھا جس مین اجر و ثواب آخرت کے علاوہ بادشاہ کی خوشنودی بھی متصور تھی۔ کاریگرون نے جانین لڑا دین۔ پہلے تو اُس کلام اللہ کے لیے سونے چاندی کی ایک مرصع کار جلد اس وضع کی بنائی گئی کہ اس مین زیادہ ترکیبن کی شان تھی۔ اندر باہر عجیب و غریب صنعتین رکھی گئی تھین۔ اور ہر جگہ ایسے نقش و نگار تھے جن مین ہر مقام پر ایک نئی صنعت نظر آتی تھی۔ اُس پر رومی شیشے کی ایسی میناکاری کی گئی تھی کہ اُس سے پہلے کبھی لوگون

نظر سے نہین گزری تھی اس جلد مین حیرت انگیز طریقے سے ہر مقام پر جوڑ تھے جو بند ہوتے وقت خوب بھڑ کے بیٹھ جاتے اور کھُلتے وقت جدا ہو جاتے۔ اور ایسی خوش اسلوبی اور عمدہ ترتیب سے اُس جلد پر ہیرے۔ یاقوت۔ زمرد اور موتی جڑے گئے تھے کہ اُسکی آب و تاب پر نظر نہ جم سکتی۔ پھر اُسکے لیے سُندس و حریر کا ایک نہایت ہی پُر تکلف جزدان تیار کیا گیا۔ اور اس مین بھی بہت ہی بیش بہا جواہرات کثرت سے ٹانکے گئے۔

اسکے بعد اُس قرآن مجید کے واسطے ایک آبنوس کی مرصع کار رحل بنائی گئی۔ اور اُس مین بھی اعلیٰ درجے کے نقش و نگار بنا کے جابجا جواہرات جڑے گئے۔ اس رحل کی وضع بھی نہایت خوشنما اور عجیب تھی۔ پھر ایک نہایت نازک، خوبصورت اور پُرتکلف کرسی بنائی گئی تاکہ اُس کرسی پر رحل اور قرآن پاک رکھا جائے۔ پھر ایک بڑا سا تابوت (صندوق) بنایا گیا تاکہ اُسکے اندر وہ کرسی اور رحل اور قرآن حفاظت کے ساتھ رکھے رہین۔ اور جب کہین لیجانا ہو تو اُس پورے تابوت کو اُٹھا کے لیجایا کرین۔ یہ تابوت شش پہل تھا۔ بہت بلند تھا اور نہایت خوشنما۔ اور اُسپر چارون طرف ایسے نقش و نگار بنائے گئے تھے کہ جو دیکھتا عش عش کر جاتا۔

مگر سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اس خیال سے کہ بغیر ہاتھ لگائے قرآن کی زیارت ہو جایا کرے اور حضرت جل وعلا کے اس ارشاد کی کہ "لا یمسّہٗ الا المطہرون" کی پوری تصدیق ہوتی رہے۔ اس تابوت۔ کرسی۔ اور رحل مین کچھ ایسی کلین لگائی گئی تھین اور اُنکی تکمیل مین ایسا کمال انجنیری صرف کیا گیا تھا کہ اُنھین دیکھ کے عقل دنگ رہ جاتی۔ اور قرآن مجید کی زیارت مین ایک معجز نمائی کا حیرت انگیز کرشمہ لوگون کو نظر آجاتا۔ جب کسی کو اُسکی زیارت کا شوق ہوتا تو اُس شش پہل تابوت کے ایک پہلو پر جو دو پٹ لگے ہوے تھے اُنکے نیچے ایک سوراخ مین ایک نازک سی خوبصورت کنجی ڈال کے پھرائی جاتی۔ کنجی کے پھرتے ہی آپ سے آپ دونون پٹ یکایک کھُل کے اندر کی طرف مُڑ جاتے۔ وہ کرسی جس پر رحل تھی خود بخود تابوت سے باہر دوڑ آتی۔ اور

رحل مع قرآن بھی خود بخود حرکت کرکے اور اُس کرسی پر کھسک کے انتہائی سرے پر آجاتی۔ اور یہ سب حرکتین ایک ہی ساتھ صرف کُنجی کے پھرانے سے بغیر اسکے کہ کوئی ہاتھ لگائے ہوتین۔ اور قرآن مجید زیارت کرنے والون کے قریب آجاتا۔ پھر بعد زیارت جب اُسے احتیاط سے رکھ دینا منظور ہوتا تو کنجی اُسی سوراخ مین ڈال کے دوسری طرف پھرائی جاتی اور ساتھ ہی کرسی و رحل مع قرآن کے آپ سے آپ اندر ہوکے اپنی اپنی جگہ پر قائم ہو جاتے اور خود ہی تابوت کے پٹ بھی بند ہوکے مقفل ہو جاتے۔

مسلمانون اور خصوصاً آج کل کے تعلیم یافتہ لوگون کو اُس زمانہ مین اور وہ بھی مراکو مین ایک ایسی صنعت کے پائے جانے کا مشکل سے یقین آئے گا۔ مگر یہ کُل باتین کتاب نفح الطیب کی جلد اول مین بوضاحت درج ہین جو کہ آج کل کی تصنیف نہین۔ اور کوئی وجہ نہین کہ اُسکے بیان کو جو مستند مورخین کے حوالہ سے ہے بے اصل تصور کیا جائے۔

مگر ہان خود ہماری حالت ایسی ہو رہی ہے کہ ایسے کمالات کا اب ہمارے اگلے باکمال بزرگون کی جانب منسوب کیا جانا بھی اورون کو نہین خود ہمارے ہم قومون کو قابل حیرت نظر آتا ہے مگر سچ یہ ہے کہ ہمارے بزرگ ایسے نہ تھے جیسے کہ ہم ہین۔

اردو لٹریچر اور محکمۂ قوانین

اُردو زبان خوش اقبالی مین بھی بدنصیب ہے۔ اُس کی تاریخ بتا رہی ہے کہ اُسکو جب کبھی ضرر پہونچا ہے خود اپنون اور اپنے مربیون سے پہونچا ہے۔

ہر کس از دست غیر نالہ کند سعدی از دست خویشتن فریاد

جن ہندو اور مسلمانون کے امتزاج و اتحاد۔ میل جول اور باہمی ربط و ضبط سے وہ پیدا ہوئی اُنھین نے ابتدا ئی سوا ایک گھر لو زبان سمجھنے کے اُسے ہمیشہ علمی دربار سے محروم رکھا۔ اور اب بھی دیکھ لیجیے کہ وہی لوگ جو اسکو بولتے، اسے برتتے، اس مین مراسلت، نامہ و پیام اور تصنیف و تالیف کرتے

اور اس مین اخبار نکالتے ہین وہی اسکے دشمن ہین۔ اور جب پوچھو تو یہی کہتے ہین کہ ہمین اُردو سے کوئی تعلق نہین اور نہ یہ ہماری زبان ہے۔ سرکار برطانیہ جس نے اُسے علمی دربار مین پہونچایا سرکاری زبان بنایا۔ سلطنت کے قوانین اُس مین مدون کرائے۔ شہرون اور گانوٴن گانوٴن مین اسکی تعلیم کے مدرسے جاری کیے۔ اُسی کے بعض افسر اُردو کے خلاف ہین اور اُس کی ترقیون کو اچھی نگاہ سے نہین دیکھتے۔ اور اگر اس پر عنایت بھی کرتے ہین تو بدنصیبی سے وہی عنایت جو موجب مضرت بنجاتی ہے۔

سررشتۂ تعلیم مین چونکہ ہندو عنصر غالب ہے اس لیے اگر اور کچھ نہین بن پڑتا تو اسی بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ نصاب تعلیم کی کتابون کی زبان ہی بگاڑ کے غارت اور گنوارون کی زبان سے بھی بدتر کر دی جائے۔ مگر اسکے علاوہ ایک اور حیثیت سے بھی اُردو بگاڑی جا رہی ہے۔ جو اس سے بھی زیادہ قابل لحاظ ہے۔ اور وہ حیثیت سررشتۂ ترجمۂ قوانین کی ہے۔

اُردو زبان کو ہندوستان کی دوسری زبانون پر مختلف حیثیتون سے ترجیح حاصل ہے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ دیگر اقوام و السنہ سے جس قدر علم و فن ہندوستان کی لٹریری دنیا مین آتا ہے وہ زیادہ تر اُردو ہی مین ہوتا ہے۔ ہندوستان جیسے بجاے خود ایک براعظم کہنا چاہیے اُسکی تقریباً نصف آبادی اُردو بولتی اور سمجھتی ہے جس کی وجہ سے دوسری زبانون سے جتنی کتابین یا چیزین ترجمہ ہوتی ہین اکثر اُردو ہی مین ہوتی ہین۔ اِن ترجمون کا سلسلہ ایک مدتِ دراز سے اُردو مین جاری ہے جن کی بدولت اُردو مین اتنا وسیع اور غیر محدود لٹریچر پیدا ہو گیا ہے کہ اُسے تکمیل کے ساتھ جمع کر لینا کسی بڑی لائبریری کے بھی امکان مین نہین ہے۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ اور تلنگی زبانون مین بھی ترجمہ ہوے ہین۔ مگر اُردو کے مقابل بہت کم۔ اور اتنے ہین کہ اُنکی مجموعی تعداد اُردو ترجمون کے عُشر عشیر کو بھی نہین پہونچ سکتی۔ اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ جہان تک خاص اُردو کی قلمرو ہے اُس مین اُن زبانون کو کوئی جانتا بھی نہین اور اُنکے خاص رقبے مین اُردو پوری طرح حکومت کر رہی ہے۔ بنگالی۔ گجراتی۔

مرہٹی اور تلنگی زبانون کے لٹریچر کو عظیم آباد سے پشاور تک کوئی جانتا بھی نہین مگر اُردو لٹریچر کی اشاعت جیسی لکھنؤ اور دہلی مین ہے اُسکے قریب ہی قریب کلکتہ۔ بمبئی - پونا - اور مدراس مین بھی ہو رہی ہے - اور اسی وجہ سے اُن زبانون کا دائرہ بہت ہی محدود ہے اور اُن مین ویسی علمی وسعت ہرگز نہین جیسی کہ اُردو مین ہے -

دنیا کی تمام زبانون کو سب سے زیادہ علمی فائدہ ترجمون ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوا کیا ہے - کیونکہ ترجمہ کی معرفت جب نئے مضامین اور نئے خیالات کسی زبان مین آتے ہین تو اپنے لیے نئے الفاظ محاورات اور مصطلحات بھی پیدا کر لیا کرتے ہین جن سے زبان کو روز بروز وسعت حاصل ہوتی جاتی ہے - ہندوستان مین مختلف زبان بولنے والی قومین اور مختلف مذاق و اعتقادات و خیالات کے لوگ موجود ہین جن کی وجہ سے یہان کوئی ایک قومی اور ملکی اکاڈیمی نہین قائم ہو سکتی جیسی کہ فرانس مین نظر آتی ہے - جہان ایک ہی زبان بولنے والون اور ایک ہی مذاق رکھنے والون کی متحدہ کوششین فرنچ اکاڈیمی کے ذریعہ سے فرانسیسی لٹریچر کو یوماً فیوماً ترقی دلاتی رہتی ہین -

یہان سچ پوچھیے تو ایسی کسی اکاڈیمی کا قائم مقام صحیح معنون مین گورنمنٹ کا محکمہ ترجمۂ قوانین ہے - جس کے ذریعہ سے تمام قانون کے ترجمے برابر اُردو مین شایع ہوتے رہتے ہین - اور جو اپنی اشاعت کے ساتھ اُردو مین بہت سے نئے الفاظ نئے محاورے اور نئے مصطلحات پیدا کر دیتے ہیں اور وہ شایع ہوتے ہی ہر ادنی و اعلیٰ کی زبان پر جاری ہو جاتے ہین - جو کتابین گورنمنٹ کے ایما اور حکم سے اس محکمہ کے ذریعہ سے شایع ہوئی ہین - ان کو اشاعت کے ساتھ ہی جیسی مقبولیت اور تعمیم حاصل ہو جاتی ہے ویسی نہ کسی شاعر کے کلام کو نصیب ہو سکتی ہے اور نہ کسی ادیب کی عبارت کو - وہ ترجمے فوراً مستند تسلیم کر لیے جاتے ہین - عدالتون اور تمام حلقون مین برتنا شروع ہو جاتے ہین - فوراً اُن سے استناد کیا جانے لگتا ہے - اور اُن کا ہر لفظ چاہے بُرا ہو یا بھلا با محاورہ ہو یا بے محاورہ ایک ناخواندہ مہمان کی طرح زبان مین

زبردستی گھس پڑتا ہے۔

جہان تک مجھے تجربہ ہوا ہے ان قوانین کے ترجمون مین کثرت سے خلافِ محاورہ ترجمون کو مجبوراً قبول کر لیتے ہین۔ اور اُن پر حرف رکھنے کی جرأت نہین کرتے۔ جس کی وجہ سے ہمین یہ کہنے کا موقع حاصل ہے کہ خود گورنمنٹ کی مہربانی سے زبان بجائے سُدھرنے کے بگڑ رہی ہے۔ اور جس اکاڈیمی سے ہمین فائدہ پہونچنا چاہیے تھا اُس سے ہم ضرر اُٹھا رہے ہین

لوگ ان ترجمون کو عموماً قبول کر لیا کرتے ہین۔ اس سے یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ اُنھون نے ترجمون کو صحیح و با محاورہ سمجھ کے قبول کر لیا۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ ضرورت مجبور کر کے اُن سے تسلیم کراتی ہے۔ ورنہ اس کی کوئی وجہ نہین کہ ہم جن غلطیون کے ایک جاہل بچے کی زبان پر بھی متحمل نہین ہو سکتے اُنھین غلطیوں کو سرکاری قوانین میں دیکھ کے برداشت کرین اور اُنھین ٹھنڈے دل سے قبول کر لین۔ خلاف محاورہ الفاظ کے مقبول ہونے کا اِس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ نیل کوڈ (تعزیرات ہند) کے ترجمہ نے صدہا غیر مانوس اور زبان پر گران گذرنے والے لفظون اور لغتون کو چند ہی روز مین بالکل مانوس بنا دیا۔ حالانکہ اُن کی جگہ زیادہ سلیس۔ خوبصورت اور با محاورہ الفاظ استعمال کیے جا سکتے تھے۔

خیر وہ تو ایک گذری ہوئی بات تھی جس کا اب کوئی علاج نہیں۔ مگر غضب تو یہ ہے کہ آج بھی جبکہ اُردو لٹریچر بہت ترقی کر گیا ہے، سرکاری قوانین کے ترجمون مین بے احتیاطی برتی جا رہی ہے۔ اس مین شک نہین کہ اِن ترجمون کا غلط اور خلاف محاورہ ہونا سخت اعتراض کے قابل ہے۔ یہ غلطیان کسی اور مصنف یا رسالہ سے ہوتین تو چندان قابل لحاظ نہ تھین۔ مگر چونکہ ایسے سرکاری محکمہ سے ہوتی ہین جسکا ہر ہر لفظ پبلک کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑتا ہے اس لیے کسی طرح قابل درگذر نہین۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ اس محکمہ کی طرف خاص توجہ کرے۔ اور سوا لائق و مستند زبان دانون کے اور ایسے تعلیم یافتہ لوگون کی جن کی مادری زبان اُردو ہو اور کسی کے ہاتھ مین ایسی ذمہ داری کا کام

نہ دے - کیونکہ اگر یہی بے پروائی چند روز اور رہی تو یہ محکمہ بجائے نفع کے اُردو کو سخت ضرر پہونچا دے گا - اور اُس کی غفلت سے ہماری زبان بگڑ جائیگی -

فی الحال چونکہ صوبۂ بہار کے لائق و فائق بزرگ آنریبل مسٹر علی امام لا ممبر مقرر ہوے ہین جن مین نہایت اعلیٰ درجہ کا لٹریری ذوق بھی ہے لہذا اُنکی ذات سے ہمین کامل امید ہے کہ وہ اس جانب خاص توجہ فرمائین گے - اور سرکاری قوانین کے ترجمون کے متعلق ضروری اصلاح فرما کے وہ ہماری زبان اور ہمارے ملک پر خاص احسان فرمائین گے -

ہم مسلم لیگ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے صیغۂ ترقی اُردو کو بھی اس اہم ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہین - امید ہے کہ اس بارۂ خاص میں وہ سرکار مین ہمارا ریپریزنٹیشن کرین گے - اُردو کانفرنس جس نے بیدار مغزی سے کام لینا شروع کیا ہے اُس کے لیے اِس جانب توجہ کرنے کا پورا موقع ہے - اور اگر اُس نے اِس شکایت کو رفع کرا دیا تو وہ اپنی زبان پر بہت بڑا احسان کریگی اور اُردو کو ایک ایسی مضرت سے بچا دے گی جس سے بچانے کی سخت ضرورت ہے -

ہمارا جدید ناول

ناول یوسف و نجمہ جو ایک مدت سے ناتمام و ناقص پڑا ہوا تھا، پورا ہو گیا۔ اور اس کا فیصلہ پبلک کے ہاتھ ہے کہ انجام کیسا ہوا؟ اور اُسکی حالت کیا حالت رہی؟ جہان تک ہم سمجھتے ہین ناظرین نے اس انجام کو پسند کیا ہوگا - اور جو کچھ اس مین ہوا وہ اُنکے مذاق اور اُنکی خواہشون کے موافق ہو گا -

نئے ناول کے متعلق ہم کچھ زمانے تک متردد رہے کہ کس تاریخ اور کس عہد کو اختیار کریں - بعض حضرات کی خواہش تھی کہ غدر کا زمانہ اختیار کیا جائے - اور اُس وقت کی مصیبتوں کی تصویر دکھائی جائے - بعض احباب کی رائے ہوئی کہ ہندوستان ہی کی پرانی تاریخ مین سے کوئی زمانہ منتخب کر لیا جائے - دو ایک دوستون نے پھر یورپ کی سیر کرنی چاہی - اور فرمایا کہ دولت عثمانیہ کی تاریخ

مین سے ایک اچھا اور دلچسپ پلاٹ اخذ کر لیا جائے۔ لیکن ہم نے جہان تک غور کیا ان مین سے کسی مشورے پر عمل کرنے کے لیے ہم ابھی تیار نہ تھے۔

نئے تعلیم یافتہ گروہ کا خیال ہے کہ ہماری موجودہ زندگی اور ابنائے وطن کی مروجہ معاشرت پر ناول لکھے جانے چاہیین۔ جیسا انگریزی مین ہو رہا ہے۔ مگر ہمارے خیال مین یہ اُنکی ناتجربہ کاری ہے۔ بیشک انگلستان اور ممالک یورپ مین اکثر ناول ایسے ہی ہوتے ہین اور وہان وہی عنوان دلچسپ رہتا ہے۔ مگر ہندوستان کی پبلک مین جہان تک میرا تجربہ ہے یہ عنوان بالکل دلچسپ نہین ہو سکتا۔ افسانون مین انسان اپنی زندگی کے اعلیٰ اور کامیابی کے واقعات کو ڈھونڈھتا ہے۔ اور ناکامی وٹریجڈی بھی پسند آتی ہے تو اُسی عہد کی جبکہ اپنے حالات مین کامیابی ومقصدوری کی صورتین نظر آیا کرتی تھین۔ جس طرح ہر انسان اپنے جوانی کے واقعات کو زیادہ پسند کرتا اور مزے لے لے کے کہتا اور سنتا ہے اُسی طرح قومین بھی اپنے عروج وکمال اور اوج واقبال کے واقعات کو زیادہ پسندیدہ خیال کیا کرتی ہین۔

یورپ والون کو دنیا کی ساری عمر مین اپنا ہی موجودہ دَور کامیابی وکامرانی اور ترقی وعروج کا دَور نظر آتا ہے۔ اور اسی لیے وہ اپنی گذشتہ زندگی کے عوض موجودہ زندگی کو زیادہ پسند کرتے اور قومی عمر کے اسی حصہ پر فخر وناز رکھتے ہین۔ ایسی حالت مین اگر اُن کے ناول موجودہ سوسائٹی کے واقعات سے لبریز ہوتے ہین تو کوئی تعجب کی بات نہین۔ بلکہ بالکل بجا ہے۔ بخلاف اُنکے ہم اہل ہند ہندو ہون یا مسلمان بلکہ مین کہون گا کہ جاپان والون کے سوا سارے اہل ایشیا، اس مین عرب ہون یا تُرک، ایرانی ہون یا ہندی یقین کر رہے ہین کہ ہمارے اوج وعروج کا زمانہ گذر گیا۔ اور فی الحال ہم ایک نکبت وپستی کی زندگی مین مبتلا ہین۔ پھر ایسی حالت مین ہم پوچھتے ہین کہ اُنھین اپنی موجودہ زندگی مین لطف آئے گا یا اوج واقبال کی زندگی مین؟

اور ہماری اس ذلت وپستی کی زندگی مین رکھا ہی کیا ہے جس مین ہمین یا کسی کو مزہ آئے گا؟ اولوالعزمی وبلند حوصلگی ہم مین نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

بڑے اہم معاملات ملکی و قومی نہ ہم کر سکتے ہین اور نہ ہمارے ہاتھ مین ہین۔ تعلیم و قابلیت ہم مین نہایت کم درجے پر ہے۔ ہماری عورتین جاہل اور نادان ہین۔ اور سوا پستیِ خیال کے اُن سے نہ کوئی علمی کام ہو سکتا ہے اور نہ کوئی بڑا اہم ملکی کام۔ شریف گھرانون مین ہمارے یہان عشق ناجائز ہے۔ عقد سے پہلے مرد و عورت مین کوئی رابطہ نہین قائم ہو سکتا۔ اور ہو تو ناجائز ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہم مین سوسائٹی ہی نہین جس پر یورپ کے ناولون کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

رہیں چند معمولی باتین۔ پیدا ہونا۔ کھیل کود کے بڑا ہونا۔ کچھ دنوں اُستاد کے سامنے بیٹھ کے محض بے نتیجہ اپنا اور اُس کا بھیجا خالی کرنا۔ شادی کرنا نہین بلکہ دوسرون کے ہاتھون شادی کا ہو جانا۔ اور چند دنون تک روٹی کی فکر مین مبتلا رہ کے اور زمانہ کی سختی و سُستی برداشت کر کے مرجانا ہماری موجودہ زندگی کا خلاصہ ہے۔ اس مین اور ایک جانور کی زندگی مین بہت ہی تھوڑا فرق ہے اور ہم نہین سمجھ سکتے کہ ان واقعات مین کسی کو کیا لطف آئے گا؟

موجودہ سوسائٹی کے شوق کی برکت سے اُردو مین ایسے بھی ناول لکھے گئے ہین۔ جن مین کبھی کوئی شریف زادی کسی اور کے گھر مین ڈولی سے اُتروا دی گئی ہے۔ کبھی کسی نے کسی مہ جبین بہو بیٹی کو کھڑکی سے جھانکتے یا گاڑی کی جھلملیون سے آنکھیں ملاتے دیکھ لیا ہے اور عاشق ہو گیا ہے۔ پھر اُس کے گھر سے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اور آخر اُسے خراب کیا ہے۔

ایسے ناولون کی نسبت ہم نہین جانتے کہ وہ سوسائٹی کی تصویرین ہین یا اُن کے ذریعہ سے سوسائٹی اور زیادہ بدنام و رسوا کی گئی ہے۔ اُن مین اخلاق کا سبق دیا گیا ہے یا بد اخلاقی سکھائی گئی ہے۔

سچ یہ ہے کہ ہماری زندگی اس قابل ہی نہین کہ ناول کے صفحون پر لائی جائے اور جو کچھ اس سوسائٹی مین ہے اگر دکھایا جائے گا اُس سے سوا اسکے کہ ہم اپنی ذلت و تباہی کو عالم آشکارا کر دین اور کچھ نہ ہوگا۔ ان کو پڑھ کر غیر ہم پر ہنسین گے اور ہم اُن سے جو سبق حاصل کرین گے وہ بُہین اور ذلیل دیت کرے گا۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ موجودہ مذاق پبلک کو پسند بھی نہین آ سکتا

کیونکہ اُسی اصول کے مطابق جو ہم اوپر بیان کر آئے ہین ہمارے ہم وطنون اور ہم قومون کو اپنی قومی زندگی کے اُسی حصہ کے واقعات مین مزہ آسکتا ہے جو کامیابی و عروج کا زمانہ تھا۔ اور نصیحت و عبرت کے لیے بھی ہم اُنھین اُنکے اوج و عروج کے کارنامے دکھائین تو شاید وہ زیادہ متنبہ ہون گے۔

ہندوستان کے لیے اہل یورپ کے مذاق کے ناول نہیں چاہیے۔ بلکہ "رومانس" چاہیے جن مین اُنھین کے کسی اگلے ہموطن یا ہم مذہب کی اعلیٰ کارگزاریاں دکھائی گئی ہون اور جن کے ذریعہ سے اُنھین اپنا اگلا علم و فضل اور اوج و عروج یاد دلایا گیا ہو۔

ہم نے بھی دو ایک ناول موجودہ سوسائٹی دکھانے کی کوشش مین لکھکے شایع کیے تھے۔ مگر پبلک کو اُن مین ہرگز اتنا مزہ نہین آیا جتنا کہ ملک العزیز ورجنا۔ فتح اندلس۔ ایام عرب۔ اور فردوس برین وغیرہ وغیرہ مین آیا۔ اور اسی خیال سے ہم ہمیشہ ناول کے لیے اگلے عہد کا کوئی واقعہ ڈھونڈھ لیا کرتے ہین۔ اور اس مین موجودہ لٹریچر کے موافق کچھ مشرقیت ہوتی ہے اور کچھ مغربیت۔ حتی الامکان دلچسپی پیدا کر دیا کرتے ہین۔ اور ہمین اب یقین ہوگیا ہے کہ جس طرح ہمارا موجودہ لٹریچر مغربی و مشرقی انشاپردازی کا مجموعہ ہے اسی طرح ہمارے ناولون کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے کہ اُن مین کچھ ایشائیت ہو اور کچھ یوروپیت۔ نہ وہ بالکل ایسی بے سروپا کہانیان ہون اور نہ انگلش گھرون کی تصویر دکھانے والے ناول۔

فی الحال ہم نے کوئی خیالی پلاٹ نہین بنایا۔ بلکہ ایک ایسے عاشق عرب کا قصہ ناول کے پیرایہ مین لکھنا شروع کر دیا ہے جس کے نام سے ہندوستان کے لوگ تو بہت کم واقف ہین مگر عرب کے لٹریچر مین اُس کی حد سے زیادہ زیادہ شہرت ہے۔ عشاق عرب مین سے مجنون عامری اور اُس کی معشوقہ لیلیٰ کا نام فارسی اور اُردو نظم کا عنصر اعظم بن گیا۔ مگر قیس بن ذریح عذری اور اُسکی معشوقہ لُبنیٰ کے حالات سے لوگ بالکل ناواقف ہین۔ حالانکہ عرب مین ان دونون نامون کو لیلیٰ مجنون کے نامون سے کم شہرت نہین حاصل ہے۔

قیس بن ذریح کا کلام عربی لٹریچر میں کثرت سے موجود ہے۔ اس کے واقعات مورخین نے تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہین۔ اور شعرائے اُس کے سوز عشق سے اپنے عاشقانہ کلام مین گرمی پیدا کی ہے۔ اس کا زمانہ صحابۂ کرام کا درمیانی زمانہ ہے۔ حضرت عثمان ذی النورین اور حضرت علی مرتضیٰ کی شہادتون کو اُس نے دیکھا نہین تو سُنا تھا۔ اور اسلام کے اُس ابتدائی عہد پُر فتن مین تھا جبکہ حضرت رب العزت نے خیر القرون کے برگزیدہ لوگون کو آزمائش کی مصیبت مین مبتلا کر دیا تھا۔ لیکن اپنے عشق کے جوش سے اُس نے اُس عہد کے جھگڑون کی طرف توجہ نہین کی اور لبنیٰ کی یاد مین رویا کیا۔ اس کو سب سے بڑی فضیلت و شرافت یہ حاصل تھی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا رضاعی بھائی تھا۔

ممکن تھا کہ اس موقع پر ہم اُسکے مختصر حالات بھی بیان کر دیتے لیکن نہین۔ اس سے ہمارا ناول بے مزہ ہو جائے گا۔ اور واقعات کے معلوم کرنے کا جو شوق دلون مین پیدا ہوا کرتا ہے سرد پڑ جائے گا۔ لیکن اتنا اطمینان دلاتے ہین کہ اس ناول مین جو واقعات بیان کیے جائین گے مجموعی طور پر سچے اور مطابق واقعہ ہون گے۔ ہان ناول کی ضرورت سے تفصیلی صحبتون اور اور صحبت کی باتون مین تصرف اور اضافہ کرنے سے مجبوری ہے۔ کیونکہ بغیر اسکے نہ ناول ناول ہو سکتا ہے اور نہ قصے مین مزہ آ سکتا ہے۔

ہمارا لٹریچر

اُردو زبان کی تاریخ پر عمدہ طور پر غور ہو چکا۔ اور اُس کی اگرچہ اُسی زمانے مین بنا پڑ گئی جبکہ مسلمانون کا قدم پہلے پہل ہندوستان مین آیا۔ مگر اس بات کو اکثرون نے تسلیم کر لیا ہے کہ زبان اُردو کے ایک ممتاز صورت اختیار کرنے کی تاریخ نسل تیمور کے پانچوین تاجدار ہند شاہجہان کے عہد سے شروع ہوتی ہے حسب قاعدۂ فطرت اُردو چونکہ ابتدائً صرف اخلاقی صحبتون اور رنج کی

دلچسپیوں مین مزے دکھارہی تھی۔ لہذا عموماً ابتدائی شعرائے اُردو یا اُردو کے بچپن کے قدردانون نے علمی اہم ضرورتون مین اس گھریلو زبان سے کچھ کام نہین لیا۔

یہ ظاہر ہے کہ ادھر دو تین صدی پہلے تک کا زمانہ اسلام کا آخری دَور تھا۔ ایسے لوگ نہین رہے تھے جو کسی بچے کے تیور دیکھتے ہی اُسکے ہونہار ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ کرلیتے۔ اور اسی غلطی نے عرصے تک اُردو کو کسی قسم کی معتد بہ وقعت نہ حاصل کرنے دی۔ اور کیونکر ہوتا۔ تقدیر نے تو یہ نیکنامی نا تحان مغرب کی قسمت مین لکھ دی تھی۔ بس یہی ہوا۔ برٹش حکومت نے اُردو کو عدالت کی کرسی تک نہین پہونچایا۔ بلکہ یون کہنا چاہیے کہ خاک سے اُٹھایا اور آسمان پر پہونچا دیا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ قبل اسکے کہ انگریز اس زبان مین اپنا بابرکت ہاتھ لگائین اُردو کی کیا حالت تھی؟ کیونکہ انگریزون نے اُردو کی قدرومنزلت بڑھانے مین چاہے جس قدر مبالغہ کیا ہو۔ مگر اس مین شک نہین کہ مسلمان اپنی تنہا کوششون سے اس زبان کو بہت مضبوط اور شایستہ بنا چکے تھے۔ انگریزون کو مسلمانون کے ہاتھ سے یہ زبان نفس ایک زبان ہونے کی حیثیت سے پوری اور کمال کے درجے پر پہونچی ہوئی ملی۔ لہذا ظلم ہوگا اگر اُردو کی اصلیت اور ترقی پر بحث کرتے وقت مسلمانون کی کوششین قدردانی کی نظر سے نہ دیکھی جائین۔

ظاہر ہے کہ اُردو کا پہلا وطن دہلی ہے۔ اور ترقی کی دنیا مین دہلی کی جو رفتار رہی وہی رفتار زبان اُردو کی رہی۔ شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے البتہ ترقی کے زمانے تھے۔ مگر اُن دنون گویا اُردو کا عالم ہیولانیت تھا۔ شایستہ اور لائق صحبتون مین کوئی اُردو کی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔ ہان بعد کے دَور اپنی ہمت اور طاقت کے موافق اُردو کی قدر کرتے رہے۔ اگرچہ طوائف الملوکی اور بے انتظامیون نے دہلی کو اس قابل ہی نہین رکھا تھا کہ وہ اُردو کے ایسے ایک آزاد طبع اور فارغ البالی چاہنے والے بچے کی پرورش کرسکے۔ مگر باوجود اس ناقابل ہونے کے اہل دہلی سے اُردو کی ترقی مین جو جو کوششین ظاہر ہوئین

قابل تحسین ہین۔ مگر افسوس ان کوششون کی بھی دہلی کبھی قدر نہ کر سکی۔ دہلی مین جتنے نامور اور معجز بیان شعرا ہوے۔ زمانے نے اُن کا قدم بھی وہان نہ جمنے دیا۔ میر۔ سودا۔ انشا۔ یہ لوگ ایسے نہ تھے کہ اگر دہلی مین ذرا بھی صلاحیت ہوتی تو انھین اپنی شہر پناہ سے بھی نکلنے نہ دیتی۔ سودا جنھین وطن سے بڑی محبت تھی۔ اور اُن کے ابتدائی تیور کہ رہے تھے کہ دلی چھوڑ کر کہین نہ جائین گے۔ مگر وہان کی نا قدردانیون سے آخر اُنکے استقلال مین بھی فرق آگیا۔ ان تمام باتون سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کو صرف وطن ہونے کے سبب سے دلی کے ساتھ ایک قسم کا اُنس تھا۔ ورنہ دلی والون مین اسکی ترقی کے متعلق کوئی صلاحیت نہ تھی۔ اگر بعض پچھلے شاہان دہلی شعراے اُردو کی قدردانی کی طرف متوجہ بھی ہوے تو اُسوقت زمانہ اُنکے خلاف تھا۔ اپنی حیثیت سے اُنھون نے ہمت کیا۔ مگر اصل مین پوچھیے تو کچھ نہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ اُردو کو جہان تک تعلق دلی سے رہا وہ فلسفیانہ طور پر باعث تنزل ہو سکتا ہے۔ نہ باعثِ ترقی۔ کیونکہ خود دہلی کی حالت رو بہ تنزل تھی۔

یہی سرد مہری اور دلی کی یہ بے استطاعتی دیکھ کے اُردو کو بھی آخر دلی چھوڑنی ہی پڑی۔ لکھنؤ کا دربار اگلے شاہان دہلی کے مقابلے مین چاہے کتنا ہی چھوٹا ہو مگر اُس زمانے کے شاہان دہلی کے دربارون سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ زمانہ تصدیق کر رہا تھا کہ جو دلی سے جاتا ہے لکھنؤ مین ہاتھون ہاتھ لیا جاتا ہے۔ کمالون کی قدر ہوتی ہے اور طبع آزمائیون کی داد دی جاتی ہے۔ اُردو کے وہ تمام لائق اور سخن سنج شعرا جن کی گود مین اُردو پرورش پا رہی تھی اپنے ہونہار بچے کو بغل مین دبائے ہوے لکھنؤ آئے۔ جہان اُنکے استقبال کے شوق مین ہر امیر و غریب کی آنکھین بچھ گئین۔ لکھنؤ پہونچکے اس بچے نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو دلی کے خلاف جہان تجارت پیشہ لوگون کو اپنے لین دین سے اسکی طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہ تھی۔ یہان کی تمام صحبتین اطمینان اور فراغت سے طبع آزمائی مین مصروف ہین۔ فی الحقیقت ایک ایسی زبان کے لیے جو ترقی کرنا چاہتی ہو۔ یہ صحبتین نہایت عمدہ مربی ہو سکتی تھین۔ اُردو

کو سبھوں نے قدر و منزلت سے قبول کیا۔ اور اس بچے نے کچھ اس فصاحت و بلاغت سے اپنے ساتھ تمام شہر کی زبان کھول دی کہ گویا یہی بچہ لکھنؤ کے ہر ہر گھر میں بلبل ہزار داستان کی طرح چہک اٹھا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ لکھنؤ کی اُن دنوں کیا حالت تھی۔ اور باعتبار ترقی اسکی کیا رفتار تھی۔ لکھنؤ اگر ترقی نہ کرتا تھا تو تنزل بھی نہیں کر رہا تھا۔ اُسکا دربار ایک حالت پر ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں کے وزراء کے نائب بھی ایسے حوصلے اور ایسی مقدرت رکھتے تھے کہ خود پچھلے شاہان دہلی بھی اُن کی حوصلہ مندیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ جو ماہوار رقم بادشاہ دہلی کو ملتی تھی وہ یہاں کی بہت سی چھوٹی چھوٹی سرکاروں کا خرچ تھا۔ لکھنؤ کو جو یک بیک زوال ہو گیا اُسکی وجہ لکھنؤ کا تنزل نہ تھا۔ بلکہ یہاں کے بادشاہوں کی غفلتیں اور طفلانہ حرکتیں یا انگریزی قوت کا یک بیک بڑھ جانا تھا۔ الغرض صاف ظاہر ہے کہ شعر و سخن کی قدردانی اور اُردو کی تربیت میں دہلی لکھنؤ کا ہرگز مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ لہذا اُردو اگرچہ دلی میں پیدا ہوئی۔ مگر اس کی ترقی۔ اُسکا نشو و نما۔ جتنی باتیں ہیں سب لکھنؤ میں ہوئیں۔ اُردو پر دہلی کے جسقدر احسان ثابت کیے جائیں۔ مگر لکھنؤ کے احسانات اُن سے بڑھے ہی تسلیم کرنا پڑیں گے۔

یہ تو نفس زبان اُردو کی بحیثیت زبان تاریخ تھی۔ باقی رہے خیالات جو اس زبان کے ذریعہ سے ظاہر کیے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دہلی والے عموماً قدیم سے دلی جذبات کے اُبھارنے اور سحر کا سماں دکھانے کی طرف متوجہ رہے۔ اور تھوڑے بہت اب بھی ہیں۔ بخلاف لکھنؤ والوں کے جو ہمیشہ سے بلند پروازی اور مضمون آفرینی کی طرف جاتے ہیں۔ اس محل پر ہم دہلی کے رنگ کو لکھنؤ کے خیالی معرکہ آرائیوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور ہم پر کیا منحصر ہے انگریزی جو جو ترقی کرتی جائے گی دلی والوں کا رنگ ہر دلعزیز ہوتا جائے گا انگریزی تعلیم سے شکسپیر اور گولڈ اسمتھ کے پر درد رنگ سے دلوں کو ایک خاص قسم کا لگاؤ ہو جاتا ہے۔ اور انسان اُسی قسم کا رنگ ہر جگہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ اُردو کی دنیا میں ایسے شخص کو صرف دلی والوں کے شاعروں میں ایک

مذاق کی کچھ پھیکی پھیکی باتین بھی نظر آجاتی ہین - مگر لکھنؤ والون کی نازکخیالیون
مین اُسکو ایسی بات بھی نہین نظر آتی - اور اسی سبب سے دلی کی شاعری لکھنؤ
کی شاعری کو اب کسی قدر زک دینے لگی ہے - لیکن اول تو اس سے دلی والون
کی زبان کو ترجیح کا کوئی موقع نہین مل سکتا - دوسرے جو خیال اب مین ظاہر کرتا
ہون اُس سے ہر صاحب انصاف تسلیم کرلے گا کہ یہ امر بھی لکھنؤ والون کے
لیے ایک ایسی حجت ہے جس کی بنا پر وہ اپنی زبان کی خوبیون کا سب سے
اعتراف کرالین -

شاعری کا قاعدہ ہے کہ فطرتی طور پر ہر زبان مین خودبخود پیدا ہوجاتی
ہے - شاعری جس زبان مین پیدا ہوتی ہے اُس زبان کے علمی اور مضبوط زبان
ہونے کا انتظار نہین دیکھتی - مگر ہر زبان کی ابتدائی حالت مین اُس زبان کے بولنے
والون کا مذاق چونکہ سیدھا سادہ ہوتا ہے اس وجہ سے اسکے پہلے شعرا اُنھین
چیزون اور اُنھین خیالات سے کام لیتے ہین جو بالکل سامنے کے پیش پا
اُفتادہ ہین - اور قدرتی طور پر بلا ارادہ اُنکے کلام سے نیچر کی جھلکیان نظر آنے
لگتی ہین - مگر وہ زبان جو جو علوم و فنون اور قواعد و ضوابط کی دنیا مین قدم
رکھتی جاتی ہے شعرا اور زبان دانون کا مذاق بھی بدلتا جاتا ہے - جن لوگون
نے عربی کے پہلے اور پچھلے کارنامے دیکھے ہون گے اُنھین اس خیال کے
تسلیم کرلینے مین ذرا عذر نہ ہوگا - جاہلیت کے کلام مثلاً سبعہ معلقہ اور دیوان
حماسہ کے مرثیون کے سامنے دیوان متنبی یا دیگر مولدین کے کلام کو لاکے رکھیے تو
معلوم ہو کہ پچھلے شعرا صرف علوم کی چاشنی پاکے کہان سے کہان جا پڑے ہین -
یہ بات کچھ عربی ہی پر منحصر نہین - دنیا کی تمام زبانون کی ابتدائی اور انتہائی حالت
کا جب اندازہ کیجیے گا صاف معلوم ہوجائے گا کہ علوم نے بے تکلف نیچرل
مذاق کو تدریجاً کس قدر بدل دیا ہے - ہان انگریزی زبان کی شاعری اس سے
مستثنے ہے - کیونکہ انگریزی جو جو ترقی کرتی گئی وہ وہ اُس کا نیچرل مذاق اور
نکھرتا گیا - اور انگریزی شعرا روز بروز زیادہ جلا دیتے گئے - اس کی وجہ یہ تھی کہ
انگریزون نے شاعری کی ماہیت پر غور کرکے فیصلہ کرلیا تھا کہ شاعری صرف

انسان کے دل پر اثر ڈالنے اور واقعے کی تصویر دکھا دینے کا نام ہے۔ اسی خیال نے نہ انھیں علم کے عالیشان چو منزلوں پر چڑھنے دیا اور نہ فنون کی پیچیدہ بھول بھلیوں میں قدم رکھنے دیا۔ مگر اُردو شعرا نے شاعری کا کوئی مسلّم الثبوت اصول نہیں قرار دیا تھا۔ لہذا اُردو انگریزی کی طرح ترقی السنہ کے عام قاعدے سے نکل نہیں سکتی تھی۔

یہ قاعدہ کلیہ بیان کر کے ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ اُردو جب تک دہلی میں رہی۔ بچہ تھی۔ اُسکے شعرا اپنی ٹوٹی پھوٹی بچوں کی سی زبان میں بچوں ہی کے سیدھے سادے خیالات ظاہر کرتے تھے۔ مگر لکھنؤ میں آنے کے بعد اُردو نے ترقی کی علمی اور اخلاقی دنیا میں قدم رکھا۔ یہاں اُس کی تدریجی ترقی اور اصلاح کے ساتھ شعرا کے خیالات میں بھی حسب قاعدہ بلند پروازی اور نازک خیالی پیدا ہو گئی۔ قطع نظر اسکے جن لوگوں نے انگریزی علم عروض اور قواعد شعر و سخن کو غور سے دیکھا ہے وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اُردو نظم میں جس قدر سختی کی گئی ہے اُسی قدر انگریزی میں سہولت سے کام لیا گیا ہے۔ اُردو شاعری میں صدہا قیدیں اور ہزارہا قسم کی پابندیاں ہیں اور ترقی کرتی جاتی ہے۔ بخلاف اسکے انگریزی میں بہت کم قیدوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ باوجود اس ترقی کے اب تک انگریزی میں قافیہ کی ضرورت نہیں۔ اور اُردو میں جب تک قافیہ کی پابندی نہ ہو شعر ہی نہیں ہو سکتا۔ اُردو میں غزل اس قدر سخت چیز ہے جس کی نظیر انگریزی کیا معنی عربی میں بھی نہیں مل سکتی۔ اب غزل کی قیود کا لحاظ کر کے اُردو کے مقابل میں انگریزی نظم کو دیکھیے تو کس قدر آسانی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے مشہور نیچرل مذاق کے مجدّد جناب حالی انگریزی رنگ کی طرف جھکے تو مجبوراً اُنھوں نے اپنے آپ کو عموماً نظم اُردو کی قیود سے آزاد کر لیا۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ حالی اصول شعر سے واقف نہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ ان مجبوریوں نے اُنھیں قدیم شاعری کی تقلید سے الگ کر دیا۔

نفس زبان کے متعلق ہم نے جو لکھنؤ والوں کے حق میں فیصلہ کر دیا ہے اس دھوکے میں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ اُن کا کلام قابل نکتہ چینی ہی نہیں۔ اپنے خیالات

کی نسبت انکو دہلی کے شعرا سے سبق لینا چاہیے - لکھنؤ والے کچھ ایسے زلف و
کاکل اور بے مزہ ملبند پروازیون مین پڑ گئے ہین کہ انکی شاعری روز بروز بیکار
اور فضول ہوتی جاتی ہے - اگرچہ اس زمانے مین کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہین
جن کو میر اور مومن کے پُر درد مذاق کی طرف توجہ ہے - مگر عام شعرائے لکھنؤ ابھی
اپنے اُسی رنگ پر ہین - اگرچہ زبان کے اعتبار سے لکھنؤ کو بیشک اپنے حریف
دہلی والون پر ترجیح ہے مگر اُن کے پھیکے مذاق نے ایسی خرابیان پیدا کر دی ہین کہ
آج لکھنؤ والون کے دیوان عام نگاہون مین بے مزہ ہوتے جاتے ہیں اور دہلی
والون کا کلام ایک بنا بی کے اثر کے ساتھ ہر شخص کو مزا دے جاتا ہے - مگر
اس سے یہ نتیجہ نکالنا ظلم ہوگا کہ دہلی والون نے نفس زبان کے لحاظ
سے کچھ کیا ہی نہین - اگرچہ زبان اُردو کو آخر زمانے مین لکھنؤ سے خاص تعلق
ہو گیا تھا - لیکن دہلی مین ابھی اسکا چرچا باقی تھا - مومن - غالب - اور ذوق
ایسے شعرا ہین جنھون نے ترقی زبان اُردو مین بہت کوششین کین - اُن کا
کلام آج لکھنؤ اور دہلی دونون شہرون کے اُستادان زبان کے نزدیک قبولیت
کی سند پا چکا ہے - ان لوگون کا کلام دیکھنے سے لوگ بخوبی سمجھ سکتے ہین کہ مومن خا
تو دہلی کے قدیم رنگ پر جا رہے تھے - انکی طبع آزمائیون نے زبان کو اُسی حالت
پر رکھا - مگر درد اور سوز و گداز پیدا کرنے کی حیثیت سے سچ پوچھیے تو اپنے وقت
کے گولڈ سمتھ تھے - جو بتیابیان اور عشق کی پُر جوش اُمنگین اُنکے کلام مین
نظر آتی ہین - اور کسی کے کلام مین ممکن نہین - غالب کی طبیعت مین ایجاد اور
جدت پسندی کا مادہ بہت تھا - علاوہ برین فارسی کی قدیم مذاق کی طرف
وہ بڑے ذوق و شوق سے متوجہ تھے - وہی بلکہ ژند کی زبان کی طرف وہ
موجودہ فارسی کو کھینچے لیے جاتے تھے - اور چونکہ اُس زبان مین نیچر اور
قدرت کے محسوس منظرون کی طرف زیادہ توجہ کی گئی ہے - اس لیے اُن مین
دو باتین کمال کی پیدا ہو گئیں - طبیعت کی اصلی جدت پسندی نے مضمون
آفرینی پیدا کی اور قدیم زبان ژند کے ذوق نے نیچرل خیالات پیدا کر دیے -
اگرچہ فارسی کی طرف زیادہ متوجہ رہنے سے اُنکی اُردو شاعری مین تھوڑا سا

نقص پیدا ہوگیا یعنی فارسی بندشون مین اعتدال سے بڑھ گئے۔ لیکن جو مذاق
اور جو خیالات اُنھون نے اُردو مین پیدا کیے اُس مین اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ اور
لکھنو والون کے عام رنگ سے علیحدہ ہوکر جس خوبصورتی سے غالب نے مضمون
آفرینی کے ساتھ نیچرل مذاق کو نباہا ہے وہ اُنھین کا حصہ تھا۔ اور اُس پر
دہلی والے جس قدر ناز کرین زیبا ہے۔ باقی رہے ذوق۔ صرف ذوق ایک شخص
ہین جو لکھنؤ والون کی طرح ترقی کی عام رفتار مین پڑ کے دھوکا کھا گئے۔ جو رنگ
شعرائے لکھنؤ نے اختیار کیا تھا وہی رنگ ذوق نے دلی کے آخر عہد مین اختیار
کیا۔ ان مین اور شعرائے لکھنؤ مین کوئی فرق نہ تھا۔ اگر تھا تو اُسی قدر جسقدر
ہر شاعر مین اپنے خاص طبعی جذبات کے لحاظ سے اور دوسرے شاعر مین ہوتا
ہے۔ خود لکھنؤ کے شعرا مین باہم ایسا ہی فرق نکل آئے گا جیسا کہ ذوق مین اور
لکھنؤ کے کسی شاعر مین ہو۔ مگر زمانے کی رفتار ترقی کے ساتھ شاعری کے مذاق
کے بدلنے کا جو ہم نے دعوے کیا ہے اُس کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ ذوق
جو نیچر کے رنگ کو چھوڑ کے مضمون آفرینی اور بلند پروازی کی طرف جھکے تو دلی
والون نے بھی اُن کی قدر کل شعرائے دہلی سے زیادہ کی۔ آج دلی کی زیادہ
آبادی ذوق کو اُستاد مان رہی ہے اور بیچارے غالب و مومن کا نام لینے
والے کم ہین۔ بس یہی تین شعرا ہین جنھین دلی کا سرمایۂ ناز کہنا چاہیے۔ اور گذشتہ
شعرا اگرچہ اُردو پر اُن کا احسان سب سے زیادہ ہے۔ مگر اُن کو لکھنؤ اور دہلی
دونون مقامون سے برابر کا تعلق تھا۔ اور اگر وہ دہلی کے لیے ذریعہ فخر ہین تو ہون۔
لکھنؤ کو اُن دنون اہل زبان ہونے کا دعوے نہ تھا۔ دہلی کی طرح لکھنؤ بھی اُنکے
عہد مین انھین پر ناز کر رہا تھا۔

اُردو شاعری اور اُردو زبان کی یہ سچی تاریخ تھی۔ اور اس سے صاف ثابت
ہوگیا کہ دہلی کو اُردو سے وطن ہونے کا اور لکھنؤ کو مقام نشو و نما و تربیت اور
ذریعۂ ترقی ہونے کا تعلق ہے۔ دہلی والون کو لکھنؤ کا احسان ماننا چاہیے تھا کہ جو ہونہار
بچہ اُن کے شہر مین پیدا ہوا تھا اُس کی وہ ذرا تربیت نہ کر سکتے تھے۔ لکھنؤ کے
روسا اور بادشاہون نے اُسے اپنی گود مین اُٹھا لیا اور پوری ترقی دلا دی۔ مگر تا

اسکے اکثر دیکھا گیا کہ حضراتِ دہلی اپنی تحریروں اور تصنیفوں کے اندر... لکھنؤ پر حملے کر جایا کرتے ہین۔ اگرچہ لکھنؤ کے شعرا جو ہمارے سرمایۂ ناز ہین۔ انکو ان رکیک حملوں کی ذرا پروا نہین ہوتی۔ مگر کچھ نہ کچھ لکھنا ضرور چاہیے تاکہ پبلک کو اصلی حالات بخوبی معلوم ہو جائین۔

لکھنؤ پر سب سے زیادہ عنایت جناب مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے کی۔ اُنکی کتاب آبحیات بتا رہی ہے کہ اگر اُن کا بس چلتا تو وہ لکھنؤ کے مٹا دینے مین کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھتے۔ شعرا کی سوانحعمری لکھتے وقت اُنھین یہ کس نے صلاح دی تھی کہ ناسخ و آتش کے حالات بھی لکھین۔ شاید صرف یہ غرض ہو گی کہ ابتدا سے آخر تک جتنے شعرائے اُردو ہوے ہین سب دلی کے تھے۔ صرف یہ دو شخص البتہ لکھنؤ کے ہین۔ مگر اُس مجمع کے آگے ان دو کا کیا شمار۔ اس دھوکے مین شاید کوئی ناواقف آگیا ہو تو آگیا ہو۔ ورنہ جاننے والے جانتے ہین کہ لکھنؤ مین ناسخ و آتش کے علاوہ بہت سے شعرا ہین جن کی وقعت ناسخ و آتش سے کسی طرح کم نہ تھی۔ بلکہ وہ زیادہ وقعت رکھتے تھے۔ خواجہ وزیر وزیر۔ میر وزیر علی صبا۔ رند۔ رشک۔ اسیر یہ سب لوگ ایسے تھے جن پر لکھنؤ کی شاعری کا دارومدار ہے۔ اُن کے دیوانوں کو دیکھ کے انسان ناسخ و آتش کو بھی بھول جاتا ہے۔ ہم یہ کہنا تو گستاخی سمجھتے ہین کہ ہمارے حضرت آزاد نے ان لوگوں کا کلام نہین دیکھا۔ مگر اُنکے حسنِ نیت کے ہم البتہ بہت بڑے معتقد ہو گئے۔ مثنوی کے اعتبار سے جو ناموری اور قبولِ عام قلق اور حکیم نواب مرزا شوق اور مصنف گلزارِ نسیم کو نصیب ہوئی اُس پر بہتوں کو رشک ہے۔ جناب آزاد نے لکھنؤ والوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اُس کا نعم البدل اُنھین یہ ملا کہ دلی مین آج اُنکو کوئی نہین مانتا۔ چاہے اپنے گھر بیٹھے ادعائے اُستادی کیا کرین۔ مگر وہ دل شکستہ نہ ہون ہم اُنکے حسنِ عبارت کی داد دیتے ہین۔ اور لطف یہ کہ ہمارے جناب مولانا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی نے اُردو کی پوری تاریخ لکھی اور ہر عہد کے تغیرات پر غور فرمایا۔ مگر اس کا خیال نہ کیا کہ سودا اور میر جس وقت دلی چھوڑ کے لکھنؤ آئے ہین اُسکے بعد سے دلی کو ترقی کا کوئی موقع نہ ملا۔ حالانکہ لکھنؤ ترقی کر رہا تھا۔ جس سے

لکھنؤ کی خوبیِ زبان کا عقلی نتیجہ نکلتا ہے۔

میرے نزدیک اب یہ امر بوضاحت ثابت ہو گیا کہ باعتبار زبان لکھنؤ کو دلّی پر۔ اور باعتبار مذاق و خیال دلّی کو لکھنؤ پر ترجیح ہے۔ زمانہ اب دُور دور کے مقامات کو ملا رہا ہے۔ لکھنؤ والوں کی باتیں روز دلی والے اور دلّی والوں کی پُردرد غزل خوانیاں لکھنؤ والے سُن لیا کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں مناسب ہے کہ دلّی اور لکھنؤ والوں کی باہمی بحثیں اُٹھا رکھی جائیں اور دونوں مقاموں کے لوگ یوں اپنی مادری زبان کی اعانت پر کمر باندھیں کہ جس کو جس امر میں ترجیح ہو اُس سے دوسرا سبق لے۔ اگر لکھنؤ والوں کی زبان اچھی ہے تو دہلی والے اُن سے سیکھیں اور اگر دہلی والوں کا رنگ دلچسپ اور موثر ہے تو لکھنؤ والے اُنکی شاگردی اپنا فخر سمجھ کے اختیار کریں اور اپنے مذاق سخن کی اصلاح کریں۔

ہم نے یہ اپنی رائے ظاہر کر دی۔ ورنہ ہم کو نہ دہلی سے تعلق ہے اور نہ لکھنؤ سے۔ ہم سے جیسی عبارت بن پڑتی ہے لکھ لیتے ہیں۔ اس میں بھی کسی بات کا دعوے نہیں۔ ملک میں ایک سے ایک بڑھ کر لکھنے والا پڑا ہے۔ مگر پھر بھی اتنا کہتے ہیں کہ جو لوگ اُردو کے اہلِ کمال ہیں اُن کے نزدیک ہماری وقعت کچھ اُن لوگوں سے زیادہ ہی ہوگی جو خود بخود پکارتے پھرتے ہیں کہ ہم سے بڑھ کے لکھنے والا کوئی دنیا بھر میں نہیں۔

تمّت بالخیر

فہرست مطبوعات ایس عبد الرشید اینڈ برادرز

تاجران کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

تصنیفات خان احمد حسین خان

صاحب چیف ایڈیٹر شباب اردو لاہور

سیرۃ احمدی} حضور سرور عالم کے حالات میں یہ کتاب علامہ شبلی کی سیرت کے بعد لکھی گئی ہے۔ قیمت قسم اعلےٰ (۳ روپے) قیمت قسم دوم دو روپے ... (عـہ)

حسرت قیمت ...	عہ	گیتی آرا قیمت	۱۲ر
شمع سحر ...	۱۲ر	گلپھان ...	۱۲ر
سرخ حرت ...	۱۳ر	مکافات عمل ...	۱۲ر
ہمرا و امرت سر	۹ر	ابلیس و جمیلہ ...	۱۲ر
پری بالو ...	۱۲ر	دواہ قیمت ...	عـہ

وہ عورت جس نے کر کے دکھایا قیمت ۱۲ر

تقدیر بیگم قیمت ...	عہ	سوز قیمت ...	عہ
آپ بیتی ...	۱۲ر	آہ ...	عہ
نازنین مہ جبین ...	۹ر	آئینہ روزگار ...	عہ
پارۂ دل ...	۱۲ر	درد ...	عـہ
گوشہ ...	۸ر	سادھو کی کرتوت	۸ر

مولانا محمد عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی کے

وہ مضامین جو دلچسپ دلکش اور بے نظیر ہیں

مضامین شرر یعنی عاشقانہ و شاعرانہ حصہ اول (عـہ) حصہ دوم قیمت (عـہ) حصہ سوم قیمت ...... (عـہ)
تاریخی و جغرافی مضامین حصہ اول قیمت ... (عـہ) حصہ دوم قیمت (عـہ) حصہ سوم قیمت .. (عـہ)
سیر رجال مشہور اکابر کے حالات قیمت (۳ روپے)
نامور خاتونوں کے سوانح عمری قیمت حصہ اول ایک روپیہ دس آنے (عـہ) حصہ دوم قیمت (عـہ)
جلد دلگداز ۱۸۸۷ء قیمت صرف ...... (عـہ)
جلد دلگداز ۱۸۸۹ء قیمت صرف ... (عـہ)

تصنیفات شہ سدرشن صاحب

صبح وطن قیمت	عہ	نیچرال بتیسی حصہ اول	عـہ
بے گناہ مجرم ...	عہ	״ ״ حصہ دوم	۱۲ر
عورت کی محبت	عہ	من کی موج ...	۱۲ر
وجے سنگھ ...	عہ	سدا بہار کے پھول	۱۲ر

نہایت عجیب و غریب متفرق لاثانی قابل دید نادر کتابیں

مختصر تاریخ اسلامی} مسلمان لڑکوں خاصکر لڑکیوں کے لئے اپنے آباؤ اجداد کی اسلامی تاریخ کا بنیادی پتھر قیمت حصہ اول ۸ر حصہ دوم ۹ر حصہ سوم ۱۰ر حصہ چہارم (عـہ) +

سیرۃ النعمان} مصنفہ علامہ شبلی نعمانی رح مرحوم جیسی یہ کتاب علامہ مرحوم نے اعلےٰ درجہ کی تصنیف فرمائی ہے۔ اور کروڑوں حنفی مذہب مسلمانوں کو امام اعظم اور اُن کے نامور اور ممتاز شاگردوں کے حالات اور مسائل سے آگاہ کیا ہے۔ ویسی نہ رہی تھی کیونکہ مختلف مطابع نے چھاپ کر ایسی ردی کر دی تھی کہ دیکھ کر دماغ پریشان ہوتا تھا۔ ہم نے اس کی نہایت عرقریزی سے صحت کی اور اس پر حاشیہ بھی تحریر کئے۔ اور دو قسم کے کاغذ پر چھپوائی۔ قسم اول دو روپے (عـہ) قسم دوم ...... (عـہ)

بیاض آزاد} مشاہیر شعرائے ہند کے کلام کا انتخاب لاجواب (مسلم آزاد مرحوم کا کیا ہوا) نہایت خوشخط شعر ترچھے لکھے ہوئے جلی قلم معلوم ہوتا ہے کہ شنگرف سے لکھی ہوئی۔ کتاب سامنے رکھی ہے۔ مولانا کا فوٹو بھی شامل ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ ...... (عـہ)

مستقبل اسلام ..	۵ر	تصویر عبرت ...	۱۲ر
اسیفو یا مہدی ...	۶ر	ذکر فتح اندلس ...	۱۲ر
حسینہ	۶ر	یوسف پاشا ...	عـہ

سمرنا کا چاند} مصنفہ مصور غم مولانا راشد الخیری دہلوی۔ اس کتاب کی مقبولیت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ پہلی بار چھپتے ہی اتنی جلد ختم ہوئی۔ کہ چھ ماہ کے اندر اندر دوسری مرتبہ طبع کرانے کی دقت اٹھانی پڑی۔ اب پھر تھوڑی سی جلدیں ہیں جلد طلب فرمائیے قیمت ...... (عـہ)

ملنے کا پتہ:- ایس عبد الرشید اینڈ برادرز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

گیلانی پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپا